Scanned by CamScanner

معاصر ادب

ادبی تنقیدی و فکری مضامین کا مجموعہ

ڈاکٹر جمیل جالبی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

Moasir-e-Adab

By

Jameel Jalibi

1996

Price Rs. 250/=

I S B N : 81-86232-32-X

سنہ اشاعت ______________ ۱۹۹۶ء

قیمت ______________ ۲۵۰/- روپے

مطبع ______________ عفیف پرنٹرس لال کنواں، دہلی ۱۱۰۰۰۶

Educational Publishing House

3191 Gali Azizuddin Vakil, Kucha Pandit, Lal Kuan,

Delhi-110006. Tel. : 526162, 7774965,

محبّی حسن ظہیر صاحب کے نام

فہرست

ڈاکٹر قاضی عبدالقادر

پیش لفظ

لفظ آگاہ عصر آگاہ: ڈاکٹر جمیل جالبی

یہ جاننے کے لیے کہ آیا معاشرہ فرسودگی اور قدامت سے رشتہ توڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہے اور معاشرہ میں ذہنی استبداد اور سماجی بندشیں کم ہو کر اس میں سماجی رویے کشادگی، تحمل اور مساوات کی جانب ڈھلنے لگے ہیں دراصل یہ جاننا ہے کہ اس معاشرہ کا ادیب، شاعر، نقاد اور مفکر کیا اور کیسا لکھ رہا ہے؟۔ اس معاشرہ میں 'لفظ' کی کیا قدر و قیمت ہے؟ ابلاغی عمل کس سمت جا رہا ہے؟ ڈاکٹر جمیل جالبی کے ساڑھے چار سو صفحات اور ننانوے مضامین پر مشتمل اس مجموعہ سے رابطہ کرنا دراصل عصری ذہن، معاشرہ اور سوچ سے اپنا رشتہ استوار کرنا ہے۔ جالبی صاحب کے یہاں لفظ کا استعمال، موضوع کا انتخاب، ادبی اور سماجی رویوں کا تجزیہ اور مسائل پر گرفت اُن کے سماجی شعور کی علامت اور اُن کی شناخت بن گئی ہے۔

زبان سماجی رشتوں کی علامت ہے اور سماجی عمل سے بنتی، بڑھتی اور بدلتی رہتی ہے۔ وہ ماضی، حال اور مستقبل کے درمیان رابطہ بھی ہے اور فرسودگی سے جُدائی اور مستقبل کا اعلان بھی ہے۔ زبان کی اس سماجی حیثیت کی طرف جالبی صاحب کے ان مضامین میں بار بار اشارے ملتے ہیں۔ ان مضامین ہی میں نہیں بلکہ جالبی صاحب کی اکثر تحریروں میں لفظ اور زبان کی سماجی عملیت اور کارآوری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اپنی تاریخ ادب اردو (جلد دوم، حصہ اول) کے پہلے باب کے آخری پیرے میں جالبی صاحب ایک سوال اُٹھاتے ہیں جس کا

جواب، دوسرے باب میں ملتا ہے: اُردو نے ہندی معاشرہ میں جگہ کیسے لی، ایسے معاشرہ میں جہاں فارسی مستحکم ہو چکی تھی؟ جالبی صاحب کے خیال میں بدلتے ہوئے سماجی رشتے اور تقاضے، معاشرہ کے گرتے ہوئے ایوان، ایک نئے ابلاغی رشتے کے متقاضی تھے۔ "اردو زبان نے عوام و خواص کے درمیان اس وسیع خلیج کو... پاٹ دیا جو اب تک دونوں کے درمیان حائل تھی" (ص ۲۱) لیکن جو زبان سماجی عدم تفریق کی بنیاد بنی، جالبی صاحب کے مطابق آج سماجی مغائرت سے مملو ہو چکی ہے۔

جالبی صاحب کے خیال میں ہمارا آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرہ سے مخاطب نہیں (ص ۱۶) ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اس میں زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش نظر نہیں آتی۔ ادیب کا معاشرہ سے رشتہ ٹوٹ جانے کے یہی معنی ہیں کہ وہ الفاظ کی سماجی اہمیت فراموش کر چکا ہے۔ الفاظ کے معنی اور ان کی سماجی عملیت کو بھول جانا حقیقتاً سماجی رشتوں کو بھول جانا ہے۔ سماجی رشتے فرائض اور ذمہ داریوں میں تقسیم و تحویل پذیر ہوتے ہیں، الفاظ کے معنی بھولنا گویا سماجی فرائض اور ذمہ داریوں کو بھلا دینا ہے۔ جالبی صاحب کا خیال ہے کہ ہمارا ادیب اب اسی منزل پر پہنچ گیا ہے۔

لیکن جالبی صاحب اس مغائرت کو ایک وسیع تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اُن کے مطابق یہی نہیں کہ آج کا ادیب مصلحتوں میں محصور اور غیر معقول تنہائیوں کا اسیر ہو گیا ہے بلکہ اس کا اپنی تاریخ سے، ثقافت سے، ماضی سے بھی رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ لیکن یہ رشتہ "لفظ آگاہی" کے ذریعہ ہی دوبارہ استوار ہو گا۔ شعوری سطح پر اس کی بنیاد رکھنی ہو گی، معقولیت کے دائرے میں ادبی عمل جاری رکھنا ہو گا۔ اس پس منظر میں جالبی صاحب "نئے لکھنے والوں" سے کہتے ہیں کہ کوئی اعلیٰ تحریر گہرے شعور کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی... یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق سے پیدا ہوتا ہے... علم و فکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم... اپنی تہذیب و ثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورت حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے (ص ۲۱-۲۲)۔ گویا الفاظ کی تلاش سماجی شناخت کی علامت ہے۔

جالبی صاحب اس تلاش کے لیے انقلابی عمل اور "معاشرہ سے جنگ" کے الفاظ استعمال

کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرہ کو جو ہریت اور نفسا نفسی کے خول سے باہر نکالنے کے لیے جرأت و بے باکی کے ساتھ "آزادی اظہار" کی راہ لینی پڑتی ہے۔ دراصل ادب ہی آزادی کے اظہار کی حقیقی صورت ہے (ص ۴۲) اور آزادی کا یہ تحقق خیالات کے تصادم سے ہی ممکن ہوتا ہے۔ سماجی عملیت اور حرکیت میں منفرد اذہان کی حریت کی تلاش اور اس کا تحقق پوشیدہ ہوتا ہے۔ سماجی عمل، فکر و ادب کا عمل ہے "قوموں کی زندگی میں صرف سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ذہن سے نہیں... بلکہ فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوتا ہے" (ص ۴۷) ــــ سماجی عملیت گویا سیاسی نظریوں اور حکمت عملیوں سے نہیں، بلکہ لفظ کے شعور سے وابستہ ہے۔

جالبی صاحب کے سماجی عملیت کے اس فلسفہ کو مختصراً یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

لفظ کا شعور و استعمال (ادب و فلسفہ) فرسودگی اور قدامت کا انکار اور حریت (امکانات) کا تحقق ــــ لفظ کی گویا دو جہتیں ہیں اور اسی لحاظ سے اس کے استعمال کے دو سیاق سامنے آتے ہیں۔ ادب ماضی سے، فرسودگی سے اور قدامت سے جنگ بھی ہے، حال کی آگاہی بھی ہے اور آزادی اور امکانات کی تلاش اور حصول بھی ہے۔ قدامت اور فرسودگی کی جانب جالبی صاحب اشارہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں داخل ہو رہے ہیں لیکن ہماری زبان اور ہمارے لسانی رویے اب تک جاگیردارانہ ہیں۔ ان کا لنگر آج بھی ایک فرسودہ سماجی و معاشی دلدل میں پڑا ہے اور " جاگیردارانہ نظام چونکہ کھوٹے سکے کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران اسی کھوٹے سکے" کو مسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں۔" (ص ۳۳-۳۴) ــ لیکن اس ذہنیت کو آپ کا تاریخی شعور، لفظ کی تفہیم اور استعمال و حریت کا احساس بدل سکتا ہے۔ نئے سماجی رشتوں سے، ادب کے نئے افق اور فکر کے نئے سوتے تلاش کئے جاسکتے ہیں۔ جالبی صاحب کے یہاں تاریخ اور تاریخی شعور کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ان کے لیے تاریخ انفرادی اور اجتماعی تشخص کی اساس ہے۔ "تاریخ انسانی فکر و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو

تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انھیں بھلا دیتی ہے" (ص ۲۸۴) ۔ جالبی صاحب کو یہ احساس ہے کہ ہمارے ثقافتی منظر میں تاریخ کے دھارے منجمد ہو گئے ہیں اور زندگی کی قدریں معاشرے میں سوکھ کر مرجھا رہی ہیں ۔ جالبی صاحب جب لفظ 'شعور' استعمال کرتے ہیں تو وہ اسے محض ایک نفسیاتی اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک توجیہاتی تصور کے طور پر، ایک فکری ضابطے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کے لیے یہ تصور بیک وقت حافظہ (ماضی) اور متخیلہ (مستقبل، امکان) کے درمیان واسطہ اور ان کا سنگم ہے۔

اس مجموعہ میں شامل مضامین متنوّع ہونے کے باوجود ایک داخلی رشتے میں مربوط ہیں۔ جالبی صاحب کے سوانحی خاکے ہوں، موضوعاتی تبصرے ہوں یا ادبی جائزے، وہ ہر جگہ یہ دریافت کرتے نظر آتے ہیں: کیا اس شاعر، ادیب، یا دانشور کی تحریر سے پرانے بُت ٹوٹ گئے (ماضی)؟ کیا نیا شعور بیدار ہوا؟ (امکان، مستقبل، آزادی کا تحقق)۔

ان سوالوں کے جواب آپ کو ان مضامین میں ملیں گے لیکن آپ کو یہ مضامین ایک سے زیادہ بار پڑھنے ہوں گے اور اس عمل میں آپ اپنے سماج، اپنی ثقافت اور شاید خود اپنی ذات کو پہچان جائیں اور مولانا عبدالرحمٰن جامی کے ان اشعار کا جواب مل جائے جن کی جانب جالبی صاحب نے اس مجموعہ کے پہلے مضمون میں اشارہ کیا ہے۔

ادب کی صورتِ حال

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے اپنی مثنوی "سلامان و ابسال" میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک کُرد کوہ و صحرا سے کسی بڑے شہر میں آیا۔ یہاں آیا تو دیکھا کہ انسانوں کا سمندر ہے جو سڑکوں پر چاروں طرف بہہ رہا ہے۔ کُرد نے یہ سماں دیکھا تو گھبرا گیا اور سوچنے لگا کہ اگر میں اس بھیڑ میں ملا جُلا تو یقیناً گم ہو جاؤں گا اس لیے ضروری ہے کہ اپنی شناخت باقی رکھنے کے لیے کوئی ایسا نشان مقرر کروں کہ اگر گم بھی ہو جاؤں تو اس نشان کے ذریعے خود کو پہچان سکوں۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک کدو اُسے راستے میں پڑا ہوا نظر آیا۔ اس نے کدو اٹھایا اور اپنے پیر سے باندھ لیا تاکہ اپنی پہچان کر سکے۔ ایک مردِ دانا اُدھر سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ ایک کُرد پاؤں سے کدو باندھے چلا جا رہا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر وہ بات کی تہ تک پہنچ گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ کچھ دُور جا کر کُرد رُک گیا اور ایک جگہ سونے کے لیے لیٹ گیا۔ جب کُرد سو گیا تو مردِ دانا قریب آیا اور کُرد کے پاؤں سے کدو کھول کر اپنے پاؤں میں باندھ لیا اور وہیں لیٹ گیا۔ کُرد جب بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ کدو کسی اور کے پاؤں میں بندھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا اور آواز دی کہ اے شخص میں اپنے معاملے میں حیران و پریشان ہوں۔ اُٹھ اور مجھے بتا کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ اگر یہ میں ہوں تو یہ کدو تیرے پاؤں میں کیسے بندھا ہوا ہے اور اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟

گر منم چوں ایں کدو بر پائے تست — ایں منم یا تو نمی دانم درست
در شماری من نیایم چیستم — ور توئی ایں من کجا یم کیستم

یہی مسئلہ جو اُس وقت کُردِ سادہ کے سامنے تھا یہی مسئلہ آج تہذیبی، فکری اور ادبی سطح پر ہمیں درپیش ہے۔ ہم نے بھی آج اپنی شناخت گم کر دی ہے اور فکر و خیال کی بھیڑ میں یہ پوچھ رہے ہیں

کہ اگر یہ تو ہے تو پھر ہیں کہاں ہوں ؟ اور اسی وجہ سے ہم آج ذہنی و فکری سطح پر بے سمت اور بے جہت ہیں۔ لفظ بغیر معنی کے مہمل ہے اور مہمل وہ ہے جس کے کوئی معنی نہ ہوں۔ اپنے ادب کو دیکھیے تو اس وقت یہ مہمل بے مقصدیت کا شکار ہے۔ اس کی روح میں کوئی ایسی معنویت نہیں ہے جس سے فرد اور معاشرے کے بنیادی سوالوں کا جواب مل رہا ہو۔ وہ جواب جس سے فرد و معاشرہ میں شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے فکری زندگی کا بیج پھوٹتا ہے اور فکر میں جہت پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا ادب عام طور پر فرد اور معاشرے سے مخاطب نہیں ہے۔ فکشن ابلاغ کے راستے سے کٹ کر علامت اور تجریدیت کی طرف چلا گیا ہے جہاں وہ اپنی بے معنویت کو "بظاہر معنویت" کے پردے میں چھپا رہا ہے۔ شاعری کو دیکھئے تو فکر و خیال کی سطح پر وہ ایک گہرے بحران اور الجھاووں کا شکار ہے۔ اس میں چٹکلے بازی تو نظر آتی ہے لیکن معنی نظر نہیں آتے۔ وہ معنی جس سے شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے زندگی آگے کی طرف بڑھتی ہے۔ اس وقت ایک ایسا سناٹا ہے کہ جس میں حرکت کا عمل بند سا ہو گیا ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ معاشرے میں انسانی و معاشرتی اقدار، صداقتوں کی تلاش اور زندگی کی معنویت دریافت کرنے کی کوشش بھی نظر نہیں آتی۔ ہمارا ادب اجتماعی رشتوں سے کٹ گیا ہے اور ادیب تخلیق کے کرب میں مبتلا رہنے کے بجائے آسائش کے لطف کی تلاش میں دن رات سرگرداں ہے۔ یہی مقصدِ اولیٰ ہے اور ادب اسی کے حصول کا ذریعہ ہے۔ ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ میں سے کچھ لوگ ناراض ہو جائیں لیکن جب ادب و فکر میں منفی رجحانات داخل ہو جائیں تو ان کی نشان دہی کرنا اور انھیں رد کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ میرا یہ عمل بھی اسی خلوصِ نیت پر مبنی ہے۔

اس منفی رجحان کی ذمہ دار آج کی نسل نہیں ہے۔ اس کام کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا تھا۔ ۱۹۵۸ء والی نسل نے ادب کو ذاتی مفادات کے لیے استعمال کرنے کا عمل شروع کیا اور آج کی نسل اسی فصل کو، جو پک کر تیار ہو گئی ہے، کاٹ رہی ہے۔ اس وقت میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس صورتِ حال کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں تاکہ آج کی نسل، جسے زندگی کا بہت لمبا سفر ابھی طے کرنا ہے، ان رجحانات اور رویوں کو رد کر کے اس راستے کو اپنائے

جس پر چل کر ہم ادب کے ذریعے بنیادی سوالوں کو اٹھا کر ان کے جواب کی تلاش کے سفر پر روانہ ہو سکیں تاکہ ادب پھر اس شعور کے پیدا کرنے کا سبب بن سکے جو ادب کا ہمیشہ سے منصب رہا ہے اور جس سے فرد اور معاشرے کی نہ صرف تقدیر بدل جاتی ہے بلکہ زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ جس سے تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ وہ شعور جس سے ذہن بدلتا ہے اور انسان پیدا ہوتے ہیں۔

اپنے دور کے ادب کا مربوط مطالعہ کیجئے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ یہ وہ ادب نہیں ہے جس میں اپنے زمانے کی روح کار فرما ہوتی ہے اور جس سے ہم زمانے کو پہچانتے ہیں۔ یہ ویسا ادب بھی نہیں ہے جیسا وہ ہو سکتا تھا یا ہونا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ادب، زندگی کے دھارے پر بہتے ہوئے، سچائیوں کے اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ گویا ادب زندگی کا اور اس زندگی کی سچائیوں کا اظہار کرتا ہے جن کا ادیب و شاعر کی حیثیت سے، آپ نے تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ مصلحتیں اور منافقتیں تو تخلیقِ ادب کی دشمن ہیں۔ ۱۹۵۸ء کے بعد سے عام طور پر ہمارا ادیب تعلقاتِ عامہ کے راستے پر چل پڑا ہے اور اپنا معاشرتی درجہ بڑھانے کے لیے ادب کو استعمال کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب اور فکر و خیال اب منزل نہیں بلکہ محض شہرت حاصل کرنے اور زندگی کی زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور معاشرتی رتبے بٹورنے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور یہ رجحان یقیناً ایسا ہے جو ادب اور فکر و خیال کا سفاک دشمن ہے۔ اس صورت حال میں ویسا ہی ادب پیدا ہو گا جیسا ہو رہا ہے۔

یہ وہ صورت حال ہے جو اَتائی (سوڈو) دانشوروں کو بہت راس آتی ہے۔ ایزرا پاونڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "سچا اور سنجیدہ فن کار قدر شناسی سے اتنا ہی بے نیاز ہوتا ہے جتنا کوئی سنجیدہ سائنس دان ہوتا ہے۔ اتائی فن کار سنجیدہ فن کار سے تعداد میں زیادہ ہوتے ہیں اور اتائی فن کار تعلقاتِ عامہ کے ذریعہ وہ انعامات بھی حاصل کر لیتا ہے جو دراصل سنجیدہ فن کار کو ملنے چاہئیں۔ یہ فطری بات ہے کہ اتائی فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ حقیقی فن کار اور اتائی فن کار میں تمیز نہ ہونے دے۔" یہ صورت ہر دور

میں نظر آتی ہے لیکن سب ادیبوں کا جب یہی مقصدِ حیات بن جائے تو اس سے ادب کی وہ حالت ہو جاتی ہے جو اس وقت ہمارے ادب کی ہے۔ اس وقت ادیبوں کو اور نہ معاشرے کو اتنی فرصت ہے کہ وہ زندگی میں فکر و خیال کی اہمیت کو فی الحقیقت محسوس کر سکے یا کرا سکے۔ زر پرستی کی ایک دوڑ ہے جس میں سب شریک ہیں اور فکر و خیال کے ساتھ ادب کا بیج بھی مر رہا ہے۔ معاشرہ اسی لیے سستی تفریحات سے دل بہلانے میں مصروف ہے اور ادیب بہترین آسائشوں کے حصول میں لگا ہوا ہے اور میں مولانا جامی کی طرح پوچھ رہا ہوں کہ یہ میں ہوں یا یہ تو ہے۔ اگر یہ تو ہے تو پھر میں کہاں ہوں؟۔

(۱۹۸۷ء)

نئے لکھنے والوں سے

طلبہ وطالبات کی نئی نسل میں آج بھی ایسے نوجوان موجود ہیں جنھیں ادب سے نہ صرف دلچسپی ہے بلکہ جو ادب کو، اپنے احساسات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنا رہے ہیں۔ یہ بات بذات خود بڑی خوش آیند ہے۔ اُن کی تحریروں سے اس بات کا بھی واضح طور پر اظہار ہوتا ہے کہ اُن میں وہ فطری میلان طبع موجود ہے جو ادب کی تخلیق کے لیے انسان، پیدائش کے وقت، ساتھ لے کر آتا ہے۔ جب یہ فطری صلاحیت موجود ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر صحیح سمت میں سفر کیا جائے اور اس سفر کی صحیح تیاری کی جائے تو آج کے یہ نوجوان کل کے بڑے ادیب، بڑے شاعر، بڑے نقاد و مفکر بن کر سامنے آئیں گے۔ میں نے صحیح سمت اور صحیح تیاری کا ذکر کیا ہے۔ صحیح سمت سے مراد یہ ہے کہ آپ کو یہ ابھی سے معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی منزل کیا ہے اور اس منزل کا راستہ کیا ہے؟ پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس راستے کی مسافت طے کرنے کے لیے آپ کو کیا تیاری کرنی ہے؟ منزل کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ کو ادب کی کون سی صنف میں اپنے تجربات وخیالات کا اظہار کرنا ہے اور پھر یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ اس صنف کو اختیار کرنے کے لیے آپ کو کیا کیا پڑھنا ہے؟ پڑھنا ادب کی تخلیق کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا زندہ رہنے کے لیے سانس لینا ضروری ہے۔ اس بات کی میں یہاں ذرا سی وضاحت کروں گا جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنی صلاحیت کے ٹمٹماتے چراغ کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ بعض بچے زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور بعض نسبتاً کم ذہین ہوتے ہیں۔ ذہین بچوں کے چراغ میں، کم ذہین بچوں کے مقابلے میں، زیادہ تیل موجود ہوتا ہے۔ اب اگر ذہین بچہ اپنی صلاحیت کے چراغ میں مزید تیل نہ ڈالے اور اس کے مقابلے میں کم ذہین بچہ مسلسل تیل ڈالتا رہے تو کچھ ہی عرصے میں ذہین

بچے کا چراغ بجھ کر رہ جائے گا اور کم ذہین بچے کا چراغ اسی طرح مسلسل روشن رہے گا۔ گویا چراغ میں مسلسل تیل ڈالنے کا عمل بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ تیل دراصل مطالعے سے، غور و فکر سے صلاحیت کے چراغ میں آتا ہے اور اسے زندہ و روشن رکھتا ہے۔

آپ نئی کار خریدنے ہیں تو شو روم کا مالک ایک گیلن پٹرول ڈال کر گاڑی آپ کے سپرد کر دیتا ہے۔ آپ اس تیل کی مدد سے اپنے گھر آجاتے ہیں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ ساری عمر اسی تیل سے آپ اپنی گاڑی چلاتے رہیں۔ اس عمل سے یہ بات سامنے آئی کہ جیسے آپ کے چراغ یا گاڑی کے لیے تیل کا مسلسل ڈالنا ضروری ہے اسی طرح ادب کے لیے مطالعہ کا تیل تخلیق کے چراغ میں ڈالتے رہنا ضروری ہے۔ وہ لوگ جو صرف لکھتے ہیں اور پڑھنے کا شوق نہیں رکھتے ان کی تحریریں جلد ہی مرجھانے لگتی ہیں اور وہ جلد ہی خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ فکر اور اظہار، خیال اور احساس کی سطح پر خود کو دہرانا لکھنے والے کی شکست ہے اس لیے ضروری ہے کہ آپ یہ بات یاد رکھیں کہ ادب کی دنیا میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے مطالعہ اور غور و فکر ضروری ہے۔ مطالعہ وہ راستہ ہے جس سے ادیب اپنی منزل تک پہنچتا ہے۔

آپ وہ سب کچھ پڑھیں جو آپ کو پڑھنا چاہیے۔ آپ نہ صرف اپنی زبان کا سارا جدید ادب پڑھیں بلکہ قدیم ادب کا مطالعہ بھی ذوق و شوق سے کریں تاکہ آپ اپنے ادب کی روایت سے پوری طرح واقف ہو سکیں۔ روایت سے رشتہ کاٹ کر آپ کی تحریر بے جان رہے گی۔ پھر یہی نہیں بلکہ آپ کم از کم ایک دوسری زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں، نہ صرف واقف ہوں بلکہ اس کے مزاج دان بھی ہوں۔ آپ کی تحریر میں تازگی، توانائی اسی وقت پیدا ہو گی جب آپ اپنی زبان کے ادب کے ساتھ ایک بیرونی زبان کے ادب سے بھی واقف ہوں۔ اس لیے میں آپ کو یہ مشورہ دوں گا کہ آپ سستی شہرت سے گریز کریں اور آج ہی اپنی ذہنی بنیادوں کو مطالعے کے ذوق سے اتنا مضبوط بنالیں کہ اس پر آپ تخلیق کی بڑی اور عظیم الشان عمارت تعمیر کر سکیں۔

ہر وہ شخص جو ادب و فن کی دنیا میں قدم رکھنا چاہتا ہے یہ عمل اس کے لیے لازمی ہے۔ میری اپنی زندگی کا تجربہ یہی بتاتا ہے اور یہی بات میں اس نئے ادیب تک

پہنچانا چاہتا ہوں جو ادب کی دنیا میں کچھ کرنا چاہتا ہے تاکہ تاریخ میں اس کا نام روشن جلی لفظوں میں لکھا جا سکے۔ یہ بات بظاہر بہت آسان سی نظر آتی ہے لیکن یہ راستہ اتنا پرخار اتنا دشوار، اتنا پُرپیچ ہے کہ اکثر راہ گیروں کی سانس پھول جاتی ہے اور پھر وہ وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ کبھی مالی مسائل کانٹے بن کر پاؤں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ کبھی گھریلو الجھنیں مجروح کر دیتی ہیں اور کبھی ناسازگار حالات ہمت کو پست اور حوصلوں کو مُردہ کر دیتے ہیں۔ ادب و فن کا راستہ اسی لیے زندگی کو قربان کرنے اور جان پر کھیل جانے کا راستہ ہے۔ یہ نہ آسائش کا راستہ ہے اور نہ معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کا راستہ ہے۔ یہ صرف ایثار کا راستہ ہے۔ اس لیے اس دشوار گذار راستے پر چلنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے تاکہ اگلے سفر میں آپ کو کسی قسم کی تھکن پسپا نہ کر سکے۔ اگر آپ کو دولت کمانی ہے تو پھر اس راستے کو چھوڑ دیجیے اور وہ کام کیجیے جو دولت کمانے کے لیے ضروری ہیں۔ ہر نوجوان اپنی زندگی میں کچھ بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ اگر آپ نے شاعر یا ادیب بننے کا خواب دیکھا ہے تو پہلے یہ بات طے کر لیجیے کہ آپ کبھی مالدار نہیں بن سکتے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی سوچ لیجیے کہ آپ اپنی زندگی بغیر مناسب آمدنی کے اس طور پر بسر نہیں کر سکتے جس طور پر ادب و فن کے لیے ضروری ہے۔ روپیہ کمانا آپ کا مقصد یا منزل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ آپ کی منزل ادب و فن ہونا چاہیے۔ اس صورت میں ضروری ہے کہ آپ اپنے لیے ایسا ذریعۂ آمدنی پیدا کیجیے جس سے آپ کی منزل سامنے رہے اور آپ کا راستہ مسدود نہ ہو۔ آپ کی طبیعت میں درویشانہ بے نیازی ہونی چاہیے اور آپ کا مقصدِ حیات ہمیشہ ہر چیز پر حاوی رہے۔ جو کام آپ کریں شعور کے ساتھ کریں۔ شہرت کے پیچھے نہ بھاگیے بلکہ کام اور صرف کام کیجیے تاکہ شہرت اس کام کی کوکھ سے پھوٹے۔ یہ وہ شہرت ہو گی جو آپ کے قد کو بلند، آپ کے جوہر کو روشن اور آپ کے نام کو ازخود اونچا کرے گی۔ یہ مشکل راستہ ہے لیکن یہی وہ راستہ ہے جس پر بڑے ادیبوں اور لکھنے والوں نے سفر کیا ہے اور منزل تک پہنچے ہیں۔

کوئی اعلیٰ ادبی تخلیق زندگی کے گہرے شعور کے بغیر وجود میں نہیں آتی۔ زندگی کا شعور وہ حقیقی روشنی ہے جس سے تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ یہ شعور زندگی سے گہرے تعلق

سے پیدا ہوتا ہے۔ زندگی کے تجربات سے پروان چڑھتا ہے۔ علم وفکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ضروری مطالعہ، موجود زندگی کی تفہیم، تاریخ کے مطالعے، مختلف خیالات دنیا میں ایک مخصوص زمانے میں کیوں ابھرے اور پھیلے اور کیوں اور کب مر گئے، اپنی تہذیب وثقافت کی تاریخ اور اس کی موجود صورتِ حال پر غور کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ شعور کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے مسئلہ اور اس کی نوعیت کو سمجھ لیا ہے۔ زندگی ایک "اکائی" ہے۔ اگر آپ ایک "جزو" پر قادر ہونا چاہتے ہیں تو پھر پوری اکائی کا علم اور اس سے آگاہی ضروری ہے۔ یہی شعور آپ کی تحریروں کو وہ رنگ و نور عطا کرتا ہے جس سے تخلیق میں معنویت پیدا ہوتی ہے۔ اس شعور میں ماضی بھی شامل ہوتا ہے اور حال بھی۔ حال دراصل مستقبل کا ماضی ہے اسی لیے ہر لکھنے والے کو "حال" کے ساتھ زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اسے قبول بھی کرنا چاہیے اور رد بھی۔ وہ لکھنے والے جو زمانۂ موجود کو رد کر کے صرف ماضی یا مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو ایسے میں نہ ماضی ان کا ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل ان کا مستقبل ہوتا ہے۔ نئے لکھنے والوں کو میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ساتھ پوری طرح زندگی بسر کریں۔ اسے محسوس کریں۔ اس کی خوشبو کو اپنے وجود کا حصہ بنائیں۔ اس کی بصیرت حاصل کریں۔ اسے بہتر بنانے کے لیے اپنے قلم سے جدوجہد کریں۔ اس کی منفی قوتوں کے خلاف آواز بلند کریں اور اپنے ضمیر کی آواز کو سارے عالم کو سنانے کے لیے قلم کا سہارا لیں۔ ہمارے دور کی منفی قدریں وہ قدریں ہیں جو انسان انسان کے درمیان حاکم ومحکوم کا رشتہ قائم کرتی ہیں، جو استحصال کو پالتی پوستی ہیں، جو دولت کو چند ہاتھوں میں جمع کر کے سب دوسروں کو رعیت بنا دیتی ہیں۔ جو عدل و انصاف کو ختم کرتی ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو ان قدروں کے خلاف جہادِ قلم کرنا چاہیے۔ آپ اسی لیے تو لکھنے کی طرف مائل ہیں کہ آپ کو ان ناانصافیوں اور زندگی کی موجود بے معنویت کا احساس ہے اور آپ اسے بامعنی و بامقصد بنانا چاہتے ہیں۔

آپ روحِ عصر کو اپنے فن میں اس طور پر سمونے کی کوشش کیجیے کہ آپ کا فن آپ کے دور کا اظہار بن جائے لیکن یہ اظہار ایسا ہو جو اپنے دور کا حوالہ بننے کے ساتھ آپ کی روح کا بھی اظہار ہو اور آنے والے زمانوں کا احساسِ جمال بھی اس میں موجود ہو۔ یہ فی الحقیقت

بہت بڑا کام ہے لیکن اگر آپ کو بڑا بننا ہے تو پھر یہی کام آپ کو کرنا چاہیئے اور اس کام کو کرنے کے لیے سخت محنت، وسیع مطالعہ، گہری فکر بھی کرنی چاہیے۔ میرا اپنا خیال ہے اور آپ بھی اس پر غور کیجیے کہ تاریخ کی اس منزل میں جہاں آپ کھڑے ہیں۔ جہاں ادب و فن کی دنیا میں بہت بڑے بڑے کام ہو چکے ہیں صرف الگ راستہ بنانا کوئی منزل نہیں ہے بلکہ امتزاج (Synthesis) اس دور کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور اسی امتزاج کی کوکھ سے آج کا اور مستقبل کا بڑا ادب یا فن پیدا ہو سکتا ہے اور ہوگا۔ آپ اس پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ اس سلسلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں یا آپ کو کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنی بات جدید مصوری کی ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ خطاطی ایک الگ فن ہے اور مصوری ایک ایک الگ فن ہے۔ صادقین نے، شاکر علی نے، زوبی نے، خطاطی اور مصوری کے امتزاج سے اسے ایک ایسی صورت دی کہ خطاطی اور مصوری ایک دوسرے میں جذب ہو کر ایک نئی صورت میں جلوہ گر ہو گئے اور آج نئی نسل کے مصور اس راستے پر خوش دلی سے چل رہے ہیں۔ آپ بھی اسی طرح فکر و احساس کے تعلق سے ایک نیا امتزاج تلاش کیجیے۔ آپ بھی بڑے مصور، بڑے فن کار بن سکیں گے۔

نئے لکھنے والوں سے اختصار کے ساتھ چند باتیں میں اور کرنا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ آپ جو کچھ کہیں، جو کچھ لکھیں آپ کی آواز میں دلِ درد مند کی لَے شامل ہو۔ اس میں آپ کے خلوص کی مہک موجود ہو۔ آپ کی آواز میں سچائی کے اظہار کی توانائی موجود ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب آپ دیانت کے ساتھ اپنی بات کہہ رہے ہوں۔ مصلحتیں مصالحتوں کو جنم دیتی ہیں اور مصلحتیں تخلیقی توانائی کو برباد کر دیتی ہیں۔ عزیزو! آپ تو جوان ہیں۔ آپ نے زندگی کے سفر کا ابھی آغاز کیا ہے۔ زندگی کو بنانا یا سنوارنا آپ کا اصل کام ہے۔ وہ زندگی جو آپ کو ملی ہے وہ نہیں ہے جو آپ اپنے بعد کی نسلوں کو دیں گے۔ یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ آنے والی نسلوں کو وہ زندگی دیں جو عدل و مساوات کی زندگی ہو۔ جو حق و دیانت کی زندگی ہو، جو انسانیت و محبت کی زندگی ہو۔ وہ زندگی جو میں نے اپنی نئی نسل کو دی ہے اس میں دغا و فریب شامل ہے۔ اس میں استحصال و جبر موجود ہے۔ اس پر منفی قوتیں

حاوی ہیں۔ اس میں مریضِ انسانیت تڑپ تڑپ کر سسک رہا ہے۔ وہ زندگی جس پر بنیا حاوی ہے جس پر سُود کی لعنت مسلط ہے اور جس نے ساری زندگی کو جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ جنگ جو ساری دُنیا کو آناً فاناً میں فنا کر دے گی اور یہ خوب صورت پہاڑ، یہ حسین مرغزار، یہ کھلتے ہوئے خوشبودار پھول، یہ دریا، یہ سمندر، یہ آبشار اور یہ انسان کی تراشی ہوئی دلفریب زندگی معدوم ہو جائے گی۔ میں آپ کے سامنے اس لیے شرمسار ہوں اور زندگی کے محشر میں اپنا اعمال نامہ لیے آپ کے سامنے گناہگار کی طرح کھڑا ہوں اور آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں اپنی زندگی کے مشن میں، زندگی کی قدریں بدلنے میں ناکام ہو گیا۔ میرا قلم ادب کی دُنیا میں وہ کام نہیں کر سکا ہے جو اسے کرنا تھا لیکن میری عبرت آپ کے لیے ایک سبق ہے اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کا قلم وہ کام کرے جو اسے کرنا چاہیے۔ میں آج آپ کی توجہ اسی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ کام جو مجھ سے اور میری نسل سے نہ ہو سکا وہ آپ ہمت، حوصلے اور دیانت کے ساتھ کریں۔ عزیزو! اس وقت مجھے مصحفی کا ایک شعر یاد آ رہا ہے وہ شعر برمحل ہے یا نہیں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ اسی شعر پر اپنی بات کا اختتام کروں:

وصل کی شب بھی لڑائی ہی رہی یار کے ساتھ
سر سے عاشق کے عذابِ شبِ ہجراں نہ گیا

اب یہ فیصلہ آپ خود کیجیے کہ یہ شعر برمحل تھا یا بے محل تھا۔ غزل کے اچھے شعر کی یہی خوبی ہوتی ہے۔

(۲۰ر دسمبر ۱۹۸۲ء)

صحیح ادبی رویّہ

ممتاز اصحاب کے انٹرویو ہمارے ہاں برسوں سے کیے جا رہے ہیں لیکن طاہر مسعود نے اس صنفِ جدید کے کینوس کو نہ صرف وسیع کیا ہے بلکہ انٹرویو دینے والوں سے ان کے دل کی بات کہلوا کر اس ہنر کو فن بنا دیا ہے۔ انھوں نے انٹرویو سے پہلے ضروری تیاری کی ہے تاکہ اس شخص کے کاموں سے واقف ہو کر گفتگو کی جا سکے۔ اس کتاب کے سارے انٹرویو کو جب میں نے ایک ساتھ پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ اس کتاب سے نہ صرف انٹرویو دینے والے کے مزاج، شخصیت اور خیالات سے اچھی واقفیت ہو جاتی ہے بلکہ گذشتہ پچاس سال کے اہم واقعات، تحریکیں، نظریات اور مسائل بھی اس کتاب میں یکجا ہو گئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو اس کتاب کو اہم بنا دیتی ہے۔

اب تو خیر ادبی گروہ بندی کی نوعیت بدل گئی ہے لیکن آج سے بیس پچیس سال پہلے تک ادبی قربتوں کا سبب ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی ہوتا تھا۔ ہم خیال لوگ اکٹھا ہو جاتے تھے اور ان میں ذاتی مفاد کا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا تھا۔ طاہر مسعود نے جب فیض احمد فیض سے اس قسم کا سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "ہم اپنی ذات کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور نہ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ اپنی ذات کے لیے کسی سے لڑائی جھگڑا شروع کر دیں۔ کوئی اصول یا نظریے کی بات ہو تو اس پر بحث کی جا سکتی ہے، کیوں کہ بحث کرنے کا جواز موجود ہے لیکن اگر کوئی ذاتی اعتراض ہو اور آپ اس کا اسی شدت سے جواب دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آپ معترضین کی سطح پر اتر گئے ہیں" (ص ۲۴)، یہی وہ سطح ہے جو ایک بڑے

آدمی کی ذہنی سطح ہونی چاہیے اور اب تک ہمارے بڑے ادیب اسی سطح کو برقرار رکھتے آئے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں 'نیادور' کے تازہ شمارے میں محمد حسن عسکری صاحب کے خطوط شائع ہوئے ہیں اور ان میں بھی یہی پہلو ملتا ہے کہ عسکری صاحب کی ترقی پسندوں سے جنگ ذاتی نہیں بلکہ نظریاتی تھی۔ ممتاز شیریں کے نام ایک خط مورخہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۸ء میں انھوں نے لکھا کہ :

"ہمارے ہاں بعض عناصر ایسے بھی ہیں جو کلچر اور ادب کا نام لے کر سیاسی یا ذاتی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں حالاں کہ ان کی ادبی سرگرمیاں صفر کے برابر ہیں۔ ہمیں اس ذہنیت سے بھی اپنے آپ کو پاک رکھنا ہے۔ یہاں ایسے لوگ بھی ہیں جو مخالفت کے جوش میں ترقی پسندوں کو جیل بھجوانا چاہتے ہیں۔ جس دن منٹو کو اور مجھے پتہ چلا کہ حکومت ترقی پسندوں کی نگرانی کر رہی ہے اس دن سے ہم نے ارادہ کر لیا کہ کم سے کم ہم دونوں ترقی پسندوں کے خلاف نہیں لکھیں گے بلکہ منٹو نے تو اپنا ایک مضمون بھی واپس منگا لیا۔ ہماری ادبی بحثیں الگ ہیں۔ ہم انھیں ادب میں پچھاڑنا چاہتے ہیں۔ پولیس کی مدد سے نہیں۔ ہم اپنی حکومت کے لیے بھی جاسوسوں کا کام نہیں کر سکتے بلکہ اگر حکومت نے ادبی سرگرمیوں کی بنا پر کسی ادیب کو گرفتار کیا تو سب سے پہلے ہم احتجاج کریں گے۔"

(نیا دور شمارہ ۷۹۔۸۰ ص ۲۹۳)

یہ وہ زاویۂ نظر تھا جو ایک سچے اور بڑے ادیب ہی کا انداز نظر ہو سکتا ہے اور یہی انداز نظر ہمیں فیض کے انٹرویو اور حسن عسکری کے خطوط میں نظر آتا ہے ۔۔ ادب و فکر کی سطح پر ہمارے اختلاف ذاتی نوعیت کے ہرگز نہیں ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادب میں، چوں کہ ذاتیات کا مسئلہ سب سے اہم ہو گیا ہے، اخلاص کی خوشبو مر گئی ہے اور ادب کا اثر بے اثر ہو گیا ہے :

مندا ہے حسن و عشق کا بازار آج کل
لگتا نہیں ہے دل کا خریدار آج کل

فیض احمد فیضؔ ادب کے تعلق سے اسی لیے پارٹی لائن کی مخالفت کرتے ہیں اور اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں کہ

"سیاست سے عملاً علیحدہ رہتے ہوئے اس سے ذہنی اور جذباتی تعلق رکھنا ایک بات ہے اور سیاست میں عملی طور پر شامل ہونا بالکل دوسری بات . . . . ادب اور شاعری کا قاعدہ تو صرف اس حد تک ہے کہ زندگی کی چند بنیادی قدریں ہیں جن کی حفاظت کرنی چاہیے۔ نیکی، انسان دوستی، صداقت کا تحفظ ادیبوں اور شاعروں کا اوّلین فریضہ ہے اور جن سیاسی کارروائیوں پر ان کا اطلاق ہوتا ہے اس حد تک جد و جہد بھی کرنی چاہیے۔ جہاں تک کسی پارٹی یا جماعت میں شامل ہو کر ان کے قواعد کی پابندیوں کا تعلق ہے شاعر و ادیب پر ان کی پابندی لازمی نہیں ہے۔" (ص ۲۵)

یہی وہ زاویۂ نظر ہے جو ہمارے دور کے ادیبوں کو اپنانا چاہیے۔ اس میں ادب کا بھی بھلا ہے اور تخلیقی سرگرمیوں کا بھی۔ ایک جگہ فیض احمد فیضؔ نے شاعری اور صحافت کا فرق نہایت خوب صورتی سے واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

"شاعری اور صحافت میں بس اتنا فرق ہے کہ صحافت میں جمالیاتی پہلو نہیں ہوتا۔ جمالیات کو آپ ابلاغ میں شامل کرلیں تو ادب بن جاتا ہے اور جمالیات کو خارج کردیں تو صحافت بن جاتی ہے۔"
(ص ۳۰)

اسی قسم کی بات سلیم احمد نے اپنے انٹرویو میں کہی ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے خیال میں کسی بھی اسلامی ریاست میں غیر مقصدی ادب کے وجود کو قبول کیا جاسکتا ہے تو سلیم احمد نے کہا کہ:

"جو ادیب مقصدی ادب پیش کرنا چاہتے ہیں وہ مقصدی
ادب پیش کریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا لیکن جو لوگ ایسا مقصد
نہیں رکھتے ان کا ادب بھی ادب ہوگا اور انھیں پیش کرنے کا حق ہوگا۔
اس سلسلے میں ایک سوال یہ ہے کہ میرے نزدیک پاکستان جیسی اسلامی
ریاست میں ایسے ادب کی تخلیق کی گنجائش ہے جو ریاست کے مقاصد
کو پورا نہ کرتا ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ میری غزل ریاست پاکستان کے کسی
مقصد کو پورا نہیں کرتی لیکن اس کے باوجود وہ اہم اور وقیع ہے
کیوں کہ اس کی سچائیاں میرے نفس کی سچائیاں ہیں اور اس میں میرے
ایسے تجربات تخلیق کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں جن کا ریاست سے کوئی
تعلق نہیں ہے۔ غرض یہ سمجھ لینا کہ ادب یقیناً ریاست کے مقاصد کے
تابع ہونا چاہیے یہ کہنے کے مترادف ہے کہ ادب کو سیاسی، معاشی اور
ریاست کی دیگر ضروریات کے مترادف ہونا چاہیے"۔ (ص۔ ۵۰)

یہاں میں نے ایک زاویے سے ادب کے بارے میں تین اہم ادیبوں کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے اور آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ تینوں نے مختلف سیاق و سباق کے باوجود ادب کی ماہیت کے تعلق سے ایک سی باتیں کہی ہیں اور یہی وہ انداز نظر ہے جو ایک ادیب کا ہونا چاہیے۔ اس کتاب کو ہر اس شخص کو دل لگا کر پڑھنا چاہیے جو بڑا ادیب بننا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے بڑے معاصرین کی رائے سے ادب کے بارے میں صحیح رویہ اختیار کر سکے۔

(۵ر اگست ۱۹۸۵ء)

شاعری اور مسائلِ حیات

کسی نے کہا ہے کہ شاعری "مسائلِ حیات" کے اظہار اور اس کی ترجمانی کا نام ہے۔
میں آج خود سے یہی سوال پوچھتا ہوں کہ شاعری کے تعلق سے "مسائلِ حیات" کے آخر کیا معنی
ہیں؟۔ روٹی کپڑا مکان اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل بھی مسائلِ حیات کے ذیل
میں آتے ہیں۔ اپنوں، ہمسایوں اور ہسپتال میں لب دم سسکتے ہوئے بیماروں کو دیکھ کر جو کیفیت
پیدا ہوتی ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل میں آتی ہے۔ معاشرے میں جو ناانصافیاں ہیں
اور جو ظلم و جبر ان ناانصافیوں کی کوکھ سے جنم لے رہا ہے وہ بھی مسائلِ حیات کے ذیل
میں آتا ہے۔ آپ کے ذاتی مسائل، دکھ درد، غم روزگار، غم جہاں اور غم جاناں یہ بھی اسی زمرے
میں آتے ہیں۔ وہ نظامِ فکر، وہ روایات، وہ چلن، وہ طرزِ حیات جس نے معاشرے کو منجمد
کر دیا ہے وہ بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ معاشرے کے باطن میں ہونے والا اضطراب مخصوص
حالات سے پیدا ہونے والی بے چینی اور اس بے چینی سے پیدا ہونے والے جذبات، احساسات
اور خیالات یہ بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ زیرِ فلک انسان
دیکھ رہا ہے، جو کچھ وہ کر رہا ہے اور اس کے کرنے سے جو صورتیں سامنے آ رہی ہیں جو اچھائیاں
یا برائیاں پیدا ہو رہی ہیں اور خیر و شر کی جو صورتِ حال وجود میں آ رہی ہے وہ سب مسائلِ
حیات کے ذیل میں آتی ہیں۔ ان کو بیان کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ ان مسائلِ حیات
کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کسی اخبار میں واقعاتی اور حقائق پر مبنی ایک مضمون لکھ دیں۔ اگر
آپ اخبار کے مدیر ہیں تو اس موضوع پر اداریہ لکھ دیں گے۔ آپ اخبار کے شاعر ہیں تو اس پہلو
پر کوئی نظم یا قطعہ لکھ دیں گے اور اس طرح اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کر کے اپنا بوجھ

ہلکا کر دیں گے لیکن جب میں شاعری کی بات کرتا ہوں تو مسائلِ حیات کے تعلق سے اس میں دو سطحوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک سطح یہ ہے کہ مسائلِ حیات کے تعلق سے جب آپ شعر پڑھیں تو آپ کی توجہ اس مسئلہ کی طرف جائے جس کا اشارہ اس شعر میں اس انداز سے کیا گیا ہے کہ بات آپ کے دل میں اُتر گئی ہے۔ یہ وہ سطح ہے جو شاعر کے ہم عصر انسانوں اور خود شاعر کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔ شعر اس لیے دامن دل کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے کہ اس میں کسی اہم واقعہ، کسی اہم بات، کسی اہم مسئلہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اگر یہ شعر کسی ایسے انسان کو جو اس معاشرے سے تعلق نہیں رکھتا، متاثر نہیں کر رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ شعر میں صرف ایک سطح اور ایک ہی تہ ہے اس لیے یہ شعر اس وقت تک ان لوگوں کے درمیان زندہ رہے گا جب تک اس مخصوص واقعہ کا اثر ان کے دلوں پر قائم رہے گا۔ ایسا شاعر جو روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے اپنے دور میں مقبول ہوگا لیکن جب یہ دور سمٹ جائے گا تو اس کی شاعری بھی اسی کے ساتھ طاقِ نسیاں کی نذر ہو جائے گی۔ بیشمار ایسے شاعر ہیں جو ہمیشہ اپنے زمانے کی ترجمانی کر کے یہ کام کرتے رہے ہیں لیکن ہر بڑے شاعر کے ہاں شعر کی دو سطحیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ سطح جس سے وہ اپنے دور کی ترجمانی کر رہا ہے۔ دوسری وہ سطح جو اس کے عہد سے ماورا ہوتی ہے۔ غالبؔ، میرؔ، اقبالؔ، مولانا روم، حافظ و سعدی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً میرؔ کو لیجیے۔ میرؔ کی شاعری میں جو تیور، جو لہجہ، جو رنگ اور غم و کرب کی جو کیفیت نظر آتی ہے اس کا تعلق اس کے عہد کے اس کرب سے ہے جب مغلیہ تہذیب زوال کی طرف تیزی سے جا رہی تھی۔ عظیم تہذیب کی دیوہیکل عمارت ملبہ بن رہی تھی اور اس دکھ میں سارا معاشرہ مبتلا تھا۔ میرؔ نے اس دور کی زندگی کے دریا سے اس دکھ کو اٹھایا اور اپنی شاعری کی روح میں جذب کر دیا۔ اسی لیے میرؔ اپنے دور کا مقبول شاعر تھا۔ مقبول اس لیے کہ اس نے معاشرے کے باطن میں ہونے والے دکھ درد کو، اس کے کرب اور غموں کو، ان واقعات کے حوالے سے، اس طرح بیان کیا کہ اٹھارویں صدی کی روحِ حیات کی نبض پہ میرؔ کی انگلیاں جم گئیں۔ اس لیے میرؔ اپنے دور کا ترجمان اپنے دور کا نمائندہ شاعر ہے۔ اس کے اشعار میں اٹھارویں صدی کے انسان کے لیے ان واقعات

کی طرف ایسے درد انگیز اشارے موجود تھے کہ میر کا شعر اُس کے دل میں اتر جاتا تھا۔ اگر میر کا شعر صرف اپنے دور کے لیے مخصوص ہوتا تو آج میر کی شاعری کا رنگ کبھی کا اُتر جاتا لیکن میر نے اس کرب کو، اس غم و اندوہ کو آنے والے زمانوں کی روح سے ملا دیا اسی لیے میر کا غم ذاتی ہوتے ہوئے بھی ذاتی نہیں ہے، وقتی ہوتے ہوئے بھی وقتی نہیں ہے۔ میر کے شعر آج بھی ہمیں اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح وہ اپنے دور میں کرتے تھے۔ اسی لیے میر ہر بڑے شاعر کی طرح، دو سطحوں کے شاعر ہیں اور یہ دونوں سطحیں مل کر میر کو بڑا شاعر بناتی ہیں۔ میر اپنے دور کے مقبول ترین شاعر تھے اور آج بھی، جب ان کا زمانہ اور ان کا دور کبھی کا ختم ہو چکا ہے، وہ بڑے اور مقبول شاعر ہیں۔ تو گویا "مسائلِ حیات" ہی شاعری کا خام مواد ہوتے ہیں۔ شاعری کا تانا بانا اسی سے بنتا ہے لیکن شاعر ان مسائل حیات کو کس طرح اور کس انداز سے شاعری میں ڈھالتا ہے دراصل یہ وہ پہلو ہے جس سے شاعری کے درجے مقرر ہوتے ہیں۔

۷ر اگست ۱۹۸۸ء

اَدب اور جمہُوریت

اس موضوع پر اظہارِ خیال کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں کچھ دیر جمہوریت کی مدح میں قصیدہ پڑھوں اور کچھ دیر آمریت کے خلاف اپنے غم و غصہ کا اظہار کروں اور آخر میں فنونِ لطیفہ کے بارے میں کچھ عام سی باتیں خاص انداز میں کر کے آپ سے رخصت ہو جاؤں لیکن میں ایسا کرنے کا کوئی ارادہ اس لیے نہیں رکھتا کہ میں جمہوریت کو ہمیشہ سے ایک بہتر اور فطری نظام سمجھتا ہوں اور آمریت کو ہمیشہ سے غیر انسانی اور جابرانہ نظام سمجھتا ہوں۔ میری رائے آج بھی یہی ہے، گذرے ہوئے کل میں بھی یہی تھی اور آنے والے کل میں بھی یہی ہو گی۔ یہ اندازِ نظر میری فکر، میری ذات، میری شخصیت اور میرے ذہن و دانش کا حصہ ہے اور میری تحریروں اور تصانیف میں بار بار آیا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں براہِ راست اپنے موضوع پر آتا ہوں اور آنے سے پہلے یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ فنونِ لطیفہ میں چوں کہ ادب، شاعری، موسیقی، مصوری اور دوسرے سب فنون شامل ہیں اور مختصر سے وقت میں ان سب پر بات کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے میں اپنی بات کو صرف ادب تک محدود رکھوں گا۔

فرانسیسی مُفکّر، ادیب، ژاں پال سارتر سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک ادب اور سیاست کا کیا رشتہ ہے تو اس نے جواب دیا کہ سیاسی عمل کو ایک ایسی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے جس میں ادب آزادی کے ساتھ آزادی کی فضا میں اظہار کر سکے۔ ادب آزادی کے اظہار کی ایک حقیقی صورت ہے۔ آزادی کی یہی وہ فضا اور آزادی کا یہی وہ تصور ہے جس نے فرانسیسی ادب کو دنیا کے لیے مینارۂ نور بنایا ہے۔ وہاں کا معاشرہ،

وہاں کا فرد خود کو نہ صرف آزاد محسوس کرتا ہے بلکہ آزادی کے ساتھ اپنا اظہار بھی کرتا ہے اور آزادی کا یہی احساس فرد اور معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی رویّوں کا تعین کرتا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہوں گے کہ الجزائر کی جنگِ آزادی کے دوران میں سارتر اور حکومتِ وقت کا طرزِ عمل ایک دوسرے سے بالکل متضاد تھا۔ سارتر الجزائر کی آزادی کا حامی اور ڈی گال کی حکومت اس آزادی کی مخالف تھی۔ سارتر فرانس میں الجزائر کی حمایت کی تحریک میں پیش پیش اور حکومتِ وقت سے مُتصادم تھا۔ اسی کش مکش میں اس گھر پر بم بھی پھینکا گیا اور پولیس نے تجویز پیش کی کہ سارتر کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے۔ جب یہ فائل ڈی گال کے سامنے آیا تو ڈی گال نے کہا کہ میں سارتر کی گرفتاری کے کاغذ پر اس لیے دستخط نہیں کر سکتا کہ یہ بات تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ آیا میں فرانس تھا یا سارتر فرانس تھا؟ اور میں فرانس کو یقیناً گرفتار نہیں کر سکتا۔ اس واقعہ سے اِس اندازِ نظر اور اُس اندازِ نظر سے پیدا ہونے والی فضا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے جس سے ادب و فکر کی روح پروان چڑھتی ہے اور حقیقی جمہوریت کی فضا سے معاشرہ مہک اٹھتا ہے۔ جمہوریت اور ادب دونوں ساتھ ساتھ چلتے اور ایک دوسرے کو مستحکم کرتے ہیں۔ ادب بغیر جمہوریت کے مُرجھایا ہوا پھول ہے اور جمہوریت بغیر ادب کے ایک بنجر ریگ زار ہے۔ جمہوریت صرف کسی ایسی حکومت کا نام نہیں ہے جسے عوام نے منتخب کیا ہو بلکہ یہ ایک طرزِ حیات، ایک اندازِ فکر ہے جس میں دشمن کی بات بھی، مُلک و قوم اور عالمِ انسانیت کے حوالے سے، ٹھنڈے دل سے سُنی جاتی ہے، جس میں ذات کو فنا کر کے اجتماعی روح کو اہمیت دی جاتی ہے، جس میں تعصبات سے بلند ہو کر فیصلے کیے جاتے ہیں جس میں چھوٹی سے چھوٹی رائے کو توجہ اور تحمل سے سُنا جاتا ہے اور صرف اپنی طبقاتی یا علاقائی فکر کو دوسروں پر تھوپنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ ہمارا معاشرہ جو بنیادی طور پر جاگیردارانہ معاشرہ ہے آج تک اسی ذہنیت کا حامل ہے۔ اس معاشرے کا بنیادی رویّہ آج تک وہی جاگیردارانہ رویّہ ہے اور جاگیردارانہ نظام چوں کہ آج کھوٹے سکّے کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے

ہمارے سارے معاشرتی، معاشی اور سیاسی بحران اسی کھوٹے سکے کو مُسلسل چلانے کی ذہنیت اور کوشش سے پیدا ہو رہے ہیں۔ آج کے ادب کو جمہوریت کے فروغ کے لیے جاگیردارانہ نظام، جاگیردارانہ ذہنیت کو موضوع بنا کر اسے جلد سے جلد اپنے انجام کو پہنچانے کے لیے وہ شعور عوام میں پیدا کرنا چاہیے کہ یہ ذہن اور ذہنیت ہمیشہ کے لیے ہمارے معاشرے سے ختم ہو جائے۔ اس نظام نے پاکستانی معاشرے کو کس کس طرح سے خراب کیا ہے اور گذشتہ ۴۲ سال سے کس طرح نئے نئے بحرانوں کو جنم دیا ہے اور کس طرح ہمارے معاشرے کا انسان جبر و استحصال کا شکار رہا ہے اور کس طرح انسانیت اس کے پیروں تلے روندی گئی ہے اور کیسی کیسی دردناک کہانیوں نے جنم لیا ہے۔ ان کو ادب کا موضوع بنا کر نئے شعور کو جنم دینے کی ضرورت ہے تاکہ اس نئے شعور سے پاکستان نئی دنیا کی تعمیر کر سکے۔ یہ وہ شعور ہے جس سے جمہوریت نہ صرف پروان چڑھتی ہے بلکہ فطری طریقے سے مستحکم ہوتی جاتی ہے اور وہ فضا پیدا ہوتی ہے جو ادب کی دین ہے اور جو جمہوریت کی اساس ہے۔ ادب انسان کو تعصبات سے بلند اُٹھاتا ہے۔ اسے اپنی ذات سے بلند کرتا اور جذبۂ ایثار پیدا کرتا ہے، اسے خود غرضیوں کے جال سے نکالتا ہے، اسے جبر و استحصال اور آمریت کے عفریت سے آزاد کراتا ہے۔ اسے مقصدِ حیات کی روشنی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں جو بار بار آمریت کے دورِ نامسعود کا دردہوتا ہے یا اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے تو اس کی بنیادی وجہ وڈیروں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا وہ ٹولہ ہے جو کسی نہ کسی صورت میں بار بار شکلیں بدل کر اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور صرف اپنے مفاد کی حفاظت کے لیے قانون کا محافظ بن جاتا ہے اور غریب عوام بے بسی کے عالم میں مُنھ تکتے رہ جاتے ہیں۔ عوام ہی اصلاً قوت کا سرچشمہ ہیں۔ جمہوریت عوام کو اُبھارتی، اُٹھاتی اور ان کی پرورش کرتی ہے اور ادب عوام کے مسائل، ان کے جذبات و احساسات کا اظہار کرتا ہے اور یہی اظہار معاشرے میں اس شعور کو پیدا کرتا ہے جس سے خود جمہوریت جڑ پکڑتی اور ارتقا کی منزل سے گذرتی ہے۔ ادب کا کام اپنے معاشرے کی جڑوں کو سیراب کرنا ہے، عوام سے اپنا

رشتہ ناتا مضبوط کرتا ہے۔ ادب کے ذریعے قاری تک ان باتوں کو پہنچاتا ہے جن کو اس نے ٹوٹے ٹوٹے انداز میں محسوس تو کیا تھا لیکن پوری طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ اسی احساس سے وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو ادب کا کام اور مقصد ہے اور جو جمہوریت کے لیے تازہ ہوا کا درجہ رکھتا ہے۔ ادب زندگی کا اظہار ہے۔ وہ عہد حاضر کے تعلق سے زندگی کی ان گرہوں کو کھولتا ہے جو معاشرے کی نظروں سے اوجھل تھیں۔ وہ مسائل، محسوسات اور شعور کو تو ابھارتا ہے لیکن تعصبات، تنگ نظری اور خودغرضی کو مٹاتا ہے۔ بڑا ادب وہ ہے جو ذہنِ انسانی کو تبدیل کرے اور اسے عمل کی طرف رجوع کرے۔ آج ہمیں ایسے ہی ادب کو سامنے لانا چاہیے تاکہ ادب عوام اور جمہوریت کی روح کا ترجمان بن جائے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ جمہوری معاشرہ آزادی کی فضا کو برقرار رکھے، ادب، ادیبوں اور ادبی قدروں کو اہمیت دے اور ان کا احترام کرے اور اُس غلامانہ ذہنیت کو ختم کرنے کے لیے عملی اقدام کرے جو دو سو سالہ دورِ غلامی سے ہمیں ذہنی و فکری ورثے اور نظام فکر کے طور پر ملی ہے۔ دورِ غلامی کی اس ذہنیت نے اب تک ملک و قوم اور جمہوریت کو نقصان پہنچایا ہے۔ یہ ذہنیت جہاں جہاں ہمیں نظر آئے اسے جمہوری فکر سے بدلنے اور ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ آج کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ ادیب کو جمہوریت کے ارتقا و استحکام کے لیے اپنے قلم کو وقف کر دینا چاہیے، عوام سے نیا رشتہ قائم کرنا چاہیے۔ انگریزی دور کی غلامانہ ذہنیت سے معاشرے کو نجات دلانے کے لیے قلم اٹھانا چاہیے۔ جاگیردارانہ نظام کو مٹانے کے لیے ادب کو کارزارِ عمل میں لانا چاہیے، علاقائی تعصبات پر مبنی ذہنیت سے نجات حاصل کرنی چاہیے اور سب کے لیے یکساں انصاف کو اپنی فکری اساس بنانا چاہیے۔ نیا شعور اسی انصاف کی کوکھ سے جنم لے گا اور انصاف ہی وہ حقیقی قوت ہے جس پر صحت مند معاشرہ قائم ہوتا ہے اور خواتین و حضرات! یاد رکھیے کہ ناانصافی اُس گیند کی مانند ہے کہ جسے آپ جس قوت سے معاشرے کی دیوار پر ماریں گے وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ ادب، ادیب اور

جمہوریت کے حامیوں کو ناانصافی کے اس عمل میں شریک نہیں ہونا چاہیے اور قلم سے اس کے خلاف جہاد کرنا چاہیے۔ جمہوریت کے ارتقا میں یہی وہ کردار ہے جو ادب و ادیب، عہدِ حاضر کے تعلق سے، ادا کرسکتا ہے اور اسے یہی کرنا چاہیے۔

(۳۱ر اگست ۱۹۸۹ء)

اُردُو نعت گوئی کا تاریخی ارتقاء

"نعت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی تعریف و توصیف کے ہیں لیکن عربی فارسی، اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں لفظ نعت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف، توصیف اور مدح کے لیے مخصوص ہو گیا ہے۔ اب جب بھی ہم نعت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد وہ پارۂ شاعری ہے جس میں سرورِ کونین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات و صفات کی توصیف و مدح کی گئی ہو۔

نعت کے لیے کوئی مخصوص ہیئت مقرر نہیں ہے۔ یہ کسی بھی صنفِ سخن کی ہیئت میں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ صنفِ سخن قصیدہ اور مثنوی بھی ہو سکتی ہے۔ غزل، قطعہ، رباعی یا کوئی اور صنفِ سخن بھی ہو سکتی ہے۔

نعت گوئی کا آغاز سب سے پہلے عربی زبان میں ہوا اور عربی سے اس کا رواج فارسی، اردو اور مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ہوا۔ رسول پاکؐ سے محبت ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔ خود خدا نے قرآن پاک میں بار بار حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف کی ہے۔ یہ توصیف بھی نعت کے ذیل میں آتی ہے۔ مُسلم شریف میں یہ حدیث درج ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی ایمان نہیں لایا جب تک میں اس کے بیٹے، والد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ حبِ رسولؐ جزوِ ایمان ہے اور یہی حبِ رسولؐ نعت گوئی کی بنیاد ہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے نعت گوئی کا رواج شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا اور پھیلتا چلا گیا۔ پہلے نعت گو شاعر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہٗ

تھے۔ اسی سلسلے میں ایک اور نام کعب بن زہیر کا ہے جنھوں نے فتح مکّہ کے بعد اسلام قبول کیا اور حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمتِ اقدس میں نعتیہ قصیدہ پیش کیا۔ عربی نعت گوئی میں ایک بہت اہم اور ممتاز نام ساتویں صدی ہجری کے محمد بن سعید بوصیری کا ہے جن کا قصیدۂ بُردہ ساری دنیائے اسلام میں آج بھی مخصوص محفلوں میں عقیدت و محبّت سے سُنا جاتا ہے اور جس کے سینکڑوں تراجم دُنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ نعت گوئی کا یہ سلسلہ آج بھی عربی شاعری میں جاری ہے۔

عربی نعت کے زیرِ اثر فارسی زبان میں بھی نعت گوئی کا آغاز ہوا۔ فردوسی کے شاہنامہ میں نعتیہ اشعار موجود ہیں۔ ابوسعید ابوالخیر (م ۴۴۰ھ) کی رباعیات میں نعتیہ کلام موجود ہے۔ حکیم سنائی (۵۲۵ھ) کے ہاں بھی نعتیہ کلام ملتا ہے۔ فرید الدین عطّار کے علاوہ نظامی کی مثنویاتِ خمسہ میں نعت گوئی اپنے کمال پر نظر آتی ہے۔ نظامی کی نعتوں میں وہ زورِ کلام موجود ہے کہ آج آٹھ سو سال سے زیادہ عرصہ گذر جانے کے باوجود نظامی کے اشعار دل میں اتر جاتے ہیں۔ مولانا روم کی تو ساری مثنوی نعت کے ذیل میں اس لیے آتی ہے کہ روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اس میں سرائیت کیے ہوئے ہے۔ سعدی شیرازی (۱۲۹۱ء) کی ذاتِ گرامی عشقِ رسول سے سرشار تھی اسی لیے انھوں نے جو کچھ کہا وہ جریدۂ عالم پر ثبت ہو گیا۔ بلغ العلیٰ بکمالہ، کشف الدجیٰ بجمالہ تو آج تک ساری دنیائے اسلام میں سب کی زبان پر رواں ہے۔ امیر خسرو برّ عظیم پاک و ہند کی وہ عظیم اور زندۂ جاوید شخصیت ہیں جن کا نام ہمارے خون کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔ ان کی نعتیں آج بھی محفل حال و قال اور محفل میلاد میں شوق سے سُنی جاتی ہیں۔ ان کا یہ شعر تو ضرب المثل بن گیا ہے:

آفاق ہا گردیدہ ام مہرِ بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام امّا تو چیزے دیگری

اس نعتیہ غزل کو آپ بھی سُنئے:-

اے چہرۂ زیبائے تو رشکِ بتانِ آذری
ہر چند وصفت می کنم در حسنِ زاں زیبا تری

آفاق ہا گردیدہ ام مہر بتاں ورزیدہ ام
بسیار خوباں دیدہ ام اما تو چیزے دیگری

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

تو از پری چابک تری، وز برگ گل نازک تری
از ہر چہ گویم بہتری حقا عجائب دلبری

عالم ہمہ یغمائے تو خلق جہاں شیدائے تو
آں نرگس شہلائے تو آوردہ رسم کافری

خسرو غریب است وگدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

حضرت امیر خسرو کے بعد مولانا جامی، عرفی اور قدسی کے نام نامی آتے ہیں جن کا کلام آج بھی محفل سماع و میلاد میں سُن کر عاشقانِ رسولؐ اشک بار ہو جاتے ہیں۔ حضرت قدسی کی وہ غزل، جس کا مطلع

مرحبا سیدی مکی مدنی العربی
دل و جان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی

آج بھی ہمارے کانوں میں رس گھولتی ہے۔

عربی و فارسی شاعری کی اس عظیم روایت نے اردو نعت گوئی کو بھی شدت سے متاثر کیا اور جب سے اردو شاعری کا آغاز ہوا نعتیہ شاعری کسی نہ کسی صورت میں ہمیں ملتی ہے۔ نعتیہ اشعار حسن شوقی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور قلی قطب شاہ کے ہاں بھی۔ ملّا وجہی اور نصرتی کے ہاں بھی ملتے ہیں اور ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے ہاں بھی۔ گذشتہ چار پانچ سو سال کے عرصے میں لکھے جانے والے معراج نامے، نور نامے، تولد نامے، وفات نامے آج بھی کثیر تعداد میں مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ نعتیہ شاعری سودا و میر درد کے ہاں بھی اپنا رنگ دکھاتی اور دلوں کو گرماتی ہے اور نظیر اکبر آبادی اور غالب کے ہاں بھی۔ لیکن

وہ شعرا جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ نعت گوئی کو اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا ذریعہ بنایا ان میں کرامت علی خان شہیدی (متوفی ۱۲۵۶ھ) کا نام نعت گوئی کی تاریخ میں خاصا اہمیت رکھتا ہے:

تمنّا ہے درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مُقیّد کا
خدا منھ چوم لیتا ہے شہیدی کس محبّت سے
زباں پر میری جس دم نام آتا ہے محمدؐ کا

کم و بیش اسی دور کا ایک اور نام مولوی غلام امام شہید کا ہے۔ شہید سراپا عشق تھے اور انھوں نے مختلف اصناف سخن مثلاً قصیدہ، غزل، مثنوی، خمسہ، ترجیع بند میں صرف اور صرف نعتیہ کلام لکھا۔ جذب و شوق اور قدرتِ اظہار نے ان کی شاعری کو پُر اثر بنا دیا ہے شہید نے میلاد بھی لکھا تھا جو میلادِ شہید کے نام سے آج بھی محفل میلاد میں پڑھا جاتا ہے۔ ان کے یہ دو شعر سُنیے:

بوسے کی تمنّا ہے جو مینائے فلک کو
جھکتا ہے سوئے گنبدِ خضرائے مدینہ
قسمت یہ دکھاتی ہے حسرت کی نظر سے
ہم دیکھتے ہیں اس کو جو دیکھ آئے مدینہ

بحرِ طویل میں شہید نے جو نعتیہ قصیدہ لکھا تھا وہ بھی پڑھنے اور سننے کے لائق ہے:

از مقدم نور خدا، شمس الضحیٰ، بدرالدجیٰ، نجم الہدیٰ، خیر الوریٰ، بحر عطا ابر سخا
کانِ حیا، کوہِ وفا، شانِ علا، شمع بقا، مہرِ ضیا، ماہ صفا، شاہِ زمن۔

حکیم مومن خان مومنؔ (متوفی ۱۸۵۱ء) اردو میں منفرد عشقیہ شاعری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ لیکن انھوں نے نعتیہ شاعری میں جس انداز سے عشقِ رسول کا اظہار کیا ہے وہ بھی منفرد و ممتاز ہے۔ مومن نے کل نو قصیدے لکھے جن میں سے ایک حمد میں ہے، ایک نعت میں اور چار خلفائے راشدین کی مدح میں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مثنوی

ایک تضمین اور کچھ رباعیاں بھی نعت میں لکھی ہیں۔ عشقیہ شاعری کی وہ لے جو مومن کی غزل میں ملتی ہے نعت میں ایک ایسا والہانہ جوش اور گداز بن جاتی ہے کہ پڑھنے والا عشق رسول کی کیفیت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

ویسے تو امیر مینائی کے سارے کلام میں نعتیہ اشعار ملتے ہیں لیکن "محامد خاتم النبیین" ان کا نعتیہ دیوان ہے جو ۱۸۷۲ء میں شائع ہوا۔ امیر مینائی کے نعتیہ کلام میں جذب و کیف اور عقیدت و عشق نے وہ اثر و تاثیر پیدا کیا ہے کہ ان کا کلام سننے والے کی روح میں اتر جاتا ہے۔

نعت گو شعرا میں محسن کاکوروی سب سے الگ حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے ساری عمر صرف اور صرف نعتیہ شاعری کی :

یہ ہے خواہش کروں میں عمر بھر تیری ہی مداحی
نہ اٹھے بوجھ مجھ سے اہلِ دنیا کی خوشامد کا

سوز و گداز، فکر آفرینی اور فنی شعور کے اعتبار سے محسن کاکوروی نعت گوئی میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔ ان کا قصیدۂ لامیہ ایک ایسا سدا بہار تحفہ ہے جسے پڑھ کر مشامِ جاں معطر ہو جاتے ہیں :

نہ کوئی اس کا مشابہ ہے نہ ہمسر نہ نظیر
نہ کوئی اس کا مماثل نہ مقابل نہ بدل

اوجِ رفعت کا قمر نخلِ دو عالم کا ثمر
بحرِ وحدت کا گہر چشمۂ کثرت کا کنول

بحرِ توحید کی ضد اوجِ شرف کا مہِ نو
شمعِ ایجاد کی لو بزمِ رسالت کا کنول

مرجعِ روحِ امیں زیبِ دہِ عرشِ بریں
حامیِ دینِ متیں ناسخِ ادیان و ملل

سب سے اعلیٰ تری سرکار ہے سب سے افضل
میرے ایمانِ مفصّل کا یہی ہے مجمل

ہے تمنا کہ رہے نعت سے تیری خالی
نہ مرا شعر نہ قطعہ نہ قصیدہ نہ غزل

آرزو ہے کہ رہے دھیان ترا تادمِ مرگ
شکل تیری نظر آئے مجھے جب آئے اجل

روح سے میری کہیں پیار سے یوں عزرائیل
کہ مری جان مدینے کو جو چلتی ہے تو چل

محسن کاکوروی کے ہم عصر اور ان کے بعد کے شعراء میں مولانا الطاف حسین حالی بھی خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے نعت کو امتِ مسلمہ کی اصلاح و بیداری کے لیے استعمال کیا یہی وہ لے ہے جو علامہ اقبال کی شاعری میں ایک نئے انداز سے جلوہ گر ہوئی۔ ویسے تو انھوں نے غزل کی ہیئت میں بھی نعت لکھی ہے لیکن مسدس مدو جزر اسلام میں، جو مسدسِ حالی کے نام سے معروف ہے، انھوں نے ولادت سے متعلق جو اشعار لکھے ہیں وہ آج بھی دلوں کو گرماتے اور زبان زد خاص و عام ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

اور اس کے کئی بند تو آپ نے سنے ہوں گے اب یہ نعت بھی سنیئے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

وہ دین، ہوئی بزم جہاں جس سے چراغاں
اب اس کی مجالس میں نہ بتی نہ دیا ہے

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے

جو دین کہ ہمدرد بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے
فریاد ہے اے کشتی امت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے
کر حق سے دعا اُمتِ مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے
امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دلدادہ ترا اک سے ایک ان میں پڑا ہے

اس دور کے دوسرے نعت گو شعرا میں یوں تو بہت سے نام ہیں لیکن شاہ نیاز بریلوی (متوفی ۱۸۳۴ء) بیدم شاہ وارثی اور احمد رضا خان بریلوی (متوفی ۱۹۲۱ء) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ شاہ نیاز کا کلام کیفیتِ عشق میں ڈوبا ہوا ہے۔ بیدم وارثی عشق مجسم بن کر سامنے آتے ہیں اور حضرت احمد رضا خان بریلوی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات وصفات اور حیات وسیرت کو کیفیتِ عشق سے ملا کر ایک نیا رنگ عطا کرتے ہیں۔ ان کا دیوان "حدائقِ بخشش" تین حصوں میں شائع ہو کر عشاقِ رسولؐ کے دلوں میں شمع محبت وعقیدت روشن کر چکا ہے۔ ان کا سلام جس کا مطلع یہ ہے:

مصطفٰے جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام
شمع بزمِ رسالت پہ لاکھوں سلام

آج بھی ہر خاص و عام کی زبان پر ہے۔

علامہ اقبالؔ کا سارا کلام مدحتِ رسولؐ کا موثر اظہار ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں دینِ اسلام کی روح کو اس طرح نعت کا رنگ دیا ہے کہ خود اقبالؔ ملتِ اسلامیہ کی نشاۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ بالِ جبریل کی یہ غزل سنیے جس میں سوز و گداز بھی ہے جو نعت کی جان ہے اور حیاتِ نو کی وہ آرزو بھی جس سے علامہ اقبالؔ کی ساری شاعری عبارت ہے:

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب میرا سجود بھی حجاب
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب

یہ تعارف نامکمل رہ جائے گا اگر مولانا ظفر علی خان کا ذکر نہ کیا جائے۔ مولانا کے ہاں نعت گوئی میں موضوعات کا تنوع بھی ہے اور اسالیب کی وسعت بھی۔ ان کی نعتیں محفلوں میں عام طور پر محبوبیت کے ساتھ سُنی جاتی ہیں۔ ان کے کلام میں عشقِ رسولؐ سے پیدا ہونے والی کیفیت روح کو اس طرح گرما دیتی ہے کہ عشقِ رسولؐ، نعت سننے والے کا جزوِ احساس بن جاتا ہے:

ان کی یہ نعت، سنیے:

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تم ہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تم ہی تو ہو
پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اوّلیں کا اجالا تم ہی تو ہو
سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تم ہی تو ہو

جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گذر گیا

اے رہ نورد جادۂ اسریٰ تم ہی تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے

اے تاج دار یثرب و بطحا تم ہی تو ہو

اس دور میں اور اس کے بعد جن دوسرے شعرا نے نعت گوئی میں نام پایا ان میں امجد حیدر آبادی، اکبر وارثی میرٹھی، سہیل اقبال، حفیظ جالندھری، بہزاد لکھنوی، احمد سہارنپوری اور ماہر القادری کے نام نمایاں اور ممتاز ہیں۔ امجد حیدر آبادی شاعری کی آواز کو رہنما کی آواز جانتے ہیں جس سے خدا کی آواز آتی ہے۔ اثر و تاثیر ان کے کلام کا جوہر ہے۔ اکبر وارثی میرٹھی نے سیرت محمدؐ کو معاشرے کے عام فرد تک نہایت پُراثر انداز میں پہنچایا ہے۔ یا نبیؐ سلام علیک، یا رسولؐ سلام علیک، ان کا وہ سلام ہے جو آج بھی گھر گھر پڑھا جاتا ہے۔ "میلا دِ اکبر" ان کی وہ مقبولِ زمانہ تصنیف ہے جو ہزاروں بار شائع ہو چکی ہے۔ حفیظ جالندھری انھیں کے شاگرد تھے جنھوں نے شاہنامۂ اسلام چار جلدوں میں لکھ کر حقِ شاعری ادا کیا ہے۔ شاہنامۂ اسلام نعتیہ ادب میں ایک ممتاز و منفرد درجہ رکھتا ہے۔ حفیظ جالندھری کی یہ تصنیف تاریخ بھی ہے اور سیرت بھی۔ اس میں جذبۂ ایمانی کا درس بھی ہے اور اصلاحِ احوال کی تلقین بھی۔

بہزاد لکھنوی کی نعتوں میں جذبۂ عشق کا والہانہ پن دلوں میں اتر جاتا ہے۔ احمد سہارنپوری کی عشقیہ شاعری اپنی سادگی و پرکاری کی وجہ سے دلوں کو متاثر کرتی ہے۔ ماہر القادری کا کلام بھی عشقِ رسولؐ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ان کے ہاں محبت و عقیدت کے حدود ہیں۔ اسی لیے ان کا کلام عشق کے جذبے کا پُراثر اظہار ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ نعت گوئی کی مقبولیت ہمارے دور میں مسلسل بڑھ رہی ہے۔ اب عام طور پر جلسوں اور تقریبوں میں تلاوت کلام پاک کے بعد نعت رسول مقبولؐ پیش کی جاتی ہے۔ سرکاری سطح پر بھی نعت گوئی کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن سے نعتیہ مشاعرے اور کلام نشر کیے جاتے ہیں۔ آج کی نعتیہ شاعری میں حالی اور اقبال کی لے بھی

شامل ہے اور محسن کاکوروی اور احمد رضا خان بریلوی کی عشقیہ سرشاری بھی۔ جدید نعت میں موضوع و ہیئت کا تنوع بھی قابلِ ذکر ہے۔ نعت گو شعراء کی ایک طویل فہرست ہے جن میں حفیظ تائب بھی شامل ہیں اور مظفر وارثی بھی۔ محشر رسول نگری بھی اور احمد ندیم قاسمی بھی۔ ان کے علاوہ یوسف ظفر، منور بدایونی، عبدالعزیز خالد، حنیف اسعدی، صبا اکبرآبادی، عارف عبدالمتین، حافظ لدھیانوی، طفیل ہوشیارپوری، انجم رومانی، نصرت قریشی، عاصی کرنالی، شیر افضل جعفری، ناصر زیدی، یزدانی جالندھری، ذوقی مظفر نگری، اقبال عظیم، صمد انصاری، رشید الزمان خلش اور جعفر بلوچ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

یہ فہرست یقیناً ادھوری اور نامکمل ہے۔ اس میں بہت سے نام شامل کیے جاسکتے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نعت گوئی کے فن اور تاریخ کا وسعت اور گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔

نعت گوئی کا یہ ذوق نئی نسل کے شعراء میں بھی پروان چڑھ رہا ہے اور اسی لیے میرے خیال میں نعت گوئی کا مستقبل روشن ہے۔

(۲۹ اکتوبر ۱۹۸۷ء)

ہائیکو کے بارے میں

ہائیکو کے مزاج کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ چند بنیادی باتیں جاپانی تہذیب کے بارے میں بھی سمجھ لی جائیں۔ جاپان کا مذہب شنتو مذہب ہے۔ شنتو کے معنی ہیں دیوتاؤں کا راستہ۔ یہ مذہب صدیوں کی معاشرت اور تاریخی عوامل کے نتیجے میں رفتہ رفتہ پرورش پاکر جاپانی معاشرے کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ مذہب جاپانی معاشرے تک محدود ہے اور اس کے ساتھ مخصوص ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے جاپانی معاشرہ عاقبت یا حیات بعد الممات پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کے لیے یہی دنیا سب کچھ ہے۔ یہی آغاز ہے اور یہی انجام ہے۔ اس معاشرے میں تعلیم کی سو فی صد شرح کے ساتھ ذات پات کا مخصوص نظام بھی قائم ہے۔ اپنے مذہب، معاشرت اور تہذیب پر ہر جاپانی فخر کرتا ہے اور اسی لیے اپنی قوم سے حد درجہ پرستہ ہے۔ اس کے لیے دنیا میں دو قسم کے انسان بستے ہیں۔ ایک جاپانی اور دوسرا غیر جاپانی۔ یہ معاشرہ سمورائی تصورات پر قائم ہے۔ شنتو دیوتاؤں کا راستہ ہے اور شہنشاہ "تن نو" ہے جس کے معنی ہیں آسمان کا شہنشاہ۔ شہنشاہیت پر جاپانی معاشرے کی نظریاتی بنیادیں قائم ہیں۔ سمورائی تصورات میں شرم، بہادری اور نیک نامی معاشرتی و تہذیبی اقدار کا درجہ رکھتے ہیں۔ "بن بو" بھی اس میں شامل ہے۔ بن حصولِ علم ہے اور بو فنِ حرب ہے، تلوار جس کی علامت ہے۔ یہ وہ تصورات ہیں جن میں عالم گیر اخوت، آفاقیت، اخلاقی یا روحانی اقدار کا کوئی تصور نہیں ہے اور اسی لیے ان کے ہاں کوئی بڑا مفکر جیسے گوتم بدھ یا کنفیوشس پیدا نہیں ہوئے اور نہ ان کے ہاں مولانا رومی، گوئٹے، غالب، اقبال یا ٹیگور جیسے شاعر پیدا ہو سکے۔ انھیں اثرات کی وجہ سے فکر و فلسفہ یا مابعد الطبیعیاتی تصورات جاپانیوں کے

مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے اور اسی لیے ان کی شاعری بھی کسی گہری فکر، کسی گہرے فلسفے یا تصورات کا اظہار نہیں کرتی۔ انہی تہذیبی اثرات نے ان کے مزاج کی تشکیل کی ہے جس کا اظہار نہ صرف "ہائیکو" میں ہوتا ہے بلکہ ان کی دوسری اصنافِ سخن میں بھی ہوتا ہے اور اسی لیے ہائیکو شاعری ویسی ہے جیسی وہ ہمیں نظر آتی ہے یعنی عام زندگی کے عام تجربوں کا دلچسپ اظہار۔ اس پس منظر کے ساتھ اب ہم ہائیکو کی طرف آتے ہیں۔

ہائیکو جاپانی شاعری کی وہ مقبول صنفِ سخن ہے جو ہیئت کے اعتبار سے علی الترتیب ۵۔۷۔۵ تہجی رکنوں (Syllables) کے تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے اور موضوع کے اعتبار سے ان تجربات، مشاہدات اور خیالات کا اظہار کرتی ہے جن سے عام زندگی کا ایک نیا پہلو، کسی خیال کا نیا رُخ اور کسی بات کی نئی جہت سامنے آتی ہے۔ عام تجربے کے اسی نئے پن کی وجہ سے ہائیکو پڑھ کر یا سُن کر استعجاب کے ساتھ لطف و مسرت حاصل ہوتے ہیں۔ اختصار ہائیکو کا حُسن ہے۔ کنایہ اس کا جوہر ہے اور اظہار کی جامعیت اس کا فن ہے۔ اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ جاپانی شاعری میں آج سے تقریباً سو سال پہلے ہائیکو الگ صنفِ سخن کی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ اُس طویل نظم کا ابتدائی حصّہ تھی جسے جاپانی شاعری میں "ہائی کائی" کہتے ہیں اور اسی لیے اسے "ہوک کو" کہا جاتا تھا یعنی ہائی کائی کا ابتدائی حصّہ۔ اس ابتدائی حصّے کی یہ اہمیت تھی کہ اس سے طویل نظم کا مزاج اور اس کی جہت متعین ہو جاتی تھی۔ جیسے عربی شاعری میں غزل قصیدے کی تشبیب کا حصّہ تھی اور بعد میں ایک الگ صنفِ سخن بن گئی اسی طرح ہائیکو بھی انیسویں صدی کے اواخر میں ماساکا شیکی (۱۸۶۷ء-۱۹۰۲ء) کے زیرِ اثر، ۱۸۹۰ء میں، ہائی کائی سے الگ ہو کر ایک علیحدہ صنفِ سخن کے طور پر اُبھری اور تیزی سے مقبول ہو گئی۔ اس صنفِ سخن کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جب ۱۹۳۰ء میں جاپان اور چین کے درمیان جنگ چھڑی تو حکومتِ وقت نے اپیل کی کہ ہائیکو شعرا اپنی شاعری سے جنگ کی حمایت اور حکومت کی مدد کریں۔ بہت سے شعرا نے حکومت کا ساتھ دیا لیکن کیوسو یونیورسٹی ہائیکو ایسوسی ایشن کے بہت سے شعرا نے تعاون نہیں کیا تو بارہ شاعر گرفتار کر کے جیل بھیج دیے گئے۔ ابھی

صورت ۱۹۴۱ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران پیش آئی جب ۱۳ ہائیکو شاعر گرفتار ہوئے۔

پاکستان کے ہائیکو شعرا کو میرا خیال ہے ابھی خوف زدہ ہونے کی اس لیے ضرورت نہیں ہے کہ ابھی تو ہمارے ہاں اس کی ہیئت کا مسئلہ بھی طے نہیں ہوا ہے اور ابھی یہ صنف سخن پورے طور پر ہماری صنف سخن بھی نہیں بن پائی ہے۔ اس وقت تو میں صرف اتنی بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ جیسے غزل اردو کی مقبول صنف سخن ہے اسی طرح ہائیکو جاپانی شاعری کی مقبول صنف سخن ہے اور گذشتہ سو سال میں اس صنف نے مختلف مغربی اثرات مثلاً رومانیت، فطرت پسندی، اشاریت اور پرولتاریت وغیرہ کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی ہے ۱۹۴۷ء میں جدید ہائیکو انجمن کے شعرا نے معاصر زندگی کے تجربوں سے ہائیکو کو ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی۔ ہے۔ ان شعرا نے موسم سے متعلق موضوعات کو ترک کر کے نظم آزاد کے اثرات کو ہائیکو میں شامل کیا لیکن یہ تین مصرعے جدید زندگی کی پیچیدگیوں کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔

جاپانی نقادوں کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ ہائیکو نظم کسی بھی زبان میں لکھی جا سکتی ہے لیکن وہ اسی وقت ہائیکو کہلائے گی جب ہیئت و موضوع کی اس روایت کو سامنے رکھا جائے جسے جاپانی شاعر سامنے رکھتے ہیں۔ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ زندگی کے بھرپور گہرے تجربے، ہائیکو کی ہیئت کی وجہ سے، بیان نہیں کیے جا سکتے۔ یہ صنف سخن زندگی کے چھوٹے چھوٹے تجربوں کے اظہار تک محدود رہے گی اور یہی اس کا دائرہ ہے اور اسی دائرے میں ہائیکو شاعر اپنی کامیابی کا علم بلند کر سکتا ہے۔ ہمارے شاعر دو مصرعوں میں زندگی کے بڑے تجربوں، وسیع احساس اور گہرے جذبوں کا ہمیشہ سے اظہار کرتے رہے ہیں اس لیے زندگی کے عام اور ننھے منے اچھوتے تجربوں کو وہ آسانی کے ساتھ ہائیکو کے تین مصرعوں میں بیان کر سکتے ہیں۔ پھر اردو زبان میں قافیوں کی بھی کوئی کمی نہیں ہے اور تہجی رکن (Syllables) ہماری وزن و بحور والی شاعری سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ اسی لیے ہائیکو کی ہیئت کے سلسلے میں ہمیں سوچ سمجھ کر پہلے سے طے کرنا ہوگا کہ کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے؟۔ بہر حال اردو شعرا کے لیے ہائیکو میں شاعری کرنا آسان بھی ہے اور مشکل

بھی۔ آسان اس لیے کہ جو بات سامنے آئے اسے تین مصرعوں میں بیان کر دیا جائے۔ مشکل اس لیے کہ ہائیکو کے لیے ضروری ہے کہ اس میں تجربے کی تازگی ہو اور شاعر دنیا کو ایک ذرا مختلف انداز سے دیکھ رہا ہو۔

ہائیکو کی تکنیک کے سلسلے میں، میں خاص طور پر اپنے شعرا کی توجہ ایک پہلو کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ ہائیکو جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں تین مصرعوں پر مشتمل ایک مختصر نظم ہے۔ اگر ہمارے شعرا ان تین مصرعوں کو دو حصّوں میں واضح طور پر تقسیم کریں۔ پہلے حصّے میں کہی جانے والی بات ذہن کو ایک سمت میں لے جائے اور دوسرا حصّہ اسے بظاہر دوسری طرف لے جائے تاکہ تخیّلی فاصلہ دونوں حصّوں میں باقی رہے لیکن جب تینوں مصرعے ایک ساتھ پڑھے جائیں تو ان کے اتصال سے ایک ایسا نیا پہلو سامنے آئے جس سے پڑھنے والا واقف تو تھا لیکن اس نے اس بات کو اس انداز سے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ دونوں حصّوں کے موضوعات بظاہر الگ الگ ہوں لیکن تخیّلی سطح پر ان میں ربط موجود ہو — دونوں حصّوں میں تخیّلی فاصلہ نہ اتنا زیادہ ہو کہ بات مبہم ہو جائے اور نہ اتنا واضح کہ بات سپاٹ ہو جائے اور لطفِ سخن جاتا رہے۔ ایک حصّے سے ایک امیج ابھرے اور دوسرے سے دوسری امیج ابھرے اور دونوں تخیّل کی سطح پر اس طرح مربوط و پیوستہ ہوں کہ ایک حصّے سے دوسرے حصّے کی تفہیم پیدا ہو۔ پہلا حصّہ دوسرے کی اور دوسرا حصّہ پہلے کی اہمیت بڑھائے۔ اردو شعرا اپنی ہائیکو میں صنائع بدائع کا بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ یہ ان کی میراث ہے۔ موسم کے ذکر سے ایک طرف جاپانی ہائیکو کی روایت سے رشتہ جوڑا جا سکتا ہے اور شعر میں کیفیت و اثر کو پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ویسے بھی موسم ہمارے مشاہدے کا حصّہ ہیں اور ہمارے شاعروں نے ہمیشہ بہار و خزاں کو زندگی کا اشارہ بنایا ہے۔ ہجائی رکن (Syllable) انگریزی و فرانسیسی کی طرح، اردو زبان کی ساخت کا حصّہ نہیں ہے لیکن ہمارے شعرا مختلف بحور کے رکن کو توڑ کر ہائیکو میں استعمال کر سکتے ہیں۔

میں نے اردو ہائیکو کے وہ تینوں مجموعے پڑھے ہیں جو جاپان ثقافتی مرکز نے شائع کیے ہیں اور جن میں طبع زاد و ترجمہ شدہ ہائیکو شامل ہیں۔ ان سب میں ایک بات تو یہ مشترک ہے کہ

یہ جاپانی ہائیکو کی طرح تین مصرعوں پر مشتمل ہیں۔ بعض شاعروں نے پہلے اور تیسرے مصرع میں قافیے کا التزام کیا ہے۔ بعض نے تینوں مصرعوں کو قافیے سے آزاد رکھا ہے۔ اکثر شعرا کے ہاں دوسرا مصرع پہلے مصرع سے بڑا ہے۔ بعض کے ہاں تینوں مصرعے مختلف لمبائی کے ہیں۔ بعض کے ہاں پہلا مصرع لمبا ہے اور دوسرا چھوٹا اور تیسرا درمیانی ہے۔ کہیں تینوں مصرعے برابر ہیں۔ یہ صورت ترجمے والی ہائیکو میں بھی ملتی ہے اور طبع زاد میں بھی۔ طبع زاد ہائیکو میں اکثر شعرا نے پہلے اور تیسرے مصرع میں قافیے کا اہتمام کیا ہے۔ ان مجموعوں کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سوائے تین مصرعوں کے اردو ہائیکو میں ہیئت کی سطح پر کوئی چیز مشترک نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہائیکو شعرا مل کر اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کریں اور اس کی ہیئت کو کوئی ایسی صورت دینے کی کوشش کریں جس سے ہائیکو کا مزید کامیاب تجربہ اردو شاعری میں کیا جاسکے۔ جہاں تک موضوعات کا تعلق ہے تو اس میں ہر موضوع آسکتا ہے لیکن بنیادی طور پر ہائیکو کسی بڑے موضوع کے اظہار کا ذریعہ نہیں بن سکتی البتہ عام تجربے کے کسی نئے پہلو، نئے رُخ اور نئی جہت کا اظہار کامیابی سے کرسکتی ہے۔ تین مصرعوں کو دو ٹکڑوں میں بانٹنے کا عمل مشہور انگریزی شاعر ایزرا پاؤنڈ نے بھی کیا تھا اور کامیاب و پر اثر ہائیکو لکھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو ہائیکو کی ہیئت متعین کرنے کے لیے شعرا کا ایک اجلاس بلایا جائے جس میں تبادلۂ خیال کرکے خصوصیت سے اس کی ہیئت اور مسائل پر بحث کی جائے۔ اب تک ہمارے ہاں ہائیکو کے نام سے جو کچھ لکھا جارہا ہے وہ ہائیکو سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ ہائیکو نہیں ہے۔

۸ر نومبر ۱۹۸۷ء

فنِ تدوین

فنِ تدوین ایک ایسا موضوع ہے جس پر ہمارے ہاں بہت کم لکھا گیا ہے اور اب تک اس کے اصول و ضوابط اس طور پر مدوّن نہیں ہو سکے کہ سب یکساں طور پر ان اصولوں پر عمل کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ املا، رموزِ اوقاف اور اصطلاحاتِ تراجم کی طرح یہ مسئلہ بھی قومی سطح پر ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ معذرت کے ساتھ یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ہم بحیثیت قوم مسائل کو سلجھانے کے بجائے الجھانے کا کام زیادہ تن دہی اور دِل لگا کر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خود قومی زبان کا مسئلہ بھی آج تک ہم نے وجہ بے وجہ اُلجھا رکھا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان بین الاقوامی اور بڑی زبان نہیں ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ انگریزی زبان نہیں سیکھنی چاہیے۔ مسئلہ تو صرف اتنا سا ہے کہ قومی زبان کو دفتری زبان اور ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہونا چاہیے تاکہ اظہارِ مدعا کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے اور ہم دفتر اور بیرونِ دفتر اپنی بات ہر سطح پر پہنچانے کی اہلیت کو دوبارہ حاصل کر سکیں۔ حاکم و محکوم کی درجہ بندی ختم ہو جائے۔ ہماری تخلیقی صلاحیتیں، قومی زندگی کی ہر سطح پر پروان چڑھنے لگیں اور ہم قومی یک جہتی کی منزل کی طرف گامزن ہو سکیں۔

لفظ تدوین عربی زبان کا لفظ ہے جو فارسی و اردو میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تدوین کے معنی فارسی زبان میں "جمع نمودن و تالیف کردن" (منتخب اللغات مُلّا عبدالرشید) کے ہیں اور اردو زبان کی "نور اللغات" میں بھی اس کے معنی "جمع کرنا۔ مرتب کرنا" دیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں اس کے لیے "ایڈیٹنگ" کا لفظ استعمال

ہوتا ہے جس کے معنی ہیں کسی دوسرے کے کام کا طباعت کے لیے ایڈیشن تیار کرنا۔ یہ تو اس لفظ کے لغوی معنی تھے لیکن اب تدوین ایک ایسا فن بن گیا ہے جس میں بہت سی اور باتیں بھی شامل ہوگئی ہیں اور اس کا دائرۂ کار وسیع ہوگیا ہے۔ ہم فن تدوین کو تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

۱۔ نئی کتابیں یا تحریریں جب اشاعت کے لیے کسی ناشر یا مدیر کے پاس آتی ہیں تو وہ انھیں پڑھ کر یا پڑھوا کر اُن کے املا کو ٹھیک کراتا ہے۔ ان کے رموزِ اوقاف کو درست کراتا ہے۔ حسبِ ضرورت پیراگراف گھٹاتا یا بڑھاتا ہے۔ زبان و بیان کو صحیح و بہتر بناتا ہے۔ تکرار یا اعادہ کو دُور کرتا ہے اور اسے اس صورت میں لے آتا ہے کہ قاری اسے آسانی کے ساتھ بغیر کسی اُلجھن کے پڑھ سکے۔ یہ فنِ تدوین ہے جس پر صاحبِ علم ایڈیٹر یا اچھا ناشر عمل کرتا ہے اور اس کام کے لیے فنِ تدوین کے ماہروں کی خدمات حاصل کرتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے اشاعتی اداروں سے ایسے ماہرِ فن عام طور پر وابستہ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں یا رسائل و جرائد میں وہ پھوہڑپن نہیں پایا جاتا جو ہماری مطبوعات میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ ایک ہی صفحہ پر ایک ہی لفظ کا املا دو طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔ مواد کی تکرار صفحات کو سیاہ کر دیتی ہے۔ ترتیب و ربط نہ ہونے کی وجہ سے تحریر سے وہ اثر پیدا نہیں ہوتا جو ہونا چاہیئے۔ اچھی تدوین تصنیف کے حُسن کو نکھار دیتی ہے۔

۲۔ اہم اور کلاسیکی مطبوعہ کتابوں کا نیا ایڈیشن تیار کرنا تاکہ ایک طرف اس کتاب کا ایسا ایڈیشن تیار ہو جائے جو نہ صرف مستند ہو بلکہ مختلف ایڈیشنوں میں جو اختلاف پائے جاتے ہیں وہ بھی سامنے آجائیں۔ ساتھ ساتھ اس کے متن کی وضاحت کے لیے حواشی بھی دیے جائیں تاکہ قاری زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کر کے کتاب سے مستفید ہو سکے۔ ان حواشی کے ذیل میں وضاحت، اختلاف، نقطۂ نظر کی تشریح، املا، رموزِ اوقاف، پیراگراف، فرہنگ وغیرہ سب آجاتے ہیں مثلاً ڈاکٹر وحید قریشی

کی مدون کتاب الطاف حسین حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" اسی ذیل میں آتے ہیں۔ "کلیاتِ سودا" مرتبہ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی یا "کلیاتِ جرأت" مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ایسی کتاب کو مرتب کرتے وقت صرف پہلے ایڈیشن اور مطبوعہ نسخوں کو ہی سامنے نہیں رکھا جاتا بلکہ مصنف کے زمانے یا قریب تر زمانے یا معتبر قلمی نسخوں کو بھی پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ یہاں بھی تدوین کا مقصد وہی ہے جس کا ذکر میں نمبر ایک کے ذیل میں کر چکا ہوں کہ کسی دوسرے مصنف کی کتاب کو اس طور پر مدون کر کے پیش کرنا تاکہ قاری مستند متن کے ساتھ کتاب سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔

۳۔ تدوین کی تیسری قسم میں اُن مخطوطات کی تدوین آتی ہے جو پہلی بار شائع کرنے کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔ یہاں بھی وہی عمل ہوتا ہے جو مطبوعہ کتابوں کی تدوین میں ہوتا ہے لیکن یہ کام زیادہ دشوار ہوتا ہے۔ اعلیٰ معیار کی تدوین کے لیے سب سے پہلے اُن سارے نسخوں کو دیکھا اور جمع کیا جاتا ہے جو موجود و معلوم ہیں۔ پھر مصنف کے اپنے ہاتھ کے نسخے کو یا ایسے نسخے کو جو مصنف کی نظر سے گذر چکا ہو یا مصنف کے قریبی دور کے نسخے کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی نقل تیار کی جاتی ہے پھر اس کا مقابلہ دوسرے نسخوں سے کر کے تعلیقات و اختلافِ نسخ تیار کیا جاتا ہے۔ حواشی لکھے جاتے ہیں۔ مصنف اور اس کے دور کا تعین کیا جاتا ہے اور وہ ساری ضروری معلومات فراہم کی جاتی ہیں جو اس مخطوطے کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کریں اور قاری اس تصنیف سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکے۔ یہاں مُرتب املا کو بھی خاص طور پر دیکھتا ہے۔ کتابت کی غلطیوں کی بھی نشان دہی کر کے درست کرتا ہے۔ متن میں جو الفاظ رہ گئے ہیں اگر نسخہ صرف ایک ہی ہے، تو انھیں بھی پورا کرتا ہے۔ اشعار یا حوالوں کے لیے متعدد کتابوں سے رجوع کرتا ہے۔ تعینِ زمانہ کے لیے کتبِ تواریخ و سیر کو کھنگالتا ہے۔ اگر کسی مخطوطے کا ایک ہی نسخہ موجود و معلوم ہو تو مُرتب تعلیقات و اختلافِ نسخ کی دیدہ ریزی سے تو ضرور بچ جاتا ہے لیکن اس کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ باتیں میں نے ایک سانس میں ضرور کہہ دی ہیں لیکن ان میں سے ہر پہلو کے ایسے پیچیدہ مسائل ہیں جن پر

تفصیل کے ساتھ بہت کچھ کہا جانا چاہیے۔ اس نوع کے مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں "دستورالفصاحت" از حکیم سید احمد علی خان یکتا کی تصنیف کا ذکر کیا جا سکتا ہے جسے امتیاز علی خان عرشی نے مرتب کیا ہے۔ حکیم قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعۂ نغز" مرتبہ حافظ محمود خان شیرانی یا تذکرۂ مخزنِ نکات از قائم چاندپوری مرتبہ ڈاکٹر اقتدا حسن کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اردو زبان کی پہلی معلوم تصنیف "مثنوی کدم راؤ پدم راؤ" کا ذکر میں یہاں اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اسے میں نے خود مرتب کیا ہے۔ مخطوطات کی تدوین کے سلسلے میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور مخطوطات کو مرتب کرنے کے فن کے کیا اصول ہیں یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر ایک الگ مقالے کی ضرورت ہے۔

فن تدوین کے بنیادی اصول تو کم و بیش یکساں ہیں لیکن نظم اور نثر کی کتابوں/مخطوطات پر ان اصولوں کا اطلاق مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ تدوین اور تحقیق کا بھی چولی دامن کا ساتھ ہے تدوین بغیر تحقیق کے ممکن نہیں ہے۔ تدوین کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف صاحبِ علم ہو بلکہ متعلقہ علوم کی مختلف شاخوں پر بھی اچھی نظر رکھتا ہو۔ وہ ادب کی مختلف اصناف اور ان کی تاریخ سے بھی واقف ہو۔ لسانیات و قواعدِ زبان پر بھی نظر رکھتا ہو۔ اس دور کی تاریخ پر بھی عبور رکھتا ہو جس دور کے مخطوطے پر وہ کام کر رہا ہے اور وہ اس دور کے دوسرے مصنفوں سے بھی پوری طرح آگاہ ہو۔ قدیم و جدید املا، تذکیر و تانیث، متروک و مروج الفاظ سے بھی باخبر ہو۔ وہ یہ بھی جانتا ہو کہ وہ کس نوع کے قارئین کے لیے یہ کام کر رہا ہے اور ان کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اسے قدیم دور کے ساتھ ساتھ جدید دور کے تقاضوں کا بھی پورا اندازہ ہونا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ پیراگراف کی کیا اہمیت ہے اور وہ کب اور کہاں قائم کیا جاتا ہے۔ کہاں اعراب لگانے کی ضرورت ہے۔ کہاں اوقاف کا استعمال کیا جانا چاہیے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ حوالے کیسے دیے جاتے ہیں۔ دوسروں کی تصانیف کے اقتباسات کو کیسے واوین میں لکھنا چاہیے۔ مختصر اقتباس اور طویل اقتباسات

کے حوالوں کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر اقتباس میں بیچ سے کوئی جملہ یا الفاظ چھوڑے ہیں تو نقطے لگا کر اسے کس طور پر واضح کرنا چاہیے۔ ذہنی دیانت داری اور معروضی اندازِ نظر، کام کے معیار کے لیے بنیادی شرط کا درجہ رکھتے ہیں۔ بیان کا ایجاز و اختصار بھی اس لیے ضروری ہے کہ اس سے تحریر صاف و شفاف اور ابلاغ اعلیٰ سطح پر آجاتا ہے۔

یہی صورت حال پی ایچ ڈی اور ایم فل کے مقالات کی ہے جو بغیر یکساں اصول کے مدون کیے جاتے ہیں اور اکثر مواد کا ایسا ڈھیر بن کر رہ جاتے ہیں جس پر تدوین کرنے والا کھڑا ہے اور تدوین کے اس بنیادی اصول کو رد کر رہا ہے جس کا بنیادی مقصد مسودہ کو قاری و طباعت کے لیے تیار کرنا ہے۔ ان مقالات کے لیے بھی اصول و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت ہے تاکہ سب یکساں طور پر، ان کی افادیت کے پیش نظر، ان پر عمل کریں۔ اس طرف بھی اہل علم اور اساتذہ کو فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

۲۴ جون ۱۹۸۶ء

مشاعرے کی روایت

مُشاعرے کی صدارت خاصا مشکل کام ہے۔ مشکل اس لیے کہ صدر کو ایک مخصوص جگہ پر بندھ کر بیٹھنا پڑتا ہے اور اُس وقت تک بیٹھنا پڑتا ہے جب تک مُشاعرہ اختتام کو نہ پہنچ جائے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ کہ منتظمینِ جلسہ صدرِ گرامی قدر کو مسند پر بٹھا کر ایسے بھول جاتے ہیں کہ نہ صرف خاطر تواضع سے بلکہ مہمان نوازی کی رسمِ دُنیا سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ یہ تو صدارت کا ایک پہلو ہوا۔ اب دوسرا پہلو بھی ملاحظہ فرمائیے۔ صدرِ گرامی قدر کو بے کم و کاست، ہر شعر توجہ سے سُننا پڑتا ہے اور جب شاعرِ عزیز اپنے جگر پارے کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ترنم یا بے ترنم پیش کرتا ہے تو لحاظ کی آنکھ جہاز پہ بھاری کے مصداق دل کھول کر داد بھی دینی پڑتی ہے۔

بہر حال یہ تو جنابِ صدر کا مسئلہ ہے جہاں تک مُشاعرے کا تعلق ہے، مشاعرہ ایک ایسا تہذیبی ادارہ ہے جو صدیوں سے قائم ہے اور آج بھی، جب کہ رنگِ دُنیا بدل گیا ہے، یہ اُسی طرح قائم و دائم ہے۔ مُشاعرے ہماری تہذیبی، ذہنی اور سماجی زندگی کا اہم حصّہ ہیں۔ یہ روایت اتنی قدیم ہے کہ اگر میں اس کی تاریخ اختصار کے ساتھ بھی بیان کرنا شروع کردوں تو خود اُردو ادب کی تاریخ کے چھے سو سال سامنے آجائیں گے جس میں حسن شوقی، قلی قطب شاہ اور ولی دکنی سے لے کر سراج الدین علی خاں آرزو، آبرو، ناجی، شاہ حاتم، خواجہ میر درد، میر تقی میر اور مرزا رفیع سودا تک اور مصحفی، انشاء اور جرأت، ناسخ و آتش و دبیر سے لے کر غالب و ذوق، مولانا حالی اور محمد حسین آزاد تک سب شامل ہوں گے اور پھر بات یہیں تو ختم نہیں ہو جائے گی۔ اقبال سے لے کر آج تک اس روایت

کی داستان سُنائی ہوگی۔ ایسی داستان جو دل چسپ بھی ہو اور دل آویز بھی جس میں روایت کے سارے گوشے سامنے آجائیں۔ یہ موضوع اتنا وسیع ہے اور اپنے اندر ایسے دل چسپ پہلو رکھتا ہے کہ جتنا اس پر سوچتا ہوں اُتنا ہی مورّخ کا ذہن زمانۂ حال سے ماضی کی طرف سفر کرنے لگتا ہے جہاں میٹھے تیل کے چراغ کی لَو سے راستہ صاف اور روشن نظر آرہا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ میں اسے بیان کروں، لیکن پھر سوچتا ہوں کہ یہ بات بذاتِ خود مُشاعرے کی روایت کے مُنافی ہوگی کہ مُشاعرے میں کسی موضوع پر لیکچر دیا جائے، اس لیے میں مُشاعرے کے تعلق سے صرف اتنا کہوں گا کہ اچھے اشعار ہمارے جذبات کی اس طور پر ترجمانی کرتے ہیں کہ شعر سُن کر زندگی کا بوجھ ہلکا اور ذہن ایسا تازہ دم ہوجاتا ہے جیسے ہم نے ابھی ابھی غُسل کیا ہو۔ اچھا شعر ہمارے ذہن کو نہلا دُھلا کر پھُول کی طرح تازہ کر دیتا ہے یہ کیفیت ہر دوسری کیفیت سے الگ ہے۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت مُعاشرے کے باطن میں کیا ہو رہا ہے تو آپ کسی مُشاعرے میں اشعار سُن کر دیکھ لیجیے اور اگر یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت اہلِ مُعاشرہ کس کیفیت سے دوچار ہیں، ہوائیں کس رُخ پر چل رہی ہیں تو کسی مُشاعرے میں یہ دیکھ لیجیے کہ سُننے والے کس قسم کے اشعار پر داد دے رہے ہیں۔ مُشاعرہ مُرغِ بادنُما کا درجہ رکھتا ہے جس سے مُعاشرے کے باطن کی ہواؤں کے رُخ کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ پھر مُشاعرے ایک ایسی ذہنی تفریح کا درجہ رکھتے ہیں جس میں ذہن کو پورے طور پر استعمال کرنا پڑتا ہے ورنہ عام طور پر جدید تفریحات میں دماغ کا استعمال کم سے کم تر ہوگیا ہے، مثلاً آپ سب ہر روز ٹیلی ویژن دیکھتے ہیں، مگر کبھی آپ نے غور کیا کہ اس میں دماغ کو استعمال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ بس آنکھوں سے دیکھتے رہیئے، کانوں سے سُنتے رہیئے، باقی کام خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ مُشاعرے میں آپ کو نہ صرف دماغ سے بلکہ اپنے سارے وجود کے ساتھ شریک ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر آپ مُشاعرے سے لُطف اندوز نہیں ہو سکتے اور اسی لیے مُشاعرے میں اچھے اشعار سُن کر آپ کی ذہنی صحت بہتر ہوجاتی ہے۔ پھر مُشاعروں میں اکثر ایسے دل چسپ واقعات بھی پیش آتے ہیں، جو ساری عُمر کے لیے آپ کے حافظے میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔ مجھے یاد آیا اور آپ بھی اس

واقعے سے لُطف اندوز ہوں گے کہ لڑکیوں کے کسی کالج میں ایک مُشاعرہ ہوا۔ اور ایک اُستاذالاساتذہ قسم کے شاعر نے بڑے دم خم کے ساتھ اپنی غزل کا یہ مطلع پڑھا ؂

ہمارے دل کی حسرت تجھ سے گو اے نازنیں نکلی
مگر جیسی نکلنی چاہیئے ویسی نہیں نکلی!

اُستاد کو اس شعر پر خاصی داد ملی۔ داد کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک طالبہ کھڑی ہوئی اور استاذالاساتذہ سے نہایت شیریں آواز اور نیاز مندانہ لہجے میں مخاطب ہو کر کہا "محترم و معظم! مطلع خُوب ہے بلکہ بہت خُوب ہے، لیکن یہ تو بتائیے کہ اس میں بے چاری نازنین کا کیا قصور تھا؟" یہ جُملہ سُننا تھا کہ سارا پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ وہ تو غنیمت جانئے کہ آزادئ نسواں کی تحریک کا زمانہ نہیں تھا ورنہ اگر یہ شعر آج پڑھا جاتا اور خواتین کی سمجھ میں کہیں اس طالبہ کی طرح یہ آجاتا کہ اس نازنین پر شاعر نے کتنا ظلم ڈھایا ہے تو وہ اس خیالی نازنین کی حمایت میں جلوس نکالتیں اور مردوں کے خلاف ایسے نعرے بلند کرتیں کہ آسمان کا اپنی جگہ ٹھہرنا مُشکل ہو جاتا۔ بہر حال اچھا زمانہ تھا، خیریت سے گذر گیا۔

مجھے یاد آیا کہ ۱۹۴۵ء میں میرٹھ میں ایک انتہائی عظیم الشان مُشاعرہ ہوا۔ میں اُس وقت انٹر کا طالبِ علم تھا۔ اتنا بڑا مُشاعرہ میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں دیکھا۔ برِ عظیم کے کم و بیش سارے نامور شاعر شریک تھے سوائے حفیظ جالندھری کے کہ وہ ہندوستانی سپاہیوں میں مردانگی پیدا کر کے روزی کما رہے تھے اور انا پرست یگانہ چنگیزی نے یہ کہہ کر آنے سے انکار کر دیا تھا کہ میں جگر سے بڑا شاعر ہوں مُجھے جگر سے زیادہ مُعاوضہ ملنا چاہیئے۔ مُشاعرہ دو دن چلا۔ اس میں جوش بھی شریک تھے اور جگر بھی۔ جب حضرت جوش کی باری آئی تو رات کی سیاہی صُبح کی سفیدی سے ملنے پر مائل ہو رہی تھی۔ جوش نے رُباعیاں سُنانی شروع کیں۔ وہ ایک رُباعی سُناتے، پھر ایک پان کھاتے، اُگالدان میں پیک کرتے اور پھر ایک رُباعی سُناتے۔ اس طرح اُنھوں نے دس بارہ رُباعیاں سُنائیں اور پھر کہا کہ بس اب ختم۔ لوگوں نے اصرار کیا، اُنھوں نے پھر پان کھایا، اُگالدان میں پیک کی اور پھر ایک رُباعی سُنادی۔ دو چار رُباعیاں اسی طرح سُنا کر اُنھوں نے کہا "بس اب بہت

ہو چکا ۔“ کچھ دیر پنڈال میں خاموشی رہی ۔ اسی اثنا میں پیچھے کی صفوں سے ایک پہلوان نما گھوسی، کندھے پر بنیان ڈالے، کھڑا ہوا اور باآوازِ بلند کہا (حضرت جوشؔ کا جثّہ ذہن میں رکھیے)” پہلوان! ایک اور ہو گی، ٹھوک کے ۔“ اِس جُملے کا سُننا تھا کہ پنڈال قہقہوں سے گونج اُٹھا اور انہی قہقہوں میں مُشاعرہ ختم ہو گیا۔

جوشؔ کی بات چلی ہے اور وہ اب مرحُوم بھی ہو گئے ہیں تو ایک بات اور سُن لیجیے۔
جوشؔ صاحب نے مجھے، مولانا اعجاز الحق قدّوسی اور پیر حسام الدین راشدی کو گھر پر بُلایا۔ ہم پہنچے تو وہ مُنتظر تھے، کہیں باہر سے آئے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم میں سے کسی نے کہا کہ حضرت! اپنی وہ تازہ نظم ”بول اِک تارے جھن جھن جھن“ سُنا دیجیے۔ جوشؔ صاحب نے آواز دی ”ذرا بیگ بھیج دو“۔ اندر سے جواب میں آواز آئی ”ابھی تو چیخ کر آ رہے ہو۔ اب پھر شروع کر دیا“۔ یہ اُن کی بیگم تھیں۔

اب رات خاصی بھیگ چلی ہے اور شاعرانِ کرام اور آپ سب حضرات شاعرانہ کیفیت میں اس درجہ سرشار ہیں کہ اب میرا مزید کچھ کہنا مصلحتِ وقت کے خلاف ہے۔ آپ کو متوجّہ کرنے اور شاعرانہ کیفیت سے دوچار کرنے کا کام میں نے خطبۂ صدارت سے اُسی طرح کر دیا ہے جس طرح شیکسپیئر اپنے ڈرامے کے پہلے ایکٹ کے پہلے سین میں کرتا تھا۔ اب میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ اس محفلِ شعر و سخن میں شریک ہونے کے لیے کمربستہ ہو جائیں جس کے لیے آپ یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ سب شعر کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ مُشاعرے کے آداب اور اس کی روایت سے واقف ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ سب نہ صرف مہمان نواز ہیں بلکہ شاعر دل سے محبّت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ جب ایسی محفل ہو تو خُطبۂ صدارت کو یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ اور دیکھیے جیسے ہی یہ بات میں نے آپ سے کہی غالبؔ کا شعر ذہن کے دریچوں سے جھانکنے لگا۔ آپ بھی سن لیجیے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی ۔ گُفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

جنوری ۱۹۸۷ء

بچّوں کا ادب

بچوں کے ادب کے سلسلے میں بات کرنے سے پہلے ایک بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ والدین عام طور پر اپنے بچوں کی پرورش اپنی خاندانی روایت، اپنے مزاج، اپنے خیالات و عقائد کے مطابق کرتے ہیں۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے مسلمان ہوتا ہے اور ہندو کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ اسی لیے ہندو ہوتا ہے۔ آخر یہ کیوں نہیں ہوتا کہ ہندو کے گھر پیدا ہونے والا بچہ مسلمان بن جائے؟ جیسے یہ ایک حقیقت ہے اسی طرح ہمارے ہاں بچوں کے ادب کا مسئلہ بھی اسی بات کا ایک پہلو ہے۔ اس صورت حال میں یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بچے کو ایسی کتابیں پڑھنے کے لیے مہیا کریں جن سے ہمارے خیالات و عقائد کے مطابق اس کے ذہن کی نشو و نما ہو سکے۔ کچی عمر میں جب ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جو بحیثیت والدین ہمارے خیالات و عقائد کی نفی کرتی ہیں تو ہم دراصل اس عمل سے اسی شاخ کو کاٹ رہے ہوتے ہیں جس پر ہم کھڑے ہیں۔ سارے معاشرے پر نظر ڈالیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابیں مہیا کرتے ہیں جن سے ہم اسے وہ نہیں بنا پاتے جو دراصل اسے بنانا چاہتے ہیں۔ وہ کتابیں عمدہ کاغذ پر رنگ برنگی تصویروں کے ساتھ اچھی جلی عبارت میں لکھی ہوئی ہر عمر کے بچوں کے لیے بازار میں عام طور پر دستیاب ہوتی ہیں۔ اگر بچہ کتاب نہ بھی پڑھے تو وہ صرف تصویروں سے لطف اندوز ہو کر کتاب سے مانوس ہو جاتا ہے۔ یہ کتابیں ہم اچھی قیمت دے کر خریدتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہمارے مصنفوں کی کتابیں نہایت خراب کاغذ پر، بغیر یا بے رنگ تصویروں کے ساتھ جب بازار میں نظر آتی ہیں تو انھیں والدین نہیں خریدتے اور یہ کتابیں بیرونی کتابوں

کے مقابلے میں اسی لیے کم فروخت ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں بچوں کے باقاعدہ مصنف خال خال نظر آتے ہیں، جب کہ بیرونی زبانوں میں بچوں کے مصنفین الگ ہوتے ہیں جو بچوں کی نفسیات پر، اپنی قوم کی تاریخ و مزاج پر اور عہدِ جدید کے تقاضوں سے اس طرح واقف ہوتے ہیں کہ ان کی کتابیں بچوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ انھیں اپنی زبان پر پورا عبور حاصل ہوتا ہے۔ وہ عبارت میں کسی قسم کی غلطی نہیں کرتے اور ہر عمر کے بچوں کے ذخیرۂ الفاظ کو سامنے رکھ کر اسی انداز سے کتابیں لکھتے ہیں۔ ہمارے یہاں مصنفین عام طور پر باہر کی کتابوں کا چربہ اتارتے ہیں اور چربہ بھی اس انداز سے کہ اس میں نہ لطفِ بیان ہوتا ہے نہ لطفِ قصہ۔ یہ میں عام طور پر بازار میں ملنے والی کتابوں کی بات کر رہا ہوں، چند مخصوص کتابوں کی نہیں۔ ان کتابوں کا جو عام طور پر لکھی جا رہی ہیں ہماری تہذیب سے، ہماری تاریخ سے، ہمارے ورثے سے کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا جیسا کہ ایک زمانے میں مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو ہو جاتا تھا اسی طرح ہمارے یہاں ناکام ادیب بچوں کا ادیب بن جاتا ہے۔ میں نے اسی نقطۂ نظر سے بچوں کی متعدد کتابیں پڑھی ہیں اور مجھے اکثر محسوس ہوا ہے کہ عام طور پر تیسرے درجے کے لکھنے والے ایسی کتابیں تصنیف کر رہے ہیں جن سے بچوں کی پیدائشی ذہانت مجروح ہوتی ہے اور بچوں کی فطری صلاحیتیں نشو و نما نہیں پاتیں اور بڑے سوال تو کیا چھوٹے سوال بھی ان کے ذہن میں پیدا نہیں ہو پاتے۔

بچوں کے ادب کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ بچوں میں تخیّل، تجسّس اور تحیّر کو ابھارے۔ یہ وہ بنیادی صفات ہیں جن پر ہمارے لکھنے والوں کو توجہ دینی چاہیے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ وہ ایسی عبارت میں اپنی بات بیان کریں جو کم سے کم لفظوں میں آئینے کی طرح صاف و شفاف ہو۔ جس میں زبان درست ہو، بیان چست اور دل چسپ ہو۔ ایسی کہانیاں لکھی جائیں جن کا اپنی تہذیب، اپنے لوک ورثے، اپنی روایت، اپنی تاریخ سے گہرا تعلق ہو۔ ایسی کہانیاں جو بچوں کے تخیّل کو نئی دنیاؤں کی طرف لے جائیں۔ ایسی دنیائیں جن کو دریافت کرنے کی طرف ان میں مہم جوئی کا جذبہ پیدا ہو۔ غور

کیجیے تو آج کی نسل ہماری اپنی روایت سے بڑی حد تک کٹ چکی ہے۔ ہمارے قدیم ادب سے وہ ناواقف ہے۔ باہر کی زبانوں کے ادیب اپنے قدیم ادب کو طرح طرح سے بچوں کے لیے پیش کرتے ہیں جن سے ان میں اپنے ادب، اپنی تہذیب سے گہری دل چسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً آج بھی اگر بچوں کے مصنّفین اپنے قدیم ادب کو کھنگالیں تو انھیں بہت سی کتابوں کے لیے مواد میسر آئے گا۔ ایسا مواد جس سے بچے گہری دلچسپی لیں گے۔ مثلاً انوارِ سہیلی، اخلاقِ محسنی، سیاست نامہ، الف لیلیٰ اور ان سب سے زیادہ طلسمِ ہوشربا میں ایسا مواد موجود ہے جس کے استعمال سے بچوں کے تخیل، تجسّس اور تحیّر کو نئی وسعتیں دی جا سکتی ہیں، جس سے ہم بچوں میں اپنے ادب و تہذیب سے گہری دل چسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ کتنے مصنّفین ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے سفرنامے لکھے ہیں؟ کتنے مصنّفین ہیں جنھوں نے جانوروں کے مشاہدات پر قلم اٹھایا ہے یا کائنات کی پُراسرار وسعت کو موضوع بنایا ہے یا مہم جوئی کو مثبت انداز میں موضوع بنا کر پیش کیا ہے؟ کتنے مصنّفین ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے علامتی کردار تخلیق کیے ہیں؟۔

ایسی بے شمار باتیں ہیں جو اس سلسلے میں کہی جا سکتی ہیں۔ اس وقت میں اس موضوع پر تفصیل سے کچھ نہیں کہنا چاہتا البتہ یہ ضرور کہوں گا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہمارے بہترین لکھنے والے محنت کے ساتھ بچوں کے لیے لکھیں۔ وہ بچے جو ہمارے ہیں اور جو ہمارا مستقبل ہیں اور جو اس ملکِ عزیز کو وہ بنائیں گے جو ہم اُنھیں بنا رہے ہیں۔ اس طرح ناشروں کو چاہیے کہ وہ ہر عمر کے بچوں کے لیے کتابیں لکھوائیں اور اُنھیں اس طور سے شائع کریں کہ بچے ان کی طرف متوجہ ہوں۔ اُنھیں شوق سے پڑھیں۔ بچوں کو اتنی بڑی تعداد میں کتابیں پڑھنے کے لیے چاہییں کہ اگر ہم سب مل کر لکھنے کا پروگرام بنائیں تو بھی ان کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ بچہ بہت تیزی سے کتابیں پڑھتا ہے۔ ایک کتاب عام طور پر دو چار دن میں پڑھ ڈالتا ہے اور پھر نئی کتاب کا طلب گار ہوتا ہے۔ اس کی ضرورت پوری کرنا ہمارا قومی و اخلاقی فرض ہے۔

اس وقت جو عام طور پر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ لوگ کتابیں نہیں پڑھتے

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بچپن سے اپنے بچوں کو کتابیں پڑھنے کی عادت نہیں ڈالتے۔ انھیں ضرورت کے مطابق کتابیں مہیا نہیں کرتے۔ ان میں کتابیں پڑھنے کا ذوق پیدا نہیں کرتے اور جب عمر نکل جاتی ہے تو ہم بچوں کی عاداتِ مطالعہ پر مذاکروں کا اہتمام کرتے ہیں۔ اس لیے اس وقت لکھنے والوں سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ محنت سے، توجہ سے بچوں کے لیے کتابیں لکھیں۔ بچوں کے لیے کتابیں لکھنا بڑوں کے لیے کتابیں لکھنے سے کم مشکل نہیں ہے اور ساتھ ہی ناشروں سے میری یہ درخواست ہے کہ وہ بچّوں کی کتابیں بہت محنت و توجہ سے چھاپیں۔ اس میں منافع بھی ہے اور کارِ خیر کا عمل بھی۔ یہ ایک ایسا کام ہے جسے بغیر کسی تاخیر کے اب ہمیں فوراً شروع کرنا چاہیے۔ ایسی کتابیں ہر گز شائع نہ کریں جس سے معاشرے میں چور اچکّوں، ڈاکوؤں، ظالموں، جابروں اور نفسیاتی مریضوں کا اضافہ ہو، جن سے ہماری اخلاقی قدریں برباد ہوں اور جن سے ہمارے بچّے خراب ہوں۔

۲۱ر مئی ۱۹۸۴ء

جدید افسانے کے بارے میں

اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو افسانے پر پیغمبری وقت آپڑا ہے۔
وہ افسانہ نگار جنھوں نے تیسری، چوتھی یا پانچویں دہائی میں لکھنا شروع کیا تھا اب اپنے عروج پر پہنچ کر یا تو نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں یا پھر اب خود کو دہرا رہے ہیں۔ نئے لکھنے والے، جو ادب کی دنیا میں چھٹی یا ساتویں دہائی میں داخل ہوئے، اُنھیں علامتی افسانوں کا بھیڑیا اُٹھالے گیا۔ ان کے افسانوں میں نہ علامت نے روشنی کی اور نہ تحریر کے حُسن نے اثر پیدا کیا۔ یہ ایک تجربہ تھا جو ہوا اور ادب میں تجربہ ہونا چاہیے اور ہوتے رہنا چاہیے۔ لیکن یہ تجربہ، تجربہ کی منزل سے آگے بڑھ کر تخلیقِ فن کی سرحدوں تک نہ پہنچ سکا۔ چند افسانوں کے علاوہ، عام طور پر علامتی افسانے تخلیقی سطح پر کم زور اظہار اور علامت نگاری کی ناکامی کی داستان سُناتے ہیں۔ بعض افسانہ نگاروں نے افسانے کو نثری نظم بنانے کی کوشش کی لیکن افسانہ نہ تو شاعری ہے اور نہ نظم ہے۔ اس لیے افسانہ اپنے منصب سے ہٹ گیا۔ ہم گذشتہ دس سال میں کسی علامتی افسانہ نگار کی کسی ایک کہانی کا نام نہیں لے سکتے جسے ہم ادب کا شاہکار کہہ سکیں اور تاریخِ ادب اسے اپنے دامن میں سمیٹ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے کہا ہے کہ اردو افسانے پر پیغمبری وقت آپڑا ہے۔ ابلاغ ہر ادبی تحریر کی فنی ضرورت ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جیسا ہمیں منٹو کی کہانیوں میں ملتا ہے یا عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور غلام عباس کے ہاں ملتا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے زندگی آپ کے خون میں اُتر کر گردش کرنے لگتی ہے۔ ایک ابلاغ وہ ہے جو علامتی ہونے کے باوجود اپنے قاری کو گرفت میں لے لیتا ہے جیسا انتظار حسین کے افسانے "شہرِ افسوس" میں یا "آخری آدمی" میں جو

غور کرنے سے قاری تک پہنچ جاتا ہے لیکن یہاں بھی نثر کا حسن اور اظہار کی تخلیقی قوت بنیادی طور پر اپنا کام کرتی ہے۔ تیسری قسم ابلاغ کی وہ ہے کہ افسانہ نگار افسانے کو علامتی بنانے کے لیے اس میں ابہام کو اس طور پر شعوری طور سے شامل کرتا ہے کہ افسانہ پڑھنے والے سے، اُس کے اچھے ادبی ذوق کے باوجود، ابلاغ نہیں کرتا۔ کافکا کے افسانوں کو غور سے پڑھنے سے ایک اچھے قاری کو ابلاغ کی دولت ہاتھ آجاتی ہے اور اس کے افسانوں کی نثر تخلیق کی سطح پر پُر اثر اور بامعنی رہتی ہے۔ ایک ایک لفظ نپا تلا۔ ایک ایک جملہ اپنی جگہ جما ہوا۔ یہ سلیقہ ہمیں جدید اُردو افسانہ نگاروں میں کم کم نظر آتا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کے افسانوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُردو نثر کی روایت اور اس کے مزاج سے کم وبیش بے خبر ہیں۔ انھیں اظہار پر اس لیے قدرت حاصل نہیں ہے کہ انھیں اپنی بات اس زبان میں، جس میں وہ لکھ رہے ہیں، کہنے کی نہ مشق ہے اور نہ وہ مطالعہ جو اچھی تحریر کے لیے ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں کو اچھی نثر لکھنے، اس کی مشق کرنے اور اُردو ادب کی کلاسیکی اور جدید تحریروں کو تسلسل کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ لیکن گذشتہ چند سال سے ہمارے بعض لکھنے والوں میں اس کا احساس پیدا ہوا ہے اور اب افسانہ علامت سے ہٹ کر زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ رہا ہے۔ اب علامت ہمارے جدید افسانے کا ماضی ہے اور زندگی سے تعلق نوافسانے کا نیا رجحان ہے۔

آخر میں نئے افسانہ نگاروں سے ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں۔ کراچی شہر پاکستان کا سب سے بڑا اور ایک جدید صنعتی شہر ہے۔ جدید صنعتی شہر کے سارے مسائل و مصائب اس شہر کے خون میں گردش کر رہے ہیں۔ اس کے چپے چپے پر کہانیاں بکھری پڑی ہیں۔ وہ کہانیاں جن میں انسانی مسائل اپنے گہرے دکھوں کے ساتھ موجود ہیں۔ وہ محبتیں جو بے آواز ہیں۔ وہ نفرتیں جو خون آلود ہیں۔ وہ تعصبات جو بظاہر ناقابلِ عبور ہیں۔ وہ سڑکیں جن پر دھوپ ہی دھوپ ہے اور وہ گلیاں جن میں کبھی سورج کی کرن نہیں پہنچی۔ وہ شفاخانے جہاں موت کا کرب کروٹیں لے رہا ہے۔ وہ معاشرہ جو رشوتوں پر پل رہا ہے۔ وہ عوام جو بے آواز ہیں، وہ جاگیردار اور سرمایہ دار جو عوام کو کھا رہے ہیں۔ سیاست کا

سوانگ رچانے والے وہ بے اخلاق لوگ جو نفرتوں کے گرم خون پر پل رہے ہیں اور نفرتوں کے سانپوں کا زہر نئی نسل کے خون میں شامل کر رہے ہیں۔ وہ مفاد پرست جو عوام کو بے شعور اور نابینا رکھنے میں مصروف ہیں۔ وہ صاحبانِ اختیار جو تاریخ کو نظر انداز کر کے صرف اپنے لیے زندہ ہیں۔ وہ سفاک مافیا جو انسانی قدروں کا خونی ہے۔ یہ شہر جدید صنعتی زندگی کی حقیقی کہانیوں کا شہر ہے۔ آپ اس شہر کو دیکھیے۔ یہ یہ آپ کی کہانیوں کا منتظر ہے۔ اس عمل سے آپ نیا افسانہ پیدا کریں گے۔

(۲۸ر اپریل ۱۹۸۷ء)

عزیز احمد ـــ ایک جائزہ

۱۹۷۸ء ادیبوں پر بہت بھاری گذرا۔ بہت سے نام ور ادیب دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے جدا ہو گئے۔ ابتدا پروفیسر محمد حسن عسکری کی وفات سے ہوئی تھی ـــ یہ جنوری کا مہینہ تھا، اور اس کا ڈراپ سین پروفیسر عزیز احمد کی وفات پر ہوا ـــ یہ دسمبر ۱۹۷۸ء کا مہینہ تھا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ عزیز احمد کی وفات کی خبر کراچی کے صرف ایک اخبار میں چھپی اور وہ بھی اتنی مختصر تھی کہ یقین نہیں آتا کہ یہ اُس شخص کی وفات کی خبر ہو سکتی ہے جس نے تقریباً چالیس سال، نہایت سنجیدگی کے ساتھ، ادب و علم کی خدمت میں گذارے اور اپنی سدا بہار تخلیقات و تصنیفات سے زبان و ادب کو مالا مال کیا اور اردو ادب کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ادبیات کی سطح پر لانے کے لیے وہ کام کیا جو تاریخ میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ عزیز احمد اردو کے اُن چند ادیبوں میں سے ایک تھے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے اور جن کی تحریریں دُنیا بھر کے علمی حلقوں میں وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔

خواتین و حضرات! یہ تعلقاتِ عامہ اور اشتہار بازی کا دور ہے۔ اشتہار کے سہارے جس طرح صنعت کار اپنی گھٹیا مصنوعات بھی بازار میں فروخت کر سکتا ہے اور خریدنے والا اشتہار کے جادو کے اثر سے، اُسے اعلیٰ اور مثالی چیز سمجھتا ہے، اسی طرح ادب و فن میں بھی اب اشتہار بازی نے اچھے اور بُرے، اعلیٰ و ادنیٰ، حقیقی و غیر حقیقی، اصلی اور نقلی کا امتیاز مٹا دیا ہے۔ میں نے کئی لکھنے والوں کو کہتے سنا ہے کہ صاحب مرنے کے بعد ہماری تحریروں کا کیا ہوگا۔ اس سے ہمیں کیا واسطہ۔ ہمیں تو اس سے مطلب ہے کہ ہماری زندگی میں ہمارے لکھے ہوئے الفاظ کیسے بکتے ہیں! یہ وہ دکان دارانہ ذہنیت ہے جس نے تخلیق اور علم و ادب کو اس کے

منصب سے ہٹا دیا ہے۔ اسی لیے آج ہمارا ادب اخباروں کے صفحات پر "تخلیق" ہو رہا ہے۔ جس میں بھی کوئی بُرائی نہیں تھی اگر لکھنے والا نامی دوکان دار بن کر صرف بکری بڑھانے کی ذہنیت کا شکار نہ ہوتا۔ اسی لیے آج کی کہر آلود فضا میں ادیب، دانشور، عالم اور بظاہر ادیب، بظاہر دانشور اور بظاہر عالم میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا۔ ایذرا پاؤنڈ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "غیر سنجیدہ فن کار کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ سنجیدہ و غیر سنجیدہ فن کار میں تمیز نہ ہونے دے۔" اسی ذہنی منظر نے سنجیدہ و حقیقی فن کار عزیز احمد کی عظمت کو ہماری نظروں سے اوجھل رکھا اور جیسا کہ فتح محمد ملک صاحب نے بتایا ہے کہ ایک سابق پروفیسر اور حال بیورو کریٹ نے زعم کرسی میں آکر یہ کہہ دیا کہ وہ "جاہل آدمی" تھے۔ فتح محمد ملک نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ عزیز احمد کی معرکۃ الآرا تصنیف "اقبال ـــ ایک نئی تشکیل" کو ایم۔ اے کے نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ یہ وہ ذہنیت ہے جس نے ہمارے معاشرے کی تہذیبی، فکری اور تخلیقی فضا کو زہر آلود کر رکھا ہے۔ سنجیدہ فن کار قدر شناسی سے اسی طرح بے نیاز ہوتا ہے جس طرح عزیز احمد تھے۔ عزیز احمد نے کبھی نام و نمود یا اشتہار بازی کے ذریعے شہرت بٹورنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ایک سنجیدہ فن کار کی طرح ہمیشہ کام کو اہمیت دی اور جب تک زندہ رہے کام اور صرف کام کرتے رہے۔ میرے اور عزیز احمد کے تعلقات کی تاریخ بائیس تیئیس سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس تمام عرصے میں میں نے انھیں اپنے بارے میں کبھی ڈُون کی لیتے نہیں دیکھا۔ اگر کبھی اُن کے فن یا ذات کے بارے میں کوئی گفتگو میں کرتا تو اُن کے چہرے پر نئی نویلی دُلہن کی طرح حیا کی سُرخی دوڑ جاتی۔ ان میں ایک سچے فن کار اور بڑے ادیب کا ایسا انکسار تھا جو اس دور میں خال خال نظر آتا ہے۔

عزیز احمد ۱۱ر نومبر ۱۹۱۳ء کو بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ سے اور ۱۹۳۸ء میں لندن یونیورسٹی سے بی۔ اے آنرز کیا اور اسی سال جامعہ عثمانیہ میں انگریزی کے لیکچرر مقرر ہوئے جہاں ترقی کر کے کچھ عرصے کے بعد ریڈر اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں عزیز احمد پاکستان آ گئے اور حکومت پاکستان کے فلم و مطبوعات کے محکمے کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس محکمے سے وہ ۱۹۵۷ء تک وابستہ رہے۔ ۱۹۵۷ء میں وہ لندن

یونیورسٹی کے اورینٹل اور افریقن اسٹڈیز کے اسکول میں اردو اور ہندی اسلام کے شعبے میں لیکچرر مقرر ہوئے جہاں وہ ۱۹۶۲ء تک رہے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ ایسوسی ایٹ پروفیسر ہو کر ٹورانٹو یونیورسٹی (کناڈا) کے شعبۂ اسلامیات سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں انھیں پروفیسر بنا دیا گیا جس پر وہ تا مرگ فائز رہے۔ وہاں اُن کے کام کی اہمیت و وقعت کے پیش نظر انھیں رائل سوسائٹی آف کناڈا کا فیلو مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۲ء میں یونیورسٹی آف لندن نے ان کی خدمات کے اعتراف میں ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازا۔ عزیز احمد پہلے پاکستانی تھے جنھیں یہ اعزاز ملے۔ یہ اعزاز عزیز احمد کے لیے ہی باعثِ فخر نہیں تھا بلکہ خود پاکستان کے لیے بھی باعثِ افتخار تھا لیکن کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے اور کتنے لوگ ہیں جو علم و ادب کے اس مرتبے پر پہنچے ہیں اور اپنی تصانیف سے ہمارے ادب و ذہن پر گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

عزیز احمد کئی زبانیں جانتے تھے۔ فرانسیسی اور جرمنی کے علاوہ انگریزی ان کے لیے علمی اظہار کی زبان تھی، فارسی ان کی تہذیبی زبان تھی اور اُردو اُن کی تخلیقی زبان تھی۔ ان سب زبانوں پر وہ بہت اچھی قدرت رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۵۹ء میں وہ لندن سے ادیبوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے فرینکفرٹ آئے تھے اور میں پاکستان سے گیا تھا۔ اس کانفرنس میں شرکت کے لیے ہندوستان سے حکومتِ ہند کے نائب صدر اور مشہور فلسفی رادھا کرشنن آئے تھے۔ شام کو ایک دعوت میں، جو صدر جرمنی کی طرف سے ہمارے مندوبین کو دی گئی تھی، مسٹر رادھا کرشنن ایک نہایت حسین نوجوان ایرانی لڑکی سے بہت دیر سے اور بہت گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی مسرت دیدنی تھی۔ اس شمعِ محفل کو اور بہت سے پروانوں نے بھی گھیر رکھا تھا۔ وہ فارسی اور فرانسیسی جانتی تھی۔ عزیز احمد صاحب نے فارسی میں اس کا نام پوچھا۔ اس نے منیزہ بتایا۔ میں نے نام سن کر فردوسی کا مصرع پڑھا۔ ؎ :

منیزہ منم دُختِ افراسیاب

وہ ہنسنے لگی۔ اس کے فوراً بعد عزیز احمد پہلے فارسی میں اور پھر فرانسیسی میں اُس سے بڑی روانی سے باتیں کرتے رہے اور وہ باتیں اتنی دل چسپ تھیں کہ کچھ ہی دیر بعد عزیز احمد شمع

بن گئے اور وہ پروانہ۔ اُس دن عزیز احمد نے بے شمار فارسی اشعار سُنائے۔ خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مجھے تو صرف یہ بتانا ہے کہ مرحوم کو جتنی زبانیں آتی تھیں ان پر انھیں مکمل قدرت تھی۔

عزیز احمد کی شخصیت اتنی گوناگوں ہے کہ اس کے تعارف کے لیے ایک طویل مقالے کی ہی نہیں بلکہ پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ عزیز احمد نے اپنی قلم کاری کا آغاز فکشن اور تراجم سے کیا۔ ان کے دو ناول "ہوس" اور "مرمر اور خون" ۱۹۴۳ء تک شائع ہو چکے تھے۔ اسی سال انھوں نے ابسن کے ڈرامے "گریٹ بلڈر" کا "معمارِ اعظم" کے نام سے ترجمہ کیا اور ایک منظوم ڈرامہ "عمر خیام" بھی لکھا۔ ارسطو کی "بوطیقا" اور دانتے کی Divine Comedy کا ترجمہ "طربیۂ خداوندی" کے نام سے کیا۔ ۱۹۴۴ء میں انھوں نے اپنا تیسرا ناول "گریز" لکھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا جس کا ہیرو نعیم آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کر کے تربیت کے لیے لندن جاتا ہے۔ یہ کردار جب بین الاقوامی پس منظر میں زندگی گذارتا ہے تو کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ یہی اس ناول کا موضوع ہے۔ نعیم کے کردار میں اس دور کے نوجوانوں کے تمام رجحانات و میلانات کی ترجمانی ملتی ہے۔ ناول کے اعتبار سے یہ اردو کا ایک کامیاب ناول ہے۔ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے اپنا ناول "آگ" لکھا جو ۱۹۴۷ء سے پہلے شائع ہوا۔ اس میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۲ء تک کشمیری معاشرے کی زندگی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول میں کشمیر کی تین نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ان کا وہ ناول شائع ہوا جسے آج ہم اُردو زبان کے بہترین ناولوں میں شمار کرتے ہیں اور جسے ہم سب "ایسی بلندی ایسی پستی" کے نام سے جانتے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں اس ناول کا ترجمہ پروفیسر رالف رسل نے انگریزی میں کیا جسے یونیسکو نے شائع کیا۔ ۱۹۵۰ء میں عزیز احمد کا آخری ناول "شبنم" شائع ہوا۔ ان سب ناولوں میں عزیز احمد نے اپنے دور کی روح کو لفظوں میں سمیٹ لیا ہے۔ اُس وقت خود عزیز احمد جوان تھے اور اُن کی عمر ۳۷ سال تھی۔ عزیز احمد کی ناول نگاری نے اردو ناول کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان ناولوں کے بغیر ہم اس دور کی معاشرت و رجحانات، اس کے تضاد اور کشاکش کا عرفان حاصل نہیں کر سکتے۔

اُردو ادب میں یہ دور روایت شکنی کا دور تھا اور پرانی اقدار اور رسوم کے خلاف بغاوت کا ایک سیلاب تھا جو نوجوان نسلوں کے ذہنوں میں موجزن تھا۔ فرائیڈ کے نظریۂ

جنس میں انسانی جبلّت کے نئے امکانات نظر آرہے تھے۔ ڈی۔ایچ۔لارنس منٹو کا بھی ہیرو تھا اور عزیز احمد کا بھی۔ منٹو نے افسانوں کے ذریعے اور عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں انسان کی اس جبلّت کو موضوع بنایا۔ ان ناولوں پر فرانسیسی حقیقت نگاری کے اثرات بہت نمایاں ہیں۔ان سب ناولوں میں "فرد" اہم ہے لیکن "ایسی بلندی ایسی پستی" میں ان کا زاویۂ نظر بدل جاتا ہے اور وہ فرد کے مطالعے سے جاگیردارانہ معاشرے کی ہیئتِ اجتماعی کا اتنی فن کاری سے مطالعہ کرتے ہیں کہ اس ناول میں فرد کا المیہ ایک تہذیب کا المیہ بن جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ محمد حسن عسکری مرحوم نے سہ ماہی "اردو ادب" لاہور میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ اُردو کا پہلا اجتماعی ناول ہے۔ اس دور میں جاگیردار امراء کی تہذیب دم توڑ رہی تھی۔ سارے برّصغیر میں یہی صورتِ حال تھی۔ یہی صورت ہمیں ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول "شامِ اودھ" میں نظر آتی ہے۔ "ایسی بلندی ایسی پستی" میں حیدرآباد دکن کا طبقۂ امراء موضوع بنا ہے اور "شامِ اودھ" میں لکھنؤ کا یہی طبقہ موضوع ہے۔ دونوں ناولوں میں انفرادی کردار ایک مخصوص تہذیب کے ذہن، فکر اور نظام کے اجتماعی زوال کی کہانی سناتے ہیں۔ عزیز احمد کے ناول "شبنم" میں پھر تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔ اس میں وہ عشق کو "گریز" کے انداز سے نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ہاں روایت بھی اب اپنی شکل بدل رہی ہے۔ اس کے بعد عزیز احمد نے کوئی ناول نہیں لکھا البتہ ایک تاریخی ناول "تیمور" کا اُردو میں ترجمہ کیا۔ اسی کے ساتھ تاریخ اُن کے یہاں طویل افسانوں کا موضوع بننے لگی اور قدیم تاریخ جدید شعور کی ترجمانی کرنے لگی۔ "زرّیں تاج"، "خدنگِ جستہ" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" ان کی وہ لازوال کہانیاں ہیں جنھوں نے اردو ادب کی میراث کو بیش بہا بنا دیا ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے جب عزیز احمد کے ناول "ایسی بلندی ایسی پستی" کو دوبارہ شائع کیا تو ۱۸ر نومبر ۱۹۷۶ء کو ایک خط میں مجھے لکھا کہ "آپ سے ارشاد فرمائیں کہ تین جلدیں مجھے روانہ کردیں، میں بہت ممنون ہوں گا۔ آپ سے یہ بھی ارشاد فرمائیں کہ میری جو اُردو کتابیں وہ چاہیں دوبارہ شائع فرماسکتی ہیں۔ خاص طور پر میں یہ چاہتا ہوں کہ میرے آخری تحریری دور کے طویل افسانے، جو زیادہ تر "نیا دور" میں شائع ہو چکے ہیں، وہ ایک جلد میں جمع کرکے شائع فرمائیں اور اگر آپ خود اس جلد کا "دیباچہ" لکھیں تو میری بڑی عزّت افزائی ہوگی۔" پھر یہ ہوا کہ جمیلہ ہاشمی بیمار ہوگئیں اور

اس کے ساتھ ان کا اشاعتی منصوبہ کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔ ایک اور خط میں عزیز احمد نے مجھے لکھا کہ" وہ حصّہ جو "نیا دور" میں میرے متعلق ہوگا اس میں "تصورِ شیخ" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" ضرور شامل کیجیے گا۔" یہ دونوں کہانیاں "نیا دور" کے اگلے شمارے میں پھر شامل ہوئیں۔ ان کہانیوں میں عزیز احمد نے فن کی بلندیوں کو چھو لیا ہے۔

عزیز احمد نے اپنے مختصر اور طویل افسانوں میں روایت، اساطیر اور تاریخی شخصیات کو موضوع بنا کر ان کے گرد ایسے افسانوی تار و پود بُنے جن سے وہ شخصیتیں ایک نئے رنگ میں زندہ ہو کر ہمارے جدید شعور کا حصّہ بن گئیں۔ یہ افسانے تہذیبی و روایتی سرمائے کو جدید زمانے سے ہم آہنگ کرنے کا بہترین اظہار ہیں۔ جدید دور ماضی میں خود کو کیسے تلاش کر سکتا ہے، اس تخلیقی عمل کی یہ افسانے خوب صورت اور بہترین مثالیں ہیں۔ زریں تاج، تصورِ شیخ، مدن سینا اور صدیاں، آبِ حیات، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں اور خدنگ جستہ کو اردو ادب میں اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہے کہ آج تک ایسے افسانے اردو میں کوئی اور نہیں لکھ سکا۔ یہ افسانے اپنے فنی حسن، کمالِ اختصار اور طرزِ ادا کے لحاظ سے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ عزیز احمد کا اصل فن یہ ہے کہ وہ موجود شخصیات یا تاریخی کردار اور علامات کو اپنے زمانے کے جذبات و احساسات کے ساتھ اتنی فنی چابک دستی کے ساتھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ روایت کا سلسلہ در سلسلہ، اس کی گہرائیاں اور اس کی وسعت سمٹ کر زمانۂ حال میں آ جاتی ہیں۔ عزیز احمد نے ان افسانوں میں کلاسیکی حسن کو چھو لیا ہے۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے: "رقصِ ناتمام" اور "بیکار دن، بیکار راتیں" شائع ہو چکے ہیں۔ اگر عزیز احمد کچھ اور نہ بھی کرتے تو ان ناولوں اور افسانوں کی وجہ سے اردو ادب میں زندہ رہتے۔ لیکن ایک بڑے ذہن کی طرح ان کا ذہنی سفر جاری رہا۔ وہ کسی منزل پر تھک کر نہیں بیٹھے بلکہ ہر منزل سے ایک نئے عزم کے ساتھ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے رہے۔ ان کی وفات کے بعد اب ان کی تخلیقی، علمی و ادبی زندگی کے نئے سفر کا آغاز ہوا ہے۔

عزیز احمد کی پہلی تنقیدی تصنیف "ترقی پسند ادب" نے اپنے دور میں وہ کام کیا جو بہت کم کتابیں کرتی ہیں۔ ایک ایسے دور میں جب نئے خیالات، میلانات اور رویوں کا سیلاب

آیا ہوا تھا اور اس سیلاب میں تعصبات کا کوڑا کرکٹ اور پارٹی لائن کا ریت خاصی مقدار میں بہہ کر آ گیا تھا، عزیز احمد نے معروضی انداز سے اس دور کے میلانات کا تجزیہ کیا۔ اس کتاب نے اس دور کے لکھنے اور پڑھنے والوں کو پھر سے غور کرنے اور مسائل و رجحانات کا جائزہ لینے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ماضی اور روایت کی اہمیت پر زور دیا۔ تخلیق کے لیے فن، ہیئت اور بیان کی اہمیت واضح کی، ادب اور پروپاگنڈا کو الگ الگ خانوں میں رکھا۔ اس تصنیف میں انھوں نے حقیقت نگاری اور انقلاب کے نئے رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے فن کو سیاست و تعصب کی بھینٹ نہیں چڑھنے دیا۔ عزیز احمد کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک معروضی ذہن اور کھلا دماغ رکھتے تھے۔ انھوں نے زندگی کو خانوں میں نہیں بانٹا بلکہ اُسے ایک اکائی کے طور پر دیکھا جو ہر دم رواں دواں آگے بڑھتی رہتی ہے اور جس میں حال کی طرح ماضی بھی غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ اقبال کو بھی انھوں نے کھلے ذہن سے دیکھا ہے اور "اقبال ـــ ایک نئی تشکیل" میں جس طرح اقبال کا مطالعہ کیا ہے، جس طرح اقبال کے ذہن سے متعلق ان تمام مباحث کو سمیٹا ہے، جس طرح اقبال کے فن اور پیغام کی وضاحت کی ہے، آج بھی یہ کتاب اقبال پر ہزاروں لاکھوں صفحات لکھے جانے کے باوجود ایک ایسی اہم کتاب ہے جس کے بغیر اقبال کا مطالعہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ ہمارے دور میں اقبال کا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ان کا مطالعہ ایک مجاور کی حیثیت سے کیا ہے اور اس طرح اس فکر کو، جسے اقبال نے تشکیل دے کر آگے بڑھایا تھا، ہم نے بند باندھ کر وہیں روک دیا ہے۔ فکرِ انسانی تنقیدی نظر سے اُبھرتی ہے، تجزیے سے نشو و نما پاتی ہے، اختلاف و تضاد کے تصادم سے آگے بڑھتی ہے۔ قوموں کی زندگی میں صرف سجادہ نشینوں اور مجاوروں کے ذہن سے نہیں بلکہ خود اقبال کی طرح کھلے ذہن سے زندگی اور فکر کا مطالعہ کرنے سے نشاۃ الثانیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ جب تک ہم اپنے موجودہ رویے کو نہیں بدلیں گے، ہمارا معاشرہ اسی طرح خود غرضیوں، انسانی پستیوں، ذہنی فریب، ہر قسم کے تعصبات اور بے سر و پا جذبات کی دلدل میں دھنسا رہے گا۔ یہی کھلا ذہن عزیز احمد کو فکر و تحقیق کی طرف لے گیا۔ انھوں نے دیکھا کہ برہمنی ذہن انسان دوستی کے حوالے سے انھیں اپنے عظیم تمدن اور تہذیب کے ورثے سے دور کر کے خالص ہندوستانی

اساطیر کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ اقبال نے اپنی فکر و شاعری کے ذریعے مسلمانوں کو ان کی تہذیب و تمدن کے ورثے سے نہ صرف باخبر کیا تھا بلکہ عہدِ حاضر کے تقاضوں کے پیشِ نظر ایک نظامِ فکر کو تشکیل دینے کے لیے بے شمار مسائل اُٹھائے تھے۔ ان مسائل کا جواب اور حل کی تلاش ہمارا فریضہ تھا۔ ہم یہ فریضہ کھلے ذہن سے پورا کر سکتے تھے لیکن مجاوروں نے ہماری نسل کے ذہن کو خوف سے گندا کر دیا اور فکرِ اقبال کے ارتقا کو روک دیا۔ کیا فکری سطح پر یہ ہمارا قومی المیہ نہیں ہے؟

۱۹۵۷ء کے بعد عزیز احمد نے خصوصاً مسلمانوں کی تہذیب اور فکر کا مطالعہ شروع کیا۔ اب وہ ادب سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ان کا آخری افسانہ "تیری دلبری کا بھرم" "نیا دور" کراچی کے شمارہ نمبر ۲۵، ۲۶ میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے اردو میں کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں لکھی۔ اب انھوں نے انگریزی زبان میں مضامین اور تصانیف کا باقاعدہ سلسلہ شروع کیا جن کا موضوع مسلمانوں اور خصوصاً برِّصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ و تہذیب کا مطالعہ تھا۔ جب اُن کی پہلی کتاب Studies In Islamic Culture in the Indian Environment شائع ہوئی تو علمی حلقوں میں اُسے بہت پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی دوسری کتاب Islamic Modernism In India and Pakistan شائع ہوئی اور پھر Muslim Self Statement In India and Pakistan شائع ہوئی تو بین الاقوامی حلقوں میں ان کی علمی و تحقیقی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سے مضامین بھی لکھے جو بین الاقوامی رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ان کی دو اور قابلِ ذکر تصانیف An Intellectual History of Islam in India اور History of Islamic Sicily بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں اٹلی کی حکومت نے آخر الذکر کتاب پر انھیں انعام دیا۔ عزیز احمد کی یہ خواہش تھی کہ میں Studies in Islamic Culture اور Islamic Modernism in India and Pakistan کا اردو میں ترجمہ کر دوں۔ وہ جس محبت سے مجھے خط لکھتے

تھے اس محبت کا جواب میں نے کبھی انکار سے نہیں دیا اور وعدہ کرلیا۔ یہ برسوں پہلے کی بات ہے۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ "اسلامک موڈرنزم" کا ترجمہ میں نے بہت پہلے مکمل کرلیا تھا اور "اسلامک کلچر" کا تقریباً ایک تہائی ترجمہ ہوچکا ہے۔ جب تک عزیز احمد زندہ تھے، مجھے چھاپنے چھپوانے کی جلدی نہیں تھی، لیکن اب جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں، میں اپنی پہلی فرصت میں اس فریضے سے سبکدوش ہوجانا چاہتا ہوں۔ عزیز احمد کی یہ وہ تصانیف ہیں جن میں انھوں نے مطالعۂ تاریخ اور اس کے تجزیے کے ذریعے جدید اسلامک فکر کا سراغ لگانے میں وہ کام کیا ہے جس کا آغاز سر سیّد نے کیا تھا اور جس کو اقبال نے ایک خاص نقطے تک پہنچایا تھا۔ جب تک ہم اپنی جڑیں اپنی تاریخ، اپنی تہذیب اور اپنی حقیقی فکر میں تلاش نہیں کریں گے ہم کسی ایسے صحت مند معاشرے کو جنم نہیں دے سکتے جہاں ایک طرف دولت کی مساوی تقسیم سے معاشرہ خوش حال ہوجائے اور جہاں عدل و انصاف سب کے لیے یکساں ہو اور دوسری طرف جہاں علم و ادب، فکر و تہذیب کی روشنی سے معاشرے کا ذہن منور ہوسکے۔ عزیز احمد کی کتابیں ہمارے فکری راستے کو بہت دور تک طے کرا دیتی ہیں۔

۱۶ر دسمبر ۱۹۷۶ء کے خط میں انھوں نے لکھا تھا "دیوانِ حسن شوقی، دیوانِ نصرتی اور گلشنِ عشق بھیجنے کا شکریہ نہ ادا کرسکا۔ فروری سے سرطان میں مبتلا ہوں۔ تین آپریشن ہوچکے ہیں۔ آخری آپریشن ہوا کہ جس کے ذریعے سرطان کو نکال دیا گیا اور اب یونی ورسٹی میں پھر سے پڑھا رہا ہوں لیکن مرض کے دوبارہ عود کر آنے کا اندیشہ لگا ہوا ہے ـــــ جب ہسپتال میں تھا دو غزلیں لکھیں جو ذرا قنوطی ہیں۔ فارسی غزل کا دوسرا شعر ملحدانہ بھی ہے اور عارفانہ بھی۔ معلوم نہیں اس کی اشاعت سے پاکستان میں ہنگامہ برپا ہوگا یا نہیں۔" وہ شعر انھوں نے اپنے قلم سے کاٹ دیا تھا اور "نیا دور" میں شائع نہیں ہوا۔ آج آپ بھی وہ شعر سن لیجیے :

او کہ ہر جاست بیک خانہ نخواہد گنجید
شد ز اصنام تہی کعبہ چہ ویراں افتاد

مظہر جانجاناں، میر درد، بلھے شاہ اور اقبال ہوتے تو یہ شعر سُن کر عزیز احمد کو سینے سے لگا لیتے۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۷۶ء کے خط میں لکھا: "جتنی محبت اور اخلاق سے آپ پیش آتے رہے ہیں اس کی میں مرتے دم تک قدر کرتا رہوں گا۔ فی الحال تو کام کر رہا ہوں اور اگر خدا نے چاہا اور سرطان دوبارہ عود نہ کرنے پایا تو شاید کچھ دن زندہ رہوں۔ ویسے نہ زندگی کی کوئی خاص خواہش ہے نہ مرنے کا کوئی خاص ڈر۔ جب اللہ کی مرضی ہو، میں راضی برضا ہوں۔" ۱۵ر اگست ۱۹۷۸ء کے خط میں لکھا "میں بدستور زندگی اور موت کے درمیان معلق ہوں۔ جب تک چل رہا ہوں چل رہا ہوں۔ آپ جیسے مخلص دوست بہت یاد آتے ہیں۔ ایک نئی غزل ہوئی ہے جو "نیا دور" کے لیے بھیج رہا ہوں۔" اس غیر مطبوعہ غزل کے چار شعر آپ بھی سُن لیجیے۔ دیکھیے عزیز احمد ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

گھبرا کے ہم تو عرصۂ جاں سے نکل گئے
بزمِ جہاں، طلسمِ جناں سے نکل گئے
کب سے تھے ہم اسیرِ شب و روز و ماہ و سال
قیدِ زمان و بندِ مکاں سے نکل گئے
تھا جنبشِ زبان و قلم کا یہ ماحصل
ناگفتہ حرف تھے کہ زباں سے نکل گئے
یاروں کو بزمِ لالہ رُخاں ہی میں چھوڑ کر
ہم خاک بن کے کوئے بتاں سے نکل گئے

اُدھر کئی مہینے سے اُن کا خط نہیں آیا تھا۔ میں بھی مصروف تھا۔ دسمبر میں میں نے انھیں خط لکھا۔ خیریت دریافت کی اور پاکستان آنے کا پروگرام پوچھا۔ وہ خاموش تھے اور دعا مانگ رہے تھے:

ہے یہ دعا کہ تم کو ابد تک رہیں نصیب
علم و ادب کے افسر و اورنگ دوستو

لیکن مجھے تو اپنے خط کے جواب کا آج تک انتظار ہے۔

خواتین و حضرات! یہ میں نے عزیز احمد کے بارے میں کوئی مضمون نہیں لکھا ہے۔ صرف ایک شریف النفس، منکسر المزاج، عالم فاضل اور ایک بھولے بسرے انسان کی یاد تازہ کرنے کے لیے ان کے کام کا تعارف کرایا ہے تاکہ آپ اندازہ کرسکیں کہ عزیز احمد کی وفات سے قومی و ملّی سطح پر ہمارا کتنا بڑا نقصان ہوا ہے۔ کاش ہم اس نقصان کا احساس کرسکیں؟

(۹، ۱۹ء)

میراجی — ایک مطالعہ

فیض احمد فیض اردو زبان کے وہ شاعر تھے جن کے حوالے سے یہ زبان اور اُس کی شاعری اُن انجان بستیوں میں بھی پہچانی گئی جہاں ہمارے دوسرے شاعر اور ادیبوں کے نام اور کام کا گذر تک نہ ہوا۔ فیض نے شاعری میں ایک ایسی منفرد آواز کو جنم دیا جو دُور سے پہچانی جاتی تھی اور اس آواز میں کُھلی ہوئی دُنیا کے عوام کا کرب شامل کر کے اُسے سب کے دلوں کی دھڑکنوں میں جذب کر دیا۔ فیض احمد فیض، میراجی اور ن۔م۔راشد کے ہم عصر بلکہ ہم عمر تھے۔ ن۔م۔راشد ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے۔ فیض ۱۹۱۱ء میں اور میراجی ۱۹۱۲ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے نہ صرف اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا بلکہ اُردو میں نئی شاعری کی طرح ڈالی۔ یہ تینوں شعراء تین الگ الگ رنگوں کے علمبردار ہیں اور یہ تینوں رنگ مل کر اُردو شاعری کو ایک نیا تناظر فراہم کرتے ہیں۔ ایک بڑے معاصر فیض احمد فیض نے، اپنے دوسرے بڑے معاصر میراجی کے بارے میں لکھا تھا کہ:

> ”اُن کی نثر کی ماہئیت اور فضا اُن کی نظم سے قطعی مختلف ہے۔ میراجی کے ذہن کا جو عکس ان کی نثر میں ملتا ہے بعض اعتبار سے ان کی شاعرانہ شخصیت کی قریب قریب مکمل نفی کرتا ہے۔۔۔۔۔ ان کی تخلیق کا یہ حصہ تمام تر اسی پاسبانِ عقل کی رہنمائی میں لکھا گیا ہے جسے وہ بظاہر عملِ شعر کے قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔“[۱]

یہی میراجی، جن کی وفات کا انتالیسواں (۳۹) اور ولادت کا ستترواں (۷۷) سال ہے،

آج کے "فیض میموریل لیکچر" کا موضوع ہیں۔

میراجی، جن کا اصل نام محمد ثناء اللہ ثانی ڈار تھا، منشی محمد مہتاب الدین کے ہاں ۲۵ رمئی ۱۹۱۲ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ پہلے "ساحری" تخلص کرتے تھے لیکن ایک بنگالی لڑکی میرا سین کے یک طرفہ عشق میں گرفتار ہو کر، جیسا کہ شیخ سعدیؒ نے گلستان کے باب پنجم میں لکھا ہے کہ درعہد جوانی چناں کہ اُفتد دانی، میراجی تخلص اختیار کر لیا اور آج ہم اُنھیں اسی نام سے پہچانتے ہیں۔ میراجی کی ذات سے ایسے ایسے واقعات وابستہ ہیں کہ اُن کی ذات عام آدمی کے لیے ایک افسانہ بن کر رہ گئی ہے۔ اُن کا حلیہ اور ان کی حرکات وسکنات ایسی تھیں کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے سلسلۂ ملامتیہ میں بیعت کر لی ہے۔ لمبے لمبے بال، بڑی بڑی مونچھیں، گلے میں ایک سو ایک موٹے دانوں کی دو گز لمبی مالا، شیروانی جس کی کُہنیاں ہمیشہ پھٹی ہوئی ہوتی تھیں، اوپر نیچے بیک وقت تین پتلونیں، اوپر کی جب میلی ہو گئی تو نیچے کی اوپر اور اوپر کی نیچے بدل جاتی۔ شیروانی کی دونوں جیبوں میں بہت کچھ ہوتا تھا۔ کچھ دُھلے ہوئے چیتھڑے، ایک پائپ، کاغذ میں پائپ کا دیسی تمباکو، پان کی ڈبیا، ہومیوپیتھک دوائیں...... کاغذوں اور بیاضوں کا پلندہ بغل میں دابے بڑی سڑک پر پھرتا تھا اور چلتے ہوئے ہمیشہ ناک کی سیدھ دیکھتا تھا۔ تاک جھانک کر وہ کفر خیال کرتا تھا۔ بازار میں کسی سے مذاق نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے گھر اپنے محلے اور اپنی سوسائٹی کے ماحول کو دیکھ دیکھ کر کُڑھتا تھا...... اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ اپنے لیے شعر کہے گا۔"[۲۵]

سعادت حسن منٹو نے لکھا ہے کہ "میراجی تین گولے تھا جن کو لڑھکانے کے لیے اس کو کسی خارجی مدد کی ضرورت نہیں پڑتی تھی...... ان خارجی اشاروں نے ہی اس پر ایک ازلی اور ابدی حقیقت کو منکشف کیا تھا۔ حُسن، عشق اور موت۔ اس تثلیث کے تمام اُقلیدسی زاویے صرف اِن تین گولوں کی بدولت اس کی سمجھ میں آئے تھے، لیکن حسن و عشق کے انجام کو چونکہ اس نے شکست خوردہ عینک سے دیکھا تھا جس کے شیشوں پر تریڑے تھے...... اس کے سارے وجود میں ایک ناقابلِ بیان ابہام کا زہر پھیل گیا تھا جو ایک نقطے سے شروع ہو کر ایک دائرے میں تبدیل ہو گیا تھا اس طور پر کہ ہر نقطہ اس کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی

نقطۂ انجام۔ حسن عشق اور موت ـــــ یہ تکون چپک کر میراجی کے وجود میں گول ہوگئی تھی۔[۳۲] ایک دفعہ میراجی کے ہاتھ میں تین گولوں کے بجائے دو گولے دیکھ کر منٹو نے پوچھا کہ تیسرا گولہ کیا ہوا، تو میراجی نے جواب دیا "برخوردار کا انتقال ہوگیا ہے مگر اپنے وقت پر ایک اور ہوجائے گا۔"[۳۳]

الطاف گوہر نے پہلی ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک دن مختار صدیقی کے ہمراہ وہ میراجی کے گھر گئے۔ مختار صدیقی نے کھڑکی کے قریب جاکر آواز دی "میراجی صاحب" اندر سے آواز آئی "آئیے" ہم اندر گئے۔ متوسط گھر کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ ہوا کے جھونکے سے گلی کی بُو کمرے میں آگئی۔ میراجی نے کہا "بو آرہی ہے۔ ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں" اور یہ کہہ کر انھوں نے یکے بعد دیگرے پانچ سات بیڑیاں سُلگائیں اور دو دو چار چار کش لگا کر کمرے میں اِدھر اُدھر پھینک دیں۔[۳۴] ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "پُونا میں ایک مشاعرہ ہورہا تھا۔ بڑے عظیم الشان پیمانے پر۔ جوشؔ، جگرؔ، فراقؔ سبھی تھے۔ میراجی آئے اور حاضرین کی طرف پیٹھ کرکے پڑھنے لگے۔ "نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔"[۳۵]

یہ اور اسی قسم کے بے شمار واقعات آپ کو اُن تحریروں میں ملیں گے جو اُن کے دوست احباب نے میراجی کے بارے میں لکھی ہیں۔ یہ سب واقعات انتہائی دلچسپ ہیں۔ آپ بھی ان سے یقیناً لُطف اندوز ہوئے ہوں گے لیکن ان واقعات نے ایک طرف میراجی کو افسانہ بنادیا اور دوسری طرف شاعری کی طرف سے توجہ ہٹا کر اُس کا رُخ اُن کی ذات کی طرف کردیا۔ حالاں کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ میراجی کی تخلیقات سے میراجی کی طرف سفر کیا جاتا اور پھر اسی کے ساتھ فوراً سفرِ واپسی یعنی میراجی سے پھر تخلیق کی طرف۔ یہاں عمل اُلٹا ہوا۔[۳۶] میراجی نے اپنی مشہور تصنیف "اس نظم میں" کے دیباچہ میں خود لکھا ہے کہ "شاعر کے نام کی طرف نہیں بلکہ کام کی طرف دیکھا جائے۔"[۳۷]

آیئے اب اُن کے حلیے، اُن کے گولوں، ان کی بغیر جیب کی پتلون، ان کی لٹوں، اُن کی مالا، اُن کی شراب نوشی اور عجیب و غریب حرکات کو چھوڑ کر ان کے کام کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان واقعات کو سُن کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر یہی ڈھونگ رچائے رہے در

شاید انھوں نے تخلیقی سطح پر کوئی خاص کام نہیں کیا۔ اس تصویر سے ایک غیر ذمہ دار اور مجنون انسان کی تصویر ضرور اُبھرتی ہے، جو میراجی یقیناً نہیں تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے چراغ کی بتی کو دونوں سروں سے یقیناً جلایا اور صرف ۳۷ ½ سال کی عمر میں ۳ نومبر ۱۹۴۹ء کو مر گئے۔ اس مختصر سی عمر میں میراجی نے اتنا لکھا کہ آج صرف اُن کی کلیاتِ شاعری ہی ۱۰۸۰ صفحات پر مشتمل ہے اور حال ہی میں اُردو مرکز لندن سے شائع ہوئی ہے۔ ان کی تصانیف میں جہاں مشرق و مغرب کے نغمے (۱۹۵۸ء)، اس نظم میں (۱۹۴۴ء)، نگار خانہ (۱۹۵۰ء) خیمے کے آس پاس (۱۹۶۴ء) شامل ہیں وہاں میراجی کے گیت (۱۹۴۳ء)، میراجی کی نظمیں (۱۹۴۴ء) گیت ہی گیت (۱۹۴۴ء) پابند نظمیں (۱۹۶۸ء) اور تین رنگ (۱۹۶۸ء) شاعری کے وہ مجموعے ہیں جنھوں نے اُردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کرایا اور اسے اس راستے پر ڈال دیا جس پر وہ آج گامزن ہے۔ ان کے علاوہ انھوں نے نثر میں بھی اتنا لکھا کہ اگر اسے یکجا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آئے گی۔ شاعری کی طرح ان کی نثر کو بھی یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ میراجی کی پوری تخلیقی شخصیت سامنے آجائے اور نئی نسل کو معلوم ہو سکے کہ میراجی نے جدید ادب کو کن نئے امکانات سے روشناس کیا ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ اتنا نیا اور پُر از امکانات کام ہے کہ بعض لوگوں نے طویل عمر پاکر اور باقاعدہ زندگی گذار کر بھی انجام نہیں دیا۔ میراجی از سر تا پا تخلیق تھے۔

اس سوال نے مجھے اکثر پریشان کیا ہے کہ آخر اس ساری تخلیقی سنجیدگی اور گہرے تخلیقی انہماک کے باوجود انھوں نے یہ حُلیہ کیوں بنایا اور ساری عمر اپنی زندگی اس طور سے کیوں گذاری۔ غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اُس دور میں جب وہ ادب کی دُنیا میں کچھ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے اور اپنے اور دوسری زبانوں کے شعراء کے کلام اور حالات کا گہرا مطالعہ کر رہے تھے، انھوں نے اپنے تخلیقی کرب و اضطراب کے پیشِ نظر یہ سوچا کہ اگر وہ بھی یہی کریں جو دوسرے عظیم شعرا نے کیا ہے تو لوگ نہ صرف اُن کی طرف متوجہ ہوں گے بلکہ ان کی شہرت تیزی سے چاروں طرف پھیل جائے گی۔ اس وقت میراجی کی عمر ۲۲-۲۳ سال تھی اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں یہ عمر خواب دیکھنے کی عمر ہوتی ہے۔

اس زمانے میں چنڈی داس ان کا محبوب شاعر تھا۔ چنڈی داس نے رامی دھوبن سے عشق کیا۔ میراجی نے میرا سین کے عشق کا افسانہ بنا دیا۔ بودلیئر دوستوں کو دشمن بنانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ میراجی بھی اس سے کم نہیں تھے۔ "مشرق و مغرب کے نغمے" میں میراجی نے بودلیئر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے کئی نظمیں اپنی ہی ذات کے لیے لکھی ہیں[۸]۔ میراجی نے بھی ابتدائی دور کی شاعری اپنی ذات کے لیے کی۔ بودلیئر کے بارے میں میراجی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ لاشعور کا شاعر تھا۔ وہ نئے احساسات، نئے لہجے، نئے اندازِ بیان اور نئی زبان کا شاعر تھا۔ یہی کام میراجی نے بھی کیا۔

بودلیئر نے سماج کے خلاف احتجاج کرنے کا یہ طریقہ نکالا کہ اپنا سر مُنڈوا کر، اس پر ہرا رنگ پھروا دیا اور احتجاج کی عبارت سر پر لکھ کر اور ایک کیکڑے کو دھاگے میں باندھ کر پیرس کے ایک ریستوران کے باہر کھڑا ہو گیا اور کیکڑے سے مخاطب ہو کر احتجاج کرتا رہا۔ میراجی نے بھی ایک بار اسی قسم کی وضع اختیار کی۔ اخلاق احمد دہلوی نے لکھا ہے کہ "میراجی نے دِلّی میں جب ایک مرتبہ نیا سال آنے پر احباب کے اصرار پر نیا سوٹ پہنا اور اپنا وہ چارلی چپلن والا جوتا بھی بدل ڈالا اور کلارک گیبل کی وضع کی مونچھیں بھی حذف کرا دیں تو ان سب کو بھی حیرت ہوئی جن کے اصرار پر وہ سوٹڈ بوٹڈ بنے تھے اور سب نے سمجھا کہ نیا سال میراجی کے نئے لباس سے شروع ہو رہا ہے لیکن جب پوری طرح ٹپ ٹوپ ہو کر انھوں نے سر پر اُسترا پھروا دیا اور چاند سے سر پر میبی نیوائر پینٹ کرایا اور وہ مالائیں جو قمیض کے اندر رہتی تھیں باہر کوٹ کے کالر پر پہن لیں تو ان کے مقربین کو کہنا پڑا کہ کوئی لباس میراجی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"[۹]

بودلیئر نے اپنی ماں کو لکھا "کبھی کبھی مجھے تین تین دن بستر پر لیٹے رہنا پڑتا ہے کیونکہ میرے پاس دُھلے ہوئے کپڑے پہننے کو نہیں ہوتے یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا۔ سچ پوچھو تو شراب اور افیون کا ست دُکھ کا بدترین دارو ہے۔ پچھلی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے ۱۵ فرینک بھیجے تھے تو میں نے دو روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ دو روز یعنی ۴۸ گھنٹے۔"[۱۰]

میراجی اپنے دوست عبداللطیف کو ایک خط میں لکھتے ہیں "رات کو روز دفتر میں سوتا

تھا یعنی ریہرسل روم میں۔ آج اس کی چابی وقار صاحب کی جیب میں ان کے ساتھ چلی گئی۔ جب سے آپ گئے ہیں صبح کا ناشتہ اور رات کا کھانا مختار اپنے حساب میں ہوٹل سے کھلوا دیتا ہے۔ دوپہر کا کھانا وشوانندن اپنے گھر سے لا دیتا ہے۔ مانگ کر کھاتا ہوں اور قرض کی شراب پیتا ہوں "[۱۱] ایک اور خط میں لکھا ہے "تین دن بھوکا رہنے سے طبیعت صاف ہو گئی "[۱۲] بودلیئر ساری عمر قرض خواہوں سے جان نہ چھڑا سکا۔ میراجی بھی ساری عمر قرض لیتے رہے۔ ان میں پٹھان بھی شامل تھے جو انھیں ساری عمر ڈھونڈتے رہے۔ ایڈگر ایلن پو کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ "کوئی اسے شرابی کہتا ہے۔ کوئی اعصابی مریض، کوئی اذیت پرست اور کوئی جنسی لحاظ سے ناکارہ ثابت کرتا ہے اور ان رنگا رنگ خیال آرائیوں کی وجہ سے اصلیت پر ایسے پردے پڑ گئے ہیں کہ اٹھائے نہیں بنتا ہے"[۱۳] اس وقت جب میراجی نے یہ الفاظ لکھے تو میراجی ایک نارمل سے انسان تھے لیکن جب ان تصورات کو انھوں نے اپنا کر زندگی کے روپ کو بہروپ بنایا تو آج ہم بھی ان کے بارے میں یہی کہہ رہے ہیں جو انھوں نے ۲۲-۲۳ سال کی عمر میں ایڈگر ایلن پو کے بارے میں کہا تھا کہ "ایڈگر ایلن پو مر چکا ہے .... شاعر مذکور اپنی ذات اور شہرت کے لحاظ سے تمام ملک میں پہچانا جاتا تھا لیکن کہیں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا "[۱۴] اب ملاحظہ فرمائیے کہ جب میراجی کا انتقال ہوا تو اخترالایمان نے بتایا کہ ان کے جنازے میں گنتی کے چار آدمی تھے۔ اخترالایمان، مہندر ناتھ، مدھوسودن اور ان کے ہم زلف سدن۔

پو کی بیوی کے بارے میں میراجی نے لکھا ہے کہ اس کی بیوی ایک ایسا سایہ بن جاتی تھی جسے حقیقت سے کوئی تعلق نہ ہو"[۱۵] سایہ میراجی کی شاعری میں اسی نوع کی علامت بن کر بار بار آیا ہے۔ میراجی نے لکھا ہے کہ ایڈگر ایلن پو عورت کے بجائے عورت کے تصور کی پوجا کرتا تھا "[۱۶] میراجی کی شاعری کے بارے میں نقادوں نے لکھا ہے کہ "میراجی کو تصور سے پیار ہے۔ تصور میراجی کا آدرش ہے۔ منظر بھی منظر بن کر نہیں تصور بن کر شاعری میں آتا ہے "[۱۷]

"ہاں تصور کو میں اپنے بنا کر دُولہا
اسی پردہ کے نہاں خانے میں لے جاؤں گا
بند ہوتا ہوا کھُلتا ہوا دروازہ ہے
ہاں یہی منظرِ لبریزِ بلاغت اب تو
آئینہ خانے میں آنکھوں کے جھلکتا ہے مدام"۔ ۱۸

یہ سب حوالے میں نے اس لیے دیے تاکہ یہ بات آپ کے ذہن نشیں کرا سکوں کہ میراجی کے تخلیقی ذہن کی تشکیل کے دور میں انھوں نے اپنے پسندیدہ اور بڑے شعرا کی وہ سب حرکات و سکنات، جو انھیں اچھی لگیں، اختیار کرلیں اور اپنی زندگی کے روپ کو بہروپ بنالیا۔ اس طرح انھوں نے متضاد عناصر کو اپنی ذات میں جمع کیا اور اس جمع آوری سے اپنے خارجی وجود کو آباد کرلیا۔ بودلیئر، ایڈگر ایلن پو، ہائنے، لارنس، میلارمے اور چنڈی داس وغیرہ سے ثناءاللہ ثانی ڈار نے میراجی کو تخلیق کیا اور پھر ساری عمر اپنے تخلیق کیے ہوئے میراجی کے روپ بہروپ میں وہ ایسی زندگی بسر کرتے رہے جیسی کہ انھوں نے ان کی زندگی کے متضاد پہلوؤں کا ایک ایک ثبوت "مشرق و مغرب کے نغمے" سے ملتا ہے۔ اسی لیے میراجی کے مطالعہ کے لیے ان کی یہ کتاب بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

میراجی کی پیدائش (۱۹۱۲) اور وفات (۱۹۴۹) کے درمیان دُنیا دو عالم گیر جنگوں کا شکار ہوئی جس کے نتیجے میں سارا معاشرتی، فکری و معاشی نظام درہم برہم ہوگیا اور سارا روایتی اخلاقی نظام، سماجی اقدار اور انسانی رشتے ٹوٹ پھوٹ کر بے ربط و بے معنی ہوگئے۔ مغلوب قومیں آزادی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ قدیم و جدید کی حدیں نمایاں ہونے لگیں۔ روایتی و قدیم اقدار سے بغاوت ایک عام رجحان بن گیا۔ مارکس، فرائڈ اور آئن سٹائن کے نظریات نے نئے معاشی، انسانی، ذہنی اور سائنسی علوم کے امکانات وا کردیے۔ برصغیر بھی اس بدلتے ہوئے تناظر سے متاثر ہوا اور یہاں بھی صورت حال تیزی سے بدلنے لگی۔ افلاس، مایوسی، بیروزگاری اور بے یقینی نے نوجوان نسل کو گھیر لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مستقبل گم ہوگیا ہے۔ میراجی

بھی اسی نوجوان نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ بےیقینی، بے روزگاری، اور بے معنی رسمی اخلاقیات سے برگشتگی ان کے لیے ایک زندہ حقیقت بھی تھی اور احساس کا حصہ بھی۔ میراجی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اسے اپنے لفظوں اور روپ بہروپ سے دوسروں کو دکھا بھی دیا۔ میراجی نے لکھا:

"مستقبل سے میرا تعلق بے نام سا ہے۔ میں صرف دو زمانوں کا انسان ہوں۔ ماضی اور حال — یہی دو دائرے مجھے ہر وقت گھیرے رہتے ہیں اور میری عملی زندگی بھی انہی کی پابند ہے۔"[۱۹]

اگر اس زاویے سے میراجی کے فکر و عمل کو دیکھیے تو وہ با معنی نظر آتے ہیں۔ بغیر مستقبل کے زندگی گذارنے والا نوجوان اس معاشرے میں اسی انداز سے اور اسی طرح زندگی گذار سکتا تھا۔ میراجی کا خارجی روپ ان کے داخلی وجود کا نتیجہ تھا اور اس طرح میراجی اس معاشرہ کے عام نوجوان کی روح کا زندہ اور جیتا جاگتا پیکر تھے۔ انھوں نے نہ صرف لفظوں سے بلکہ اپنے خوابوں کے ساتھ اپنی زندگی کو جس سانچے میں ڈھالا وہ بے مستقبل نوجوان کی ترجمان تھی۔ کیا ہم اسے بغاوت نہیں کہیں گے؟ کیا کوئی نوجوان اپنی روح کے اظہار کے لیے رسمی اخلاقیات میں گھرے ہونے کے باوجود یہ صورت اختیار کرنے کی جرأت کرسکتا ہے جس کا اظہار میراجی نے کیا! ۔ ذرا میراجی کے حلیے کو ان کے انوکھے روپ بہروپ کو اس نقطۂ نظر سے بھی دیکھیے تو آپ کو ان کے خارجی و داخلی وجود کے اظہار میں گہری معنویت نظر آئے گی۔ اسی لیے میراجی نے اپنے دوست عبداللطیف کو ۱۲/ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے ایک خط میں لکھا:

"میں دلّی چھوڑ کر بمبئی کے گرد و نواح میں ہوں۔ پہلے دفتر کی میزوں پر سوتا تھا۔ اب فرش پر براجمان ہوتا ہوں ...... خود کو کبھی معمولی اور کبھی پہنچا ہوا بڑا فقیر تصوّر کرتا ہوں اور دنیا شاید مجھے بھکاری سمجھتی ہے۔ سچ ہے سماج کے فرائض جس طرح دنیا انھیں سمجھتی ہے میں نے، جس طرح میں انھیں سمجھتا ہوں، پورے نہیں کیے۔ لیکن

میں نے اپنی جسمانی زندگی سے زیادہ جس قدر ذہنی زندگی بسر کی ہے اس کا لحاظ کسے ہوگا؟"[۲۰]

"ذہنی زندگی" کی بات کر کے اسی خط میں میراجی جو کچھ لکھتے ہیں اس سے سارے سماجی و فکری نظام کے خلاف بغاوت کا پہلو واضح طور پر اُجاگر ہوتا ہے:

"افسوس یہ بھی ایک سوال ہے اور سوال بھکاری کی دوسری عادت۔ کیا میں کبھی اس قابل نہ ہو سکوں گا کہ سوال کے بجائے اپنے آپ کو فیصلے کا اہل ثابت کر سکوں۔ ہر عزیز ترین چیز کے نام پر کہتا ہوں کہ یہ احساس کمتری نہیں، یہ وہی "جزئیات بینی" ہے جس نے میرے احساسات اور خیالات کو تو نفیس بنایا لیکن جو میرے واقعاتِ روزمرہ کو دنیا کی نظر میں نفیس نہ بنا سکے۔ میں دنوں، مہینوں بلکہ بعض دفعہ ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ سال تک نہیں نہایا کرتا۔ دُنیا کو یہ بات بری معلوم ہوتی ہے اور میں اسے سمجھتا ہوں ۔ میرے کپڑے اکثر میلے دکھائی دیتے ہیں۔ دُنیا بُرا مانتی ہے، میں جانتا ہوں ... بعض دفعہ خالی پیٹ زیادہ شراب پینے سے صبح مجھے اپنا بستر خود گیلا محسوس ہوتا ہے تو میں اپنی زندگی کے اونچ نیچ کے ساتھ یہ بھی سوچ سکتا ہوں کہ اس حالت کے دیکھنے والے چاہے میرے دوست یا خیر خواہ ہوں یا کوئی اور، ان کی طبیعت منغض ہوگی ۔ مگر یہ بات، سوچنے کے باوجود اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس تمام صورت حال، اس سماج، اس نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ زیادہ تر لوگ مجھے خود غرض دکھائی دیتے ہیں۔"[۲۱]

اس اقتباس سے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ میراجی جو کچھ کر رہے تھے یا جو کچھ انھوں نے کیا وہ بے خبری میں نہیں بلکہ شعور کی سطح پر کیا ہے۔ بڑے سوال یعنی نظام حیات و کائنات کا مقصد کیا ہے؟ انھیں پریشان کر رہے تھے۔ اپنے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ہرگز ان کا مسئلہ نہیں تھا وہ یہ بتانا چاہتے تھے کہ یہ نظام جس کے خلاف وہ احتجاج اور بغاوت

کر رہے ہیں وہ نظام نہیں ہے کہ جہاں وہ سوال کے بجائے اپنے آپ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ وہ زندگی کی بے معنویت کو ظاہر کر کے دنیا کو تبدیل کرنے کا احساس دلانا چاہتے تھے۔ وہ اس شعور کو جوان کے اندر تھا معاشرے کا حصہ بنا دینا چاہتے تھے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن جسے روایت و معاشرہ کے خلاف بغاوت کر کے میراجی نے جرآت کے ساتھ کر دکھایا ـــــ فرزانوں کی اس دنیا میں دیوانوں کی بات سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ وہ اس دور میں نئی نسل کے جذبات و احساسات، خیالات و حالات کی نمائندگی کر رہے تھے۔ اس طور پر ترجمانی و نمائندگی کسی دوسرے ادیب، شاعر، دانشور نے نہیں کی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہ خود تو ساری عمر دُکھ بھوگتے رہے، ذلیل و خوار ہوتے رہے، لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنے رہے لیکن انھوں نے معاشرتی شعور پیدا کرنے میں وہ کام کیا کہ اس سطح پر شاید ہم کوئی دوسرا نام نہیں لے سکتے۔ نوجوان نسل ہی ان کی توجہ کا مرکز تھی۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ایک چھوٹا سا اقتباس میراجی کے الفاظ میں اور سُن لیجیے:

> "موجودہ صدی کی بین الاقوامی کش مکش (سیاسی، سماجی اور اقتصادی) نے جو انتشار نوجوانوں میں پیدا کر دیا ہے وہ بالخصوص میرا مرکزِ نظر رہا اور آگے چل کر جدید نفسیات نے اس تمام پریشاں خیالی کو جنسی رنگ دیدیا... ویشنو خیالات نے نہ صرف مذہبی لحاظ سے اپنا نقش چھوڑا بلکہ اس کی ادبی روایات بھی کچھ اس انداز سے بروئے کار آئیں کہ دل و دماغ ایک جیتا جاگتا برندابن بن کر رہ گیا"۔[۲۲]

اس اقتباس میں میراجی اپنے تخلیقی سفر کا راستہ بتا رہے ہیں۔ اس صدی کی بین الاقوامی کش مکش نے سیاسی، سماجی اور اقتصادی سطح پر نوجوانوں کو انتشار کا شکار کر دیا۔ یہ ان کا مرکزِ نظر ہے۔ جدید نفسیات نے اس پریشاں خیالی کو جنس کا رنگ دیدیا اور اس رنگ سے میراجی نے جیتا جاگتا برندابن آباد کر لیا۔ یہ ان کے نئے سفر کی پہلی منزل تھی جس پر چل کر وہ نئے طرزِ احساس، نئے انسان اور نئی شاعری کو جنم دینا چاہتے تھے:

رات اندھیری بن ہے سونا کوئی نہیں ہے ساتھ
پون جھکولے پیڑ ہلائیں، تھر تھر کانپیں پات
دل میں ڈر کا تیر چُبھا ہے سینے پر ہے ہاتھ
رہ رہ کر سوچوں یوں کیسے پوری ہو گی رات؟

. . . .

. . . .

کیسے اپنے دل سے مٹاؤں برہ اگن کا روگ
کیسے سجھاؤں پریم پہیلی کیسے کروں سنجوگ
بات کی گھڑیاں بیت نہ جائیں دُور ہے اس کا دیس
دور دیس ہے پیتم کا اور میں بدلے ہوں بھیس [۲۳]

بھیس بدل کر میرآجی دور دیس کے سفر پر روانہ ہوئے تو انھوں نے غزل سمیت شاعری کی اُن تمام اصناف کو ترک کر دیا جن سے معاشرہ مانوس تھا۔ بحور و اوزان کے سارے مروجہ نظام کو بھی توڑ دیا۔ (بحور و اوزان کے تعلق سے میرآجی کی شاعری کے ایک الگ مطالعہ کی ضرورت ہے) نئی ہیئت اور شعری پیکر کا نظام انیسویں صدی کی جدید مغربی شاعری سے لیا اور آزادی کے اس احساس کے ساتھ حقیقت واحساس کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔ گیت اور آزاد نظم، نئی نئی ہیئتوں کے ساتھ وہ نئی اصنافِ سخن تھیں جن سے میرآجی نے اپنی نئی شاعری کا بندرابن آباد کیا۔ اس حقیقت واحساس میں جھوٹی اخلاقیات کو توڑنے کا جذبہ بھی شامل تھا اور جدید نفسیات سے زندگی میں جنسی پہلو کی بنیادی اہمیت کا شعور بھی شامل تھا۔ ہماری شاعری نے اس پہلو کو اب تک نظر انداز کر کے رسمی اخلاقیات کا ساتھ دیا تھا۔ میرآجی نے اسے بھی توڑ دیا۔ اس نئے بندرابن سے لفظیات کی نئی دُنیا آباد ہوئی۔ رموز و کنایات، تلمیحات و علامات بھی نئے آئے اور یہ سب چیزیں نئی ہیئت اور آزاد نظم کے جھٹے میں کِھل اُٹھیں۔ اس سے طرز و اسلوب، زبان و بیان سب بدل گئے، نئی سچائیوں اور نئی حقیقتوں کے اظہار نے شعر کی گرفت کو مضبوط کر دیا۔ یہ یقیناً وہ شاعری نہیں

تھی، اردو شاعری کے قارئین جس کے عادی تھے۔ بودلیئر اور ملارمے سے ملاقات اور شعری پیکروں کے استعمال کا جو شعور میراجی نے حاصل کیا تھا اسے نئی اردو شاعری کے قالب میں ڈھال دیا اور انسان کی داخلی دنیا کی بے باک خواہشات اور ننگی، سچی، حقیقی تصویروں کو اپنی شاعری میں جرآت رندانہ کے ساتھ اُجاگر کر دیا۔ اسی کے ساتھ نئی نظم داخلی جذبات اور نفسیاتی حقیقتوں کا اظہار بن گئی۔ مغربی طرز احساس کا اپنے تہذیبی طرز احساس کے ساتھ تخلیقی سطح پر جو امتزاج میراجی نے کر دکھایا وہ اتنا مشکل اور بڑا کام تھا کہ یہ کام کسی اور سے نہیں ہوا۔ فیض نے یہ کام نہیں کیا۔ راشد نے بھی یہ کام نہیں کیا۔ ان کا تعلق غزل کی روایت سے کسی نہ کسی شکل میں باقی رہتا ہے اور "ماورا" کی شاعری میں تو اختر شیرانی اور اردو غزل و شاعری کا عکس و اثر بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اسی امتزاج، نئی ہیئت نئے شعور، شاعری، نئے موضوعات، نئی علامات اور لفظیات نے میراجی کی شاعری میں ابہام کو جنم دیا۔ جب ہر چیز نئی ہو، جب دو طرز احساس تخلیقی سطح پر شیر و شکر ہو رہے ہوں، جب نئی ہیئت میں قدیم طرز احساس یا قدیم ہیئت میں نیا طرز احساس نمودار ہو رہا ہو تو ابہام ایک فطری عمل ہے۔ جب میراجی نے شاعری شروع کی تھی تو یہ ابہام بہت گہرا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ عام شعور کا حصہ بنتا گیا ابہام کا رنگ بھی ہلکا پڑتا گیا اور آج جب ہم اس شاعری کو پڑھتے ہیں تو یہ زیادہ رواں، صاف اور پُراثر نظر آتی ہے۔ آج اس رنگ نے نئی نسلوں کی شاعری میں اُتر کر اپنی اجنبیت دُور کر دی ہے۔

اس ابہام کی ایک اور وجہ یہ ہے کہ جنس ان کے اس پہلے سفر کی شاعری کا نمایاں پہلو ہے۔ میراجی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "میری نظموں کا نمایاں پہلو ان کی جنسی حیثیت ہے۔ جنس کے بارے میں یہ بات واضح رہے کہ جنس ابہام کے پردوں میں چھپ کر ہی جمالیاتی سطح کو چھو سکتی ہے۔ میراجی نے جب شاعری کا آغاز کیا تو اس وقت جنس کی بات کرنا مروجہ اخلاقیات کی سطح پر ایک ناپسندیدہ فعل تھا۔ اردو شاعری میں محبوب اس لیے بھی مذکر تھا کہ پردہ نشین محبوب کے پردہ کا پورا خیال رکھا جائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اردو شاعری کا

محبوب کہاروں کے کاندھوں پر ڈولی میں سفر کرتا تھا۔ اسی زمانے میں اختر شیرانی نے پہلی بار عورت کا نام لے کر اظہارِ عشق کیا۔ بدلے ہوئے مزاج کی صدی میں یہ ایک نیا اندازِ سخن تھا۔ سلمیٰ اور ریحانہ کے ساتھ اختر شیرانی کی شاعری بھی شہرت کے بام پر چڑھ گئی لیکن غور سے دیکھیے تو اختر شیرانی کے ہاں بھی محبوب کا صرف نام ہی لیا گیا تھا۔ جنس اس کا موضوع ہی نہیں تھا۔ میراجی نے نہ صرف عورت کو بلکہ جنس کو اردو شاعری میں داخل کیا اور ہمارے شعور کا حصہ بنا دیا۔ انھوں نے اعلان کیا کہ

"جنسی فعل اور اس کے متعلقات کو میں قدرت کی بڑی نعمت سمجھتا ہوں اور جنس کے گرد جو آلودگی تہذیب و تمدن نے جمع کر رکھی ہے وہ مجھے ناگوار گذرتی ہے اس لیے ردعمل کے طور پر میں دنیا کی ہر بات کو جنس کے اس تصور کے آئینے میں دیکھتا ہوں جو فطرت کے عین مطابق ہے اور ــــ جو میرا آدرش ہے"[۲۵]

یہاں دو لفظ "ردعمل" اور "آدرش" قابلِ توجہ ہیں۔ ردعمل سماج اور اس کی اقدار کے خلاف اور پھر علمِ بغاوت بلند کر کے اس اظہار کو اپنا آدرش بنانا۔ اس سفر میں میراجی نے ہندی شاعری کی طرف رجوع کیا جہاں اظہارِ عشق عورت کرتی ہے۔ جہاں ایک طرف کرشن مراری اور گوپیوں کی جمالیاتی و جنسی روایت موجود تھی اور ساتھ ساتھ بارہ ماسہ کی روایت بھی موجود تھی۔ جہاں موسموں کے تعلق سے فطری جنسی اضطراب اور تقاضوں کا اظہار کر کے پیا کو یاد کیا جاتا ہے۔ یہ سفر اور یہ موضوع زندگی کے وسیع داخلی رشتوں کے حوالے سے ایک نیا سفر تھا۔ میراجی جب اس راستے پر چلے تو ایک طرف اختر شیرانی کی شاعری فضا میں تحلیل ہو گئی اور جنس میراجی کی انفرادیت بن کر ان کی شاعرانہ شہرت کا نشان بن گئی۔ اسی لیے میراجی نے علامات، تلمیحات و کنایات ہندوی شاعری سے لے کر اسے اردو شاعری کی روایت میں جذب کر دیا اور جنس کو ابہام کے لطیف پردوں میں چھپا کر ایسی شاعری کی جیسی کہ وہ ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب انگارے شائع ہوا جس میں جنس کو موضوع بنایا گیا تھا اور معاشرے نے نثر میں یہ بے باکی و "گستاخی" دیکھ کر اسے ضبط کر لیا تھا۔ ابہام

کے پردوں میں چھپی ہوئی میراجی کی شاعری کو ضبط کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس پس منظر میں دیکھئے تو میراجی کی شاعری کے معنی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ راشد و فیض کی شاعری کا باقاعدہ سفر بھی اسی زمانے میں شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس موضوع، نئی ہیئت اور آزاد نظم کے شعوری و تخلیقی سطح پر استعمال کے پیش رو میراجی اور صرف میراجی ہیں۔ راشد و فیض اظہار و بیان میں اردو و فارسی روایت سے استفادہ کر کے اپنا رشتہ اس سے قائم رکھتے ہیں لیکن میراجی اس روایت سے بغاوت کر کے ردعمل کے طور پر ہندی شاعری کی روایت سے ناتا جوڑ لیتے ہیں۔ ڈی ایچ لارنس، بودلیئر، ایڈگرایلن پو، ملارمے اور فرائڈ کی جدید نفسیات کو اردو ادب کے مزاج و رنگ میں شامل کر دیتے ہیں۔ منٹو بھی اپنے مخصوص انداز میں اپنے افسانوں مثلاً کالی شلوار، دھواں وغیرہ میں اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔ عصمت چغتائی کا افسانہ لحاف، حسن عسکری کا افسانہ پھسلن بھی اپنے طور پر یہی کام کرتا ہے لیکن میراجی کا کام ان سب سے بڑا تھا۔ اس سلسلے میں خاص طور پر آپ ان کی نظمیں: دکھ دل کا دارو، سرگوشیاں، سنجوگ، سرسراہٹ، دور و نزدیک، ایک تصویر، تن آسانی، لب جوئبارے، سنگ آستاں، افتاد وغیرہ پڑھ لیجیے۔ روزن، کھڑکی، دروازے جنس ہی کے اشارے ہیں۔ میراجی نے اس شاعری سے اردو شاعری کو نئے امکانات سے روشناس کر کے نئے امکانات کے دروازے کھول دیے۔ اسی لیے وہ آج بھی اہم شاعر ہے۔ اس سارے عمل میں انھوں نے اردو شاعری کی روایت سے پورے طور پر ناتا نہیں توڑا بلکہ اسے بدل کر ایک نیا روپ دے دیا۔ روایت کے بدلنے کے عمل میں جب صورت و احساس بدلتے ہیں تو روایت سے دور ہونے یا اس کے ٹوٹنے کا احساس ضرور ہوتا ہے لیکن جب نیا احساس یا نئی ہیئت مروج ہو جاتے ہیں تو پھر روایت کی کرنیں اس میں سے پھوٹنے لگتی ہیں اور وہ روایت ہی کا نیا روپ نظر آنے لگتی ہے۔ میراجی کے ہاں یہی ہوا ہے۔ آپ میراجی کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ نہیں کہہ سکتے کہ آپ اردو شاعری نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ روایتی اردو شاعری سے مختلف شاعری ہے۔ میراجی نے قافیہ کی پابندی بھی کی ہے اور اسے توڑا بھی ہے۔ نظم معریٰ کو بھی استعمال کیا ہے اور

نظمِ آزاد کو بھی۔ ہیئت کے بھی تجربے کیے ہیں اور اظہارِ احساس کے بھی۔ یہ وہ کام ہے جو آگے پیچھے کی دو یا دو سے زیادہ نسلیں کرتی ہیں۔ میراجی نے ایک مختصر سی زندگی میں یہ سارا کام خود کر دکھایا اور ۱۹۴۹ء میں جب وہ مرے تو نئی شاعری مقبول و عام ہو کر نئی نسل کا حصہ بن چکی تھی۔ ۱۹۴۴ء کے قریب ان کا پہلا سفر تکمیل ہو چکا تھا۔ ان کا پہلا مجموعہ "میراجی کی نظمیں" جو اس سفر کی روئداد سناتا ہے، ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا تھا۔

اس سفر میں خود میراجی نے ویرانی اور تنہائی کے علاوہ کچھ نہ پایا۔ اس سفر کو پورا کر کے اب وہ "دوسرے سفر" کی تیاری میں لگ گئے۔ پہلے سفر میں اس سے زیادہ آگے جانے کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ میرے پاس ایک نقشہ ہے جس کی ایک نقل بیدار بخت صاحب نے اخترالایمان سے لے کر مجھے بھجوائی ہے۔ اس نقشے میں میراجی اپنے نئے مجموعے مرتب کرنے پر غور کرتے نظر آتے ہیں اور ان مجموعوں میں وہ کلام شامل کرنا چاہتے ہیں جو ۱۹۴۴ء سے ۱۹۴۷ء تک انھوں نے کہا تھا۔ اس نقشے میں وہ اپنی پہلی نظموں یعنی "میراجی کی نظمیں" پانچ خانوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ خانہ نمبر ا جنسی، خانہ نمبر دو مبہم، خانہ نمبر تین رومانی، خانہ نمبر چار ذاتی اور خانہ نمبر پانچ نام نہاد ترقی پسند۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس تقسیم میں جنسی نظمیں کم و بیش صرف بیس فی صد ہیں۔ "میراجی کی نظمیں" سے بعد کے کلام میں "جنس" پوری زندگی کی اکائی کا جزو لاینفک بن کر نارمل جذبہ بن جاتی ہے اور میراجی کا راستہ نہیں روکتی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے زاویے سے دیکھتے ہیں اور "عمل" کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں۔ عمل تغیر کا مُنادی ہے۔ عمل سماج کو انجماد سے حرکت کی طرف لے جاتا ہے۔ اور بیتے دن رات بن کر میراجی کے سامنے آتے ہیں:

میلے کپڑے کی طرح لٹکی ہوئی تصویریں
بیتے دن رات مرے سامنے لے آتی ہیں

. . . .

بات کیا ہے کہ وہ جیون جس کو
مشعلیں اپنے اجالے ہی سے دکھلاتی تھیں

دھیان کی لہر کے اک نرم جھکولے ہی سے جاگ اٹھا ہے
رات چھائی تھی مگر
رات بھی دن کی طرح نور کو لے آئی ہے[۲۶]

میراجی کی نظم "اجنتا کے غار" نئی قوتِ عمل کا اظہار ہے۔ اسی نظم کے نام سے وہ اپنا نیا مجموعۂ کلام مرتب کرنا چاہتے تھے۔ اس مجموعہ کا دیباچہ بھی انھوں نے لکھنا شروع کیا تھا — اب ویرانی چھٹ جاتی ہے اور امید کی نئی کرن جگمگانے لگتی ہے۔ نظم "ایک منظر" کی یہ چند سطریں دیکھیے۔ میراجی ہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

ابھی اچانک ایک پل میں ایک نوحہ ایک نغمہ بن کے ایسے گونج اٹھے گا
کہ دل کہے گا "میں بھی ہوں"
ابھی اچانک ایک پل میں اس پہاڑ ہی کے پار موت کی گھٹا سمٹ کے جا چھپے گی
اور حیات کی دھنک بھی جگمگائے گی[۲۷]

ان کی ایک اور نظم جس کا عنوان ہی "ایک نظم" ہے اس بات کا اظہار ہے کہ وہ اب سماج سے مل کر ایک ہونے کی گہری تخلیقی خواہش رکھتے ہیں :

ایک نظم

اے پیارے لوگو!
تم دور کیوں ہو ؟
کچھ پاس آؤ،
آؤ کہ پل میں
یہ سب ستارے
تاریکیوں کے
اس پار ہوں گے

اے پیارے لوگو!
میں تم سے مل کر
بہتر بنوں گا،
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے
آنسو بہیں گے
اور کچھ نہ ہوگا
تم پاس آؤ
پھر دیکھ لیں گے
دنیا ہے کیا کچھ
اور دین کیا ہے
پھر جان لیں گے
ہر سانس کیسے
آنکھیں جھپکتے
اَن مِٹ بنا تھا

لیکن محبت
یہ کہہ رہی ہے
ہم دور ہی دور
اور دور ہی دور
چلتے رہیں گے۔ ۲۸ھ

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ آخری بند میں تذبذب موجود ہے۔ نظم "بہاؤ" میں میرا جی زندگی کے آثار چڑھاؤ اور نشیب و فراز کو پیش کر کے زندگی کی گھمبیرتا کو واضح کرتے ہیں۔ یہاں بھی قوتِ عمل اپنا اظہار اور موت پہ زندگی کے غالب آنے کی خواہش کا اظہار کر رہی ہے :

گذرتی رہی زندگی جس طرح
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے
جب آئے تو کاش آئے موت اس طرح
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے

میں اک پل میں اس کا گلا گھونٹ کر
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے
بڑھوں گا اسے چھوڑ کر پُشت پر
گھسٹتے ہوئے رینگتے رینگتے [۲۹]

دریا سے مل کر ساگر بننے کی خواہش بھی اسی نئے احساس کا اظہار ہے جس کا اظہار نظم "پردہ" میں ہوا ہے :

پھر ساگر میں مل جاتے ہم
اور مل کر دھوم مچاتے ہم
یہ گیت ہمیشہ گاتے ہم
"سب گیانی ہی انجان رہے"
لیکن کیا ہو
جب ایسا ہو
ہم اور دیس تم اور دیس [۳۰]

"تنہائی ایک دل چسپ نظم ہے جس میں وہ سکون سے ہنگامے کی طرف جانا چاہتے ہیں۔

سکون انجماد ہے اور ہنگامہ عمل حیات ہے:

سکوں دور ہو جائے، ہنگامہ پیدا ہو، ہنگامہ شورِ مجسّم بنے
سامنے آئے، پل میں سکوں دور ہو جائے لیکن
مرے دل کے گہرے سکوں میں ہوا سرسرانے لگی ہے [۳۱]

نظم "یگانگت" میں میرا جی کے ہاں یہ احساس جاگتا ہے کہ جو شے اکیلی رہے اس کی منزل فنا ہی فنا:

زمانہ ہوں میں، میرے ہی دم سے اَن مٹ تسلسل کا جھولا رواں ہے،
مگر مجھ میں کوئی برائی نہیں ہے
یہ کیسے کہوں میں
کہ مجھ میں فنا اور بقا دونوں آکر ملے ہیں [۳۲]

یہ میرا جی کا سفرِ واپسی تھا جو ۱۹۴۴ء میں شروع ہوا اور ۱۹۴۸ء تک جاری رہا اور انھوں نے اپنی وضع کردہ نئی روایتِ شعری کو اُردو شاعری کی روایت کے ساگر سے ملا دیا، لیکن اس تخلیقی سفر میں وہ نڈھال ہو چکے تھے۔ دُکھ بھوگتے بھوگتے، گھسٹتے گھسٹتے رینگتے رینگتے، "اسپتال میں انھوں نے ایک نرس کی کلائی چبا ڈالی۔ جب میرا جی کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تو انھوں نے کہا کہ وہ ایسا علاج پسند نہیں کرتے جس سے ان کے "کومپلیکسیز" Complexes ختم ہو جائیں اور جو کچھ لکھنا چاہتے ہیں وہ نہ لکھ سکیں۔"[۳۳] تخلیق، تخلیق۔ یہی میرا جی کا آدرش تھا۔ ساری عمر وہ اسی کے حصول میں لگے رہے اور اردو شاعری کو نئی ہیئت، نئے موضوعات، نئے جذبے، نئے احساسات سے مالا مال اور اسے جدید دور میں داخل کرکے بمبئی کے ایک اسپتال میں مر گئے۔ راشد نے میرا جی کی وفات کے تقریباً بیس سال بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میرا جی اس زمانے کے سب سے قابلِ ذکر، سب سے زیادہ جدّت پرست، سب سے زیادہ زرخیز ذہن کے مالک اور سب سے منفرد شاعر تھے۔[۳۴] میں نے آج کی گفتگو میں اسی میرا جی کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

حوالے

۱۔ مشرق و مغرب کے نغمے، میراجی، اکادمی پنجاب (ٹرسٹ) لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۸۔

۲۔ "میراجی"، خلیل صحافی، فنون لاہور، اکتوبر ۱۹۶۵ء، ص ۱۹۵—۲۰۰

۳۔ "تین گولے" سعادت حسن منٹو، "گنجے فرشتے" مکتبہ جدید لاہور

۴۔ میراجی ایک تصویر، الطاف گوہر، "تحریریں چند"، اسلام آباد ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۵

۵۔ میراجی کی شخصیت، ایضاً، ص ۱۱۴

۶۔ میراجی کو سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر جمیل جالبی، تنقید اور تجربہ، مشتاق بک ڈپو کراچی ۱۹۶۷ء اور نیا دور کراچی شمارہ، ۴۱-۴۲۔

۷۔ دیباچہ "اس نظم میں"، میراجی، ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۴۴ء، ص ۱۱

۸ مشرق و مغرب کے نغمے، میراجی، ص ۱۶۲

۹ میراجی، اخلاق احمد دہلوی، پھر وہی بیان اپنا، مکتبہ عالیہ، لاہور ۱۹۷۹ء، ص ۱۷۵۔

۱۰ مشرق و مغرب کے نغمے، ص ۱۷۳

۱۱ "شعر و حکمت" مرتبہ ڈاکٹر مغنی تبسم حیدر آباد دکن، ۱۹۸۸ء، ص ۹۴-۹۵

۱۲ ایضاً، ص ۱۰۶۔

۱۳ ایضاً، ص ۲۳۰۔

۱۴ ایضاً، ص ۲۳۲۔

۱۵ ایضاً، ص ۲۴۰۔

۱۶ ایضاً، ص ۲۴۱۔

۱۷ میراجی کو سمجھنے کے لیے، ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید اور تجربہ، ص ۲۴۰

۱۸ کلیاتِ میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء، ص ۱۰۸۔

۱۹ میراجی کی نظمیں، میراجی، ساقی بک ڈپو، دہلی ۱۹۴۴ء، ص ۱۲

۲۰ شعر و حکمت، ص ۱۰۲

۲۱ ایضاً، ص ۱۰۳

۲۲ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری، ساقی بک ڈپو دہلی ۱۹۴۴ء

۲۳ کلیاتِ میراجی، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، اردو مرکز لندن ۱۹۸۸ء، ص ۴۳-۴۴-

۲۴ میری بہترین نظم مرتبہ محمد حسن عسکری

۲۵ میراجی کی نظمیں، میراجی، ساقی بک ڈپو ۱۹۴۴ء، ص ۱۴- ۱۵-

۲۶ کلیاتِ میراجی، "اجنتا کے غار" ص ۱۸۸-۱۸۹-

۲۷ ایضاً، ص ۱۹۵- ۱۹۶-

۲۸ ایضاً، ص ۱۹۷- ۱۹۸-

۲۹ ایضاً، ص ۲۰۱- ۲۰۲ -

۳۰ ایضاً، ص ۲۰۵- ۲۰۶ -

۳۱ ایضاً، ص ۲۰۹- ۲۱۰-

۳۲ ایضاً، ص ۲۲۷- ۲۲۸

۳۳ میراجی کے ساتھ ایک شام، انٹرویو اختر الایمان مرتبہ تصدق سہارنوی، مطبوعہ شب خون، الہ آباد، دسمبر ۱۹۷۱ء شمارہ ۶۷، ص ۵۷ -

۳۴ ایضاً، ص ۵۵ -

حسن عسکری کے افسانے

محمد حسن عسکری کو پہلی بار میں نے اس وقت دیکھا جب وہ عارضی طور پر انگریزی پڑھانے کے لیے میرٹھ کالج آئے تھے۔ شیروانی پہنے ہوئے۔ پان کی لالی سے ہونٹ رچے ہوئے، ہاتھ میں کتابیں، آنکھوں پر عینک، اونچی پیشانی، تیل سے جمے ہوئے بال اور مانگ نکلی ہوئی، گیہواں رنگ، چمکتی روشن آنکھیں، چہرے پر سنجیدگی، چھریرا بدن، دبلے پتلے، خاموش، کھوئے کھوئے سے۔ اپنے خیالات میں مگن۔ آہستہ آہستہ کلاس سے نکل کر اساتذہ کے کمرے کی طرف جا رہے تھے۔ کسی نے بتایا کہ یہ حسن عسکری ہیں۔ میں نے پوچھا وہی عسکری صاحب جن کے افسانے ساقی، ادب لطیف اور ادبی دنیا میں شائع ہوتے ہیں اور وہ جو ہر مہینے "ساقی" میں "جھلکیاں" لکھتے ہیں۔ بتانے والے نے کہا یہ تو معلوم نہیں البتہ یہ مشہور ادیب ہیں۔ میں نے انھیں حیرت و حسرت سے دیکھا۔ یہ ۱۹۴۵ء کی بات ہے۔ میں تھرڈ ائر کا طالب علم تھا۔ شوقِ ادب زندگی کا محور تھا اور ادیب بننے کا خواب زندگی کی تعبیر تھی۔ عسکری صاحب کو دیکھ کر یوں محسوس ہوا کہ ادیب کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ ان کے آنے سے میرٹھ میں چہل پہل سی ہوگئی۔ دائرۂ ادبیہ کی نشستوں میں گرمی آگئی۔ جیسے جیسے وقت گذرا عسکری صاحب سے تعلقات بڑھنے لگے۔ کالج میں ڈاکٹر شوکت سبزواری بھی پڑھاتے تھے اور پروفیسر کرار حسین اور پروفیسر غیور احمد رزمی بھی۔ صفدر حسین ایم اے کر چکے تھے۔ قیصر زیدی اُن سے بھی پہلے تعلیم سے فارغ ہو چکے تھے۔ انتظار حسین ایم اے کے آخری سال میں اور سلیم احمد ایف اے میں پڑھ رہے تھے۔ احمد ہمدانی بھی کالج میں تھے۔ عسکری صاحب فرسٹ ائیر کی کلاس لیتے تھے جو بہت بڑی تھی۔ ان کی آواز پتلی اور پڑھانے کا بھی شاید پہلا تجربہ تھا۔ لڑکے طرح طرح کی شرارتیں کرتے۔ شور مچاتے اور وہ سب کچھ کرتے جو انھیں نہیں

کرنا چاہیے۔ ہم سب نے طے کیا کہ جب عسکری صاحب کلاس میں جائیں تو ہم سب مختلف دروازوں پر کھڑے رہیں اور کچھ اندر جاکر بیٹھ جائیں تاکہ اُن کی اخلاقی مدد کی جاسکے۔ کچھ ہفتے اسی طرح گذرے اور پھر فخر الاسلام صاحب واپس آگئے جن کی عوضی پر عسکری صاحب کام کر رہے تھے۔ عسکری صاحب کالج سے تو الگ ہو گئے لیکن میرٹھ ہی میں رہے۔ محلہ مشائخان میں ان کا قیام تھا۔

۱۹۴۶–۱۹۴۷ء میں عسکری صاحب نے پروفیسر احتشام حسین کے ایما پر اردو تحریک کی تیاری کی۔ رسیدیں چھپیں، چندہ جمع ہوا لیکن ابھی جلسے کا پروگرام بن ہی رہا تھا کہ گڑھ مکتیشر میں ہندو مسلم فسادات ہو گئے۔ بہار، کلکتہ اور دہلی کے فسادات نے سارے برعظیم کی صورتِ حال کو بدل کر رکھ دیا اور پنجاب کے فسادات نے رہی سہی کسر کو پورا کر دیا۔ پاکستان زندہ باد کے نعرے اب بہت قریب سے سنائی دینے لگے تھے۔ اسی زمانے میں عسکری صاحب نے اپنا ایک مضمون "میرجی" دائرۂ ادبیہ میں پڑھا۔ یہ آخری نشست تھی جس میں میں شریک تھا۔ مضمون کے بعد بحث کا آغاز ہوا۔ پروفیسر شوکت سبزواری مناظرہ کے ماہر اور سارے شہر میں منطقی مشہور تھے۔ انھوں نے تابڑ توڑ عسکری صاحب کے مضمون پر اعتراضات کیے اور عسکری صاحب کو اس طور پر گھیرا کہ نکلنا مشکل ہو گیا۔ عسکری صاحب کچھ دیر تو بحث میں شریک رہے۔ آخر میں زچ آکر کہنے لگے "سبزواری صاحب! آپ سے بحث کرنے سے بہتر تو یہ ہے کہ آدمی مانجھا سُوتے"۔

۱۹۴۷ء کے اوائل میں عسکری صاحب نے ایک افسانہ لکھا۔ اس کا ذکر وہ کئی ہفتے سے کر رہے تھے۔ ہم نے کئی بار عسکری صاحب سے افسانہ سنانے کی فرمائش کی لیکن وہ ہر بار طرح دے گئے۔ یہ وہی افسانہ تھا جو اسی سال، دو اور افسانوں کے ساتھ، "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" کے نام سے کتابی صورت میں ساقی بک ڈپو سے شائع ہوا۔ اس وقت تقسیمِ ہند کا اعلان ہو چکا تھا اور فسادات کی آگ چاروں طرف بھڑک رہی تھی۔ یہ کتاب بھی فسادات کا شکار ہو گئی۔ چند کاپیاں پاکستان ضرور پہنچیں اور ختم ہو گئیں۔ "قیامت ہمرکاب آئے نہ آئے" عسکری صاحب کا آخری افسانہ تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں وہ پاکستان آگئے اور لاہور میں ٹک گئے۔ اس کے بعد انھوں نے کوئی افسانہ نہیں لکھا۔ وہ از سرتاپا پاکستانی فکر کے حامل تھے جس کا اندازہ اُن خطوط سے بھی کیا جا سکتا ہے جو انھوں نے ڈاکٹر آفتاب احمد خان اور صمد شاہین و ممتاز شیریں کے نام لکھے اور جو اب "تخلیقی ادب" اور نیا دور کراچی میں شائع ہو چکے ہیں۔

عسکری صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "شاید میری فطرت کے آریائی اور سامی عناصر ایک دوسرے سے متصادم ہو رہے ہیں۔ ایک طرح سے یہ جنگ آج کل پوری دنیا میں جاری ہے لیکن "آذری" کا زمانہ آنے تک کلچر کی حفاظت کے لیے شاید سامیت ہی کچھ زیادہ مفید ہے۔ ادب میں بھی" (اختتامیہ، جزیرے ص ۲۰۷) پاکستان آکر عسکری صاحب نے اسی فکر کو آگے بڑھایا۔ پاکستانی ادب کی شناخت کی بحث اسی اندازِ نظر کا نتیجہ تھی اور اس کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں سامیت کا عنصر بڑھتا اور گہرا ہوتا گیا اور وہ افسانہ نگاری سے دور اور فکر و خیال سے قریب تر ہوتے چلے گئے۔

حسن عسکری کے افسانوں کی کل تعداد گیارہ ہے۔ آٹھ افسانے "جزیرے" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں ساقی بک ڈپو دہلی سے شائع ہوئے جس میں ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۳ء تک کے افسانے شامل ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں اُن کا دوسرا مجموعہ "قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے" کے نام سے شائع ہوا جس میں تین افسانے شامل ہیں۔ "ذکرِ انور" اور "کٹھپتلیوں کے دام" ۱۹۴۳ء میں لکھے گئے اور تقریباً سوا تین سال بعد ان کا آخری افسانہ لکھا گیا جس کے نام پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ گویا ستمبر ۱۹۳۹ء سے فروری ۱۹۴۷ء تک تقریباً ساڑھے سات سال کا عرصہ حسن عسکری کی تخلیقی زندگی کا افسانوی دور ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۷ء سے وفات (۱۹۷۷ء) تک، کوئی افسانہ نہ لکھنے کے باوجود، اُن کے افسانوں کے حوالے اور ان کا ذکر مختلف مضامین میں آتا رہا اور عسکری بحیثیت افسانہ نگار ہمیشہ قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے رہے۔ ان کے افسانے جدید اردو افسانے کی تاریخ کا ناگزیر حصہ ہیں۔ "شعور کی رو" وہ بنیادی تکنیک

ہے جسے عسکری نے نہ صرف متعارف کرایا بلکہ نہایت خوبی سے نبھا کر اردو فکشن کے لیے نیا راستہ کھولا اور اردو افسانے کو مغرب کے افسانے کے دائرے میں داخل کر دیا۔ "حرامجادی" (۱۹۴۰ء) اور "چائے کی پیالی" (۱۹۴۱ء) اس تکنیک کی بہترین مثال ہیں۔ ۱۹۴۰ء کو سامنے رکھ کر اس کے بعد افسانے اور فکشن کو دیکھیے تو آپ کو اس تکنیک کے واضح اثرات نظر آئیں گے۔ اردو افسانہ میں حسن عسکری کی یہی تاریخی و تخلیقی اہمیت ہے۔

عسکری کے افسانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان میں پلاٹ نہیں ہوتا لیکن داخلی و خارجی کیفیات کا حقیقت پسندانہ جزئیاتی اظہار ایسے توازن سے شیر و شکر ہو جاتا ہے کہ "پلاٹ" نہ ہوتے ہوئے بھی "کہانی" پورے خد و خال کے ساتھ ابھر کر قاری کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ اسی کے ساتھ تنہائی کا احساس، نفسیاتی کش مکش اور جنسیت کا فطری اظہار ایک طرف افسانے کی فضا میں رنگ بھرتا ہے اور دوسری طرف ان کرداروں کو ابھارتا اور نمایاں کرتا ہے جن کے ارد گرد افسانے کا تار و پود بُنا گیا ہے۔ اسی لیے "حرام جادی" کی ایکلی اور "چائے کی پیالی" کی ڈولی ہمارے ذہن پر نقش ہو جاتے ہیں۔

حسن عسکری کے افسانوں کے اسلوب میں حقیقت نگاری، اشاریت اور تخیل سب کچھ ایک ساتھ ملے جلے ہوتے ہیں۔ یہ روایتی معنی میں رواں اسلوب نہیں ہے بلکہ ایک آہستہ رَو اسلوب ہے جس میں توازن بھی ہے اور ٹھہراؤ اور ضبط بھی۔ پہلی نظر میں یہ کھُردرا اور خشک سا دکھائی دیتا ہے لیکن دراصل یہ اس مخصوص تکنیک کے فنی تقاضوں کے لحاظ سے یکتا اسلوب ہے۔ اس میں زبان و بیان، روزمرہ، تلفظ و لہجہ بھی وہی استعمال کیا گیا ہے جو اُس کردار کی پوری طرح ترجمانی کر سکے۔

حسن عسکری نے "جزیرے" کے اختتامیہ میں لکھا ہے کہ "اب اردو ادب کو تخلیق سے زیادہ تنقید کی ضرورت ہے" اور یہ بھی لکھا ہے کہ تخلیق اور تنقید جہاں مل کر ایک ہو جاتی ہیں وہ کیری کیچر اور پیروڈی ہے۔ تخلیق اور تنقید کے اس اتحاد کی ایک مثال ان کا "افسانہ" "میلاد شریف" ہے۔ "گٹھلیوں کے دام" کو بھی اسی ذیل میں رکھا جا سکتا ہے اور

دوسری بہتر مثال "ذکرا نور" ہے۔ پیروڈی کا وہ راستہ جو حسن عسکری نے ۱۹۴۳ء میں دکھایا تھا آج بھی اسی طرح کھلا ہے اور کسی ایسے نئے ذہن کا منتظر ہے جو تخلیق اور تنقید کو ملا کر پیروڈی کی سطح پر ایک کر سکے۔

حسن عسکری کے افسانوں کے دونوں مجموعے گذشتہ چالیس سال سے کم یاب بلکہ نایاب تھے۔ اردو ادب کی نئی نسل ان افسانوں کی تاریخی اہمیت اور گہرے فنی اثرات سے کم و بیش ناواقف ہے۔ اب جو یہ افسانے "محمد حسن عسکری کے افسانے" کے نام سے چھپ کر دوبارہ سامنے آرہے ہیں میرا خیال ہے کہ اردو افسانے کے تعلق سے حسن عسکری کی تاریخی خدمات کا دوبارہ چرچا ہوگا اور ہمارے نئے افسانہ نگار یہ بھی دیکھیں گے کہ تنقیدی شعور سے جدید اردو افسانے کو کاٹ کر ہم نے "علامت" کو کیسی گہری کھائی میں دھکیل دیا ہے۔ حسن عسکری کے افسانے اس کھائی سے نکلنے میں ہماری مدد کریں گے۔

(۲۰ر مئی ۱۹۸۷ء)

افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی

جناب ابوالفضل صدیقی اردو زبان کے وہ ممتاز افسانہ نگار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی لیکن اس دعوے کے باوجود ان کا تذکرہ عام تنقیدی مضامین میں اتنا کم آتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی کہانیاں عام طور پر طویل یا مختصر طویل ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے افسانے برصغیر پاک و ہند کے رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں اور ان کا صرف ایک حصہ چار مجموعوں کی صورت میں شائع ہوا ہے۔ ایک مجموعہ "اہرام" کے نام سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا تھا اور اس کے ۴۳ سال بعد ان کے ایک ساتھ تین مجموعے "آئینہ"، "انصاف" اور "جوالامکھ" کے نام سے اواخر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئے۔ ان تینوں مجموعوں کے صفحات کی تعداد تو ۷۸۰ ہے لیکن ان میں صرف چودہ افسانے شامل ہیں جب کہ ابوالفضل صدیقی نے کم و بیش دو سو سے زیادہ افسانے لکھے ہیں۔ ایک ناول "تعزیر" کے نام سے ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا "سرور" کے نام سے ۱۹۵۶ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ اس میں کتابت کی اس قدر غلطیاں تھیں کہ اسے پڑھنا آسان نہیں تھا۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ان کے افسانوں کا ایک اور مجموعہ "چار ناولٹ" کے نام سے شائع ہوا جس میں اردو ادب کی چار شاہکار کہانیاں شامل تھیں۔ یہ مجموعہ بھی اب کم یاب ہے۔ ان کے افسانے "چڑھتا سورج" کو ہم دنیا کی عظیم کہانیوں میں شمار کر سکتے ہیں۔ اس پر ابوالفضل صدیقی کو یونیسکو کا بین الاقوامی انعام بھی ملا۔ ۱۹۸۳ء میں ان کے افسانے "گل زمین کی تلاش میں" کو "نقوش صدارتی ایوارڈ" ملا۔ ان کا ناول "ترنگ" جس کی چھ قسطیں نیا دور کراچی میں آج سے آٹھ دس سال پہلے شائع اور مقبول ہوئیں، ابھی زیر طبع ہے۔ یہ ضخیم ناول نسلوں کے موضوع پر

لکھا گیا ہے اور میرا خیال ہے کہ اُردو میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس طرح اگر دیکھا جائے تو ابوالفضل صدیقی کی بمشکل دس فی صد تحریریں کتابی صورت میں شائع ہوئی ہیں اور نوے فی صد تحریریں یا تو مختلف رسائل کی زینت ہیں یا ابھی غیر مطبوعہ ہیں۔ غیر مطبوعہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب خط شکستہ میں لکھتے ہیں اور ان کا مسودہ نئی نسل کے بے علم کاتب عام طور پر پڑھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اسی لیے ان کی اشاعت مدیرانِ کرام کے لیے ایک لاینحل مسئلہ بن کر رہ گئی ہے۔ اگر ابوالفضل صدیقی کی سب تحریریں یکجا ہو کر سامنے آجائیں تو آپ سب حضرات میرے اس جملے سے اتفاق کریں گے جس سے میں نے اپنی بات کا آغاز کیا تھا۔

ابوالفضل صدیقی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے وہ جاگیردارانہ ماحول تھا جس کا اپنا نظام صدیوں سے برصغیر میں رائج تھا۔ راجہ اور رعیت کا یہ اٹوٹ رشتہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا۔ زمیندار و جاگیردار اس کے نمائندے تھے۔ یہی ماحول ابوالفضل صدیقی کے ہاں پورے شعور اور پورے رچاؤ کے ساتھ اس طور پر آیا ہے کہ ان کے افسانوں میں یہ زندگی پوری طرح چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی نظر آتی ہے۔ اپنی کہانیوں میں انھوں نے ایسے زندہ کردار پیش کیے ہیں کہ یہ کام بہت کم افسانہ نگاروں نے اس انداز سے کیا ہے۔ ابوالفضل صدیقی صاحب کی اگلی نسل میں قاضی عبدالستار اسی روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اگر آپ کو یہ دیکھنا ہو کہ برصغیر کے دیہات کی حقیقی زندگی کیا تھی۔ وہاں کی تہذیب کی نوعیت کیا تھی۔ اس کا نظامِ اقدار کیا تھا۔ وہاں کے لوگ کس طرح سوچتے اور چیزوں اور ان کے رشتوں کو کس طرح دیکھتے تھے تو آپ ابوالفضل صدیقی کے افسانوں کو پڑھ لیجیے۔ وہ آپ کو اس تہذیب کی تہ در تہ زندگی، اس کے مسائل اور کلچر سے پوری طرح روشناس کرا دیں گے۔ ہم نے اپنے سماج کی تفہیم کے لیے اب تک ادب کو استعمال ہی نہیں کیا ہے اسی لیے ہم اپنے ادب کی صحیح قدر و قیمت سے بھی پوری طرح باخبر نہیں ہیں۔ یہی جاگیردارانہ تہذیب آج بھی ہمیں پاکستان کے طول و عرض میں اسی صورت میں نظر آتی ہے جس صورت میں وہ ابوالفضل صدیقی کی کہانیوں میں موجود ہے۔

ابوالفضل صدیقی جاگیردارانہ ماحول کے پروردہ ضرور ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اس طور پر عوام کی نمایندگی کرتے ہیں کہ انسانیت کا چراغ روشن ہو کر لو دینے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں میں انسان زندہ رہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کی قدریں اُبھر کر سامنے آتی ہیں اور زمیندار، کسان، عوام و خواص کے کردار اپنے حقیقی خد و خال کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ پریم چند نے بھی دیہات کی زندگی کو اپنا موضوع بنایا تھا لیکن پریم چند کے ہاں صرف نچلے طبقے کے مسائل عام طور پر ابھر کر افسانے کا تار و پود بنتے ہیں۔ پریم چند کے مقابلے میں ابوالفضل کے ہاں سارا دیہات اپنے پورے طبقاتی نظام کے ساتھ ساری زندگی کو جلو میں لے کر ابھرتا ہے اور دیہات کی زندگی کو پوری واقعیت اور پھیلاؤ کے ساتھ ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔ انھوں نے خاص طبقے کا فرد ہوتے ہوئے بھی عوامی قوتوں کو کامیاب ہوتے دکھایا ہے اور پُرلطف بات یہ ہے کہ نہ اس میں کوئی نعرے بازی ہے اور نہ کوئی بندھا ٹکا فارمولا ہے۔ زندگی جیسی کچھ ہے اسے تخیل کی آنکھ سے دیکھ کر پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد نے ان کے ابتدائی دور کے افسانوں کے بارے میں آج سے تقریباً ۵۰ سال پہلے لکھا تھا کہ دیہات کے موضوعات پر لکھنے والوں میں پریم چند کے بعد ابوالفضل صدیقی دوسرے اہم لکھنے والے نئے افسانہ نگار ہیں لیکن ساتھ ساتھ نثر نگار کی حیثیت سے وہ پریم چند سے بہتر لکھنے والے ہیں اور ان کا جمالیاتی شعور انھیں ایک مختلف افسانہ نگار بنا دیتا ہے۔ فی الحقیقت یہی ابوالفضل صدیقی کی انفرادیت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔

میں اس وقت ابوالفضل صدیقی کی افسانہ نگاری پر تفصیل سے بات کہنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا اور نہ میں ان کے مخصوص اسلوب اور زبان و بیان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت تو میں چند لکیریں کھینچ کر ان کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں۔ ابوالفضل نے ۱۹۳۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۹ء سے وہ مسلسل لکھ رہے ہیں جب ان کا افسانہ "سماج کا شکار" ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا اُس وقت دنیائے

ادب میں دو رجحان نمایاں تھے۔ ایک رومانوی رجحان اور دوسرا حقیقت نگاری کا رجحان۔ رومانوی رجحان کے افسانوی ادب کے نمایندہ سجاد حیدر یلدرم، ل احمد، سلطان حیدر جوش اور نیاز فتح پوری وغیرہ تھے اور حقیقت نگاری کے نمایندہ پریم چند تھے۔ ابوالفضل صدیقی نے اپنے معاصرین علی عباس حسینی اور اعظم کریوی کی طرح یہ دونوں اثرات قبول کیے ہیں لیکن ۱۹۳۶ء کی تحریک کے زیر اثر رومانوی اثر کم ہوگیا ہے اور سماجی شعور، طبقاتی تقسیم اور حقیقت نگاری کے اثرات غالب آگئے ہیں۔ ابوالفضل نے اس میں یہ اضافہ اور کیا کہ نثر کو کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ زندگی کی حقیقتوں سے ملا دیا ہے۔ اسی لیے وہ دوسرے افسانہ نگاروں سے پہلے بھی مختلف تھے اور آج بھی مختلف ہیں۔ وہ اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

ابوالفضل صدیقی سے ملیے تو ہماری پوری صدی کی مخصوص تہذیب اور اس تہذیب کی مخصوص تصویر ان کی باتوں کی لہروں سے وجود پانے لگتی ہے۔ میں انھیں کم و بیش تیس سال سے جانتا ہوں اور میں نے انھیں ہمیشہ ایک ایسا انسان پایا جس کے پاس دلِ دردمند بھی ہے اور احساسِ غم گساری بھی۔ چھوٹے بچوں سے وہ ٹوٹ کر پیار کرنے والے۔ میرے ہاں آتے ہیں تو سب سے پہلے بچوں سے ملتے اور ان سے کھیلتے ہیں۔ ہنسی مذاق کرتے ہیں۔ جب ان سے نمٹ لیتے ہیں تو پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ میری دو نسلیں ان کے سامنے پروان چڑھتی ہیں۔ جب سے ڈاڑھی چھوڑی ہے تو کپڑوں سے بے نیاز ہوگئے ہیں ورنہ میں نے ہمیشہ انھیں اہتمام سے سلے اور سلیقے سے پہنے ہوئے کپڑوں میں دیکھا ہے۔ گھٹنوں سے نیچی ڈھیلی ڈھالی شیروانی۔ ایک برکا سفید پائجامہ، سیاہ ٹوپی۔ کلائی پر گھڑی انگلی میں انگوٹھی اور ہاتھ میں بڑا سا رومال، چہرے پر رعب اور متانت، قدرے چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ کشادہ پیشانی، سانولا رنگ، بڑا دہانہ، پتلی تھوڑی لمبی ناک کسی حد تک لمبوترا چہرہ، چھریرا بدن، رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور عمر کی جھریاں چہرے پر پھیلی ہوئیں۔ دانت بے دانت۔ ملیں گے تو مسکراہٹ اور خوشی کی روشنی وجود کے افق سے ظاہر ہونے لگے گی۔ باتیں کرتے ہیں تو ایسے جیسے افسانہ سنا رہے ہوں۔ واقعات کے بعد واقعات کا ایک سیل رواں ہو جاتا ہے۔

شکار کے رسیا، ہتھیاروں کے عاشق، گھوڑوں کی ہرادا کے رازداں۔ میں نے ایک ڈائری دی اور کہا کہ اس میں گھوڑ دں کے اعضا، قسمیں اور ساز و سامان کے نام لکھ دیجیے۔ اگلے ہفتے آئے تو سینکڑوں الفاظ ڈائری میں درج کر کے دے گئے اور جو باتیں رہ گئیں وہ منھ زبانی سناتے رہے۔ کہنے لگے کہ میاں! گھوڑا اور پھوڑا ہاتھ پھیرنے سے بڑھتا ہے۔

شام کو آجائیں تو گھنٹوں بیٹھے اَن لکھے افسانے منھ زبانی سناتے رہتے ہیں۔ بعض محیر العقل اور بعض ناقابل یقین۔ میں نے اور بیگم سلمیٰ زمن نے کئی بار منصوبہ بنائے کہ ان کی تصدیق کریں گے لیکن جب تصدیق کا موسم آتا تو ہم بھول جاتے۔ ایک دن آئے۔ کہنے لگے "میاں! کیا نئے خان بہادر آگئے ہیں"۔ میں نے پوچھا "خان بہادر"؟ ... کہنے لگے۔" میاں! یہ جو بھونکنے کی آواز آرہی ہے؟ کیا نئے کتے پال لیے ہیں؟"

ابو الفضل صدیقی کو گھوڑوں کے علاوہ کتے پالنے کا بھی شوق رہا ہے۔ برسوں ان سے شکار کھیلا ہے۔ ہارڈ کر اسٹیشن ماسٹر کو بھی کتے پالنے کا شوق تھا۔ ان کے پاس کہیں سے اعلیٰ نسل کے سفید کتوں کا ایک جوڑا آیا۔ ابو الفضل صاحب کو کتے اتنے پسند آئے کہ بچوں کی فرمائش کر دی۔ کئی بار کہا مگر اسٹیشن ماسٹر ٹال مٹال گئے۔ جب پانی سر سے گذر گیا تو ابو الفضل صدیقی کے اندر کا زمیندار جاگ اٹھا۔ اس کے کتے چوری کرا دیے اور جب کتے ان کے پاس پہنچے تو اسی رات ان کے سارے جسم پر گہرا سیاہ خضاب لگوا دیا۔ خضاب ایسا کھلا کہ خود کتے بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکے۔

ایک دن کہنے لگے۔" میاں دیکھو! مرغا دو طرح سے اذان دیتا ہے۔ عام مرغا کہتا ہے داتا گاؤں۔ داتا گاؤں۔ لیکن بعض مرغے منحوس ہوتے ہیں اور جب اذان دیتے ہیں تو کہتے ہیں چوپٹا گاؤں۔ چوپٹا گاؤں۔ جو مرغا چوپٹا گاؤں کی بانگ لگاتا ہے تو اس کے مالک سے نہ صرف مرغا لے لیا جاتا ہے بلکہ چاول، گھی اور کھریا بھی لیا جاتا ہے تاکہ وباؤں کے تدارک کے لیے اس منحوس مرغے سے نجات حاصل کر لی جائے۔

اور میاں دیکھو! عام طور پر کسان کا مرغا چوپٹا گاؤں کی بانگ لگاتا ہے اور زمیندار کا مرغا داتا گاؤں کی۔ پھر ہمیں دیکھا اور شرارت آمیز ہنسی سے کھلکھلا اٹھے۔

پچھلے سال ۱۹۸۶ء میں دو مہینے ایسی گرمی پڑی کہ ساری خلقتِ خدا تراہ تراہ پکار اٹھی۔ ایک دن آئے۔ کہنے لگے۔" میاں! معلوم ہے یہ گرمی اتنی مسلسل اور اتنی شدید کیوں پڑ رہی ہے؟ یہ لوند کا سال ہے اور لوند کے سال، چیت دو مہینے کا ہوتا ہے۔ بہت دیر ماتھے سے پسینہ پونچھتے رہے اور اس بات کی وضاحت کرتے رہے۔

مجھے یاد ہے کہ ۱۹۷۴ء میں وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتے تھے کہ مئی ۱۹۷۵ء ان کی وفات کا مہینہ ہے۔ ہم نے بہت سمجھایا۔ کہنے لگے میری پیدائش پر پنڈت نے جو زائچہ بنایا تھا اس میں یہی لکھا ہے۔ میں نے پوچھا۔ بڑے بھائی! کیا سارے واقعات اسی طرح صحیح ثابت ہوئے ہیں جس طرح زائچے میں لکھے ہیں۔ کہنے لگے سب تو نہیں لیکن خاصی تعداد میں صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ میں، مختار زمن، ابن الحسن، بیگم سلمیٰ زمن انھیں سمجھاتے۔ کچھ اثر بھی ہوتا مگر دو ایک دن میں پھر زائل ہو جاتا۔ ۳۱ مئی ۱۹۷۵ء کی رات کو بارہ بجے ہم اُن کے ہاں پہنچے اور کہا کہ ہم موت کے فرشتے کی تلاش میں آئے ہیں۔ کیا وہ آچکا ہے یا آنے والا ہے؟ وہاں کے اور یہاں کے وقت میں تو کچھ فرق نہیں ہے؟ بہت ہنسے۔ پھر ہمارے ساتھ گھر کے باہر سڑک پر ٹہلتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سر کا بوجھ اتر گیا ہے اور وہ اب ہلکے پھلکے ہو گئے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ۳۱ مئی ۱۹۷۵ء کی رات کو گذرے اب بارہ برس ہونے آرہے ہیں اور ابو الفضل صدیقی اسی طرح افسانے بنانے میں مصروف ہیں۔ خدا انھیں عمرِ نوح عطا فرمائے۔ انھوں نے اپنے قلم سے اردو ادب کو مالا مال کیا ہے اور اسے ایسی کہانیاں دی ہیں جنھیں ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کے پاس ۱۲۲ قلم ہیں جن کے وہ بلا شرکت غیرے مالک ہیں اور ابھی ایک ایک قلم سے انھیں کئی کئی کہانیاں لکھنی ہیں۔

یہاں تک پہنچا تو مجھے اٹھارویں صدی کے ایک شاعر احسن الدین خان بیان

کا ایک شعر یاد آیا۔ آپ بھی سن لیجئے اور مجھے اجازت دیجیے۔

ہماری بھی کہانی کل یہاں یوں ہی بنا دیں گے
کہ جیسے آج ہم لوگوں کے افسانے بناتے ہیں

(۲۹ر مارچ ۱۹۸۷ء)

ابوالفضل صدیقی کے آخری لمحات

ہمارے بزرگ افسانہ نگار جناب ابوالفضل صدیقی ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء مطابق ۲۲ محرم الحرام ۱۴۰۸ھ، بدھ کے دن، شمالی ناظم آباد کے حنیف اسپتال میں، دو بج کر بیس منٹ تیسرے پہر اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۲ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دن کے ساڑھے بارہ بجے انھوں نے اپنا نیا افسانہ مکمل کیا اور بتایا کہ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہورہی ہے۔ ڈھائی بجے انھوں نے کاغذ اور قلم لیا اور اس پر اپنے ہاتھ سے لکھا کہ "میری زبان ٹوٹ گئی ہے"۔ یہ کاغذ ان کے بھتیجے اور افسانہ نگار نذرالحسن صدیقی کے پاس محفوظ ہے۔
اسی وقت ان کے پوتے ڈاکٹر ندیم کو اطلاع دی گئی اور انھوں نے ابوالفضل صدیقی صاحب کو حنیف اسپتال کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کرادیا۔ دائیں طرف، فالج کا اثر ہوچکا تھا۔ شام کو انھوں نے پھر کاغذ قلم کے لیے اشارہ کیا جو انھیں مہیا کردیے گئے۔
کم زور و بے گرفت انگلیوں سے کاغذ پر انھوں نے کچھ لکھا جو مشکل سے پڑھا جاسکا۔ اس پر انھوں نے میرا نام لکھا تھا۔ نذرالحسن نے مجھے مطلع کیا اور میں فوراً اسپتال پہنچا۔ وہ نیم بے ہوش تھے لیکن دماغ کام کررہا تھا۔ مجھے دیکھا اور جذبات سے مغلوب ہوکر اشکبار ہوگئے اور اپنا ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ہاتھ میں ہاتھ لے کر اسے دبایا۔ بہت دیر میں وہاں رہا۔ پھر ان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور وہ شاید سوگئے۔ ۳ ستمبر کو میں پہنچا تو میں نے کہا بڑے بھائی! آج آپ کی اسی ویں سال گرہ ہے، مگر وہ ماہ و سال سے بے نیاز تھے۔ جب تک وہ اسپتال میں رہے میں کم و بیش روز جاتا رہا لیکن ان کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ فالج کا اثر باقی تھا۔ اسی عرصے میں دل بھی متاثر ہوا۔ پیشاب بند ہونے کی تکلیف بھی شروع ہوگئی۔

غذا ۲؍ستمبر ۱۹۸۷ء سے بند تھی۔ صرف ڈرپ کے ذریعے گلوکوز اور دوائیاں دی جا رہی تھیں۔ ناک کے ذریعے سوپ نلکی سے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہی حالت بدستور قائم رہی۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ عمر کی وجہ سے دواؤں کا وہ اثر نہیں ہو رہا ہے جو ہونا چاہیئے۔ بلڈ پریشر اور نبض کی رفتار بھی ناہموار تھی۔ ذرا سی دیر میں بڑھ جاتی، ذرا سی دیر میں گھٹ جاتی۔ ۱۴؍ستمبر کو ان کا بلڈ پریشر اچانک گرنے لگا اور اتنا کم ہو گیا کہ کم و بیش صفر تک آ گیا۔ ڈاکٹر دوڑے۔ دل کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ الٹ پلٹ کر، دبا کر، بھینچ کر اسے پھر سے متحرک کیا اور آکسیجن کی نلکی سانس کے لیے لگادی۔ دو دن وہ اسی حالت میں رہے اور ۱۶؍ستمبر کو اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ ۲۸؍اگست کو آخری بار وہ میرے گھر آئے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کے جمعہ میرے ہاں آتے، بچوں سے کھیلتے۔ اُن سے لڑتے۔ کبھی ان کو رُلاتے، کبھی ہنساتے اور ایسے خوش ہوتے جیسے دو جہاں کی دولت ان کے ہاتھ آگئی ہے۔ پہلے وہ میرے بڑے بیٹے خاور سے اسی طرح کھیلتے تھے اور اب وہ خاور کے بچوں سے اسی طرح کھیلتے تھے۔ ان کے ہاتھ کی بید ہر بچہ چھیننے کی کوشش کرتا اور اس طرح بچوں میں آپس میں لڑائی ہو جاتی۔ وہ بہت دیر تک یہی تماشا کرتے اور کراتے رہتے۔ چلتے ہوئے مجھ سے کہنے لگے کہ میرے پاؤں کم زور ہو رہے ہیں لیکن میں گھر سے ہمیشہ کی طرح پیدل آیا ہوں اور اب نذر الحسن کی طرف جاؤں گا۔ یہ اُن کے معمول کا آخری جمعہ تھا اور بدھ ۲؍ستمبر ان کی تخلیقی زندگی کا آخری دن تھا جب انھوں نے اپنا آخری افسانہ مکمل کیا۔ وہ لکھنے کے لیے پیدا ہوئے تھے اور آخر وقت تک لکھنے کے عمل میں مصروف رہے۔ قابلِ رشک ہیں وہ لوگ جو جس کام کے لیے پیدا کیے جاتے ہیں وہی کام دل لگا کر لگن کے ساتھ مگن ہو کر کرتے رہتے ہیں۔ پھر عظمتیں ان کے قدم چومتی ہیں اور شہرت ان کو ہر دم سلام کرتی ہے۔ ابو الفضل صدیقی اردو زبان کے بڑے افسانہ نگار تھے۔ اتنے بڑے کہ اردو ادب کا مورخ ان کے نام اور کام کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ وہ سلطان حیدر جوش اور منشی پریم چند کے فوراً بعد کی اُس نسل سے تعلق رکھتے تھے جن میں علی عباس حسینی اور حیات اللہ انصاری کے نام آتے ہیں۔ انھوں نے جاگیردارانہ تہذیب کی جیتی جاگتی تصویریں اُردو ادب کو دی ہیں اور جس طرح

عوام کے دکھ درد اور مسائل ان کی تحریروں میں ابھرے ہیں، اس طور پر کسی افسانہ نگار کے ہاں نہیں ملتے۔ ان کی نصف سے زیادہ تحریریں غیر مطبوعہ ہیں۔ متعدد افسانے اردو رسائل میں بکھرے پڑے ہیں۔ "احرام" ان کا پہلا مجموعہ تھا جو ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۷ افسانے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں "چار ناولٹ" نامی مجموعے میں ان کے چار عظیم ناولٹ پاکستان میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد مکتبۂ اسلوب کراچی سے ان کے تین مجموعے (آئینہ، انصاف، جوالامکھ) ایک ساتھ شائع ہوئے جن میں افسانوں کی کل تعداد چودہ ہے۔ "سرور" ان کا ناول تھا جو سلطان سنز کراچی سے شائع ہوا تھا۔ "زنگ" نامی ضخیم ناول ابھی کتابت کے مرحلے سے گذر رہا ہے۔ کم و بیش ان کی دو سو کہانیاں، خاکے اور تحریریں ایسی ہیں جو ابھی تک یا تو غیر مطبوعہ ہیں یا کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئیں۔ ہمیں مل کر ان کی ساری تحریروں کو یکجا و مرتب کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اردو ادب کا یہ انمول سرمایہ محفوظ رہ جائے اور آنے والی نسلیں ان سے مستفیض ہو سکیں۔

۲۸ مارچ ۱۹۴۵ء کو سلطان حیدر جوش نے ان کے پہلے افسانوی مجموعے "احرام" کے تعارف میں لکھا تھا کہ "میری دعا ہے کہ ابوالفضل صاحب دنیا کے ادب میں اس طرح چمکیں جس قدر ان کی بڑی چمک دار آنکھیں، دہانے تک محدود رہنے والی مستقل مسکراہٹ اور مطالعہ کرنے والی نظریں چاہتی ہیں اور ماشاءاللہ ان کی بلند و بالا سرخ و سپید ہنستی کھیلتی آزاد نوجوانی کا تقاضا ہے۔" اور ۱۶ ستمبر ۱۹۸۷ء کو جب ان کا انتقال ہوا تو سفید داڑھی نے ان کے چہرے کو نورانی بنا دیا تھا۔ بڑی چمک دار آنکھیں سکڑ کر چھوٹی ہو گئی تھیں اور سرخ و سپید رنگ پیلا اور میلا ہو گیا تھا۔ یہی ان کی بھرپور زندگی کے طویل سفر کا نقطۂ انجام تھا لیکن جب میں نے چادر اٹھا کر ان کے چہرے کو دیکھا تو دیواروں سے اترنے والی دھوپ کی طرح، وہ مسکراہٹ اب بھی ان کے دہانے پر محفوظ تھی۔ وہ شاید بات کرنا چاہتے تھے مگر وہ بات کرنے کی منزل سے بہت آگے جا چکے تھے اور ان آنسوؤں سے بھی بے نیاز تھے جو ارد گرد کھڑے افرادِ خاندان

بہویں، بیٹیاں، پوتے، نواسیاں، بھائی، بھتیجے ان کی جدائی پر نالہ درد کے ساتھ بہا رہے تھے۔ نذر الحسن صدیقی مجھ سے چمٹ کر رونے لگے اور میر کا یہ شعر میرے ذہن کے دریچے سے جھانکنے لگا:

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

(۲۰ر ستمبر ۱۹۸۷ء)

جمیلہ ہاشمی کے دو ناول

(۱)

جمیلہ ہاشمی کا یہ ناول "چہرہ بہ چہرہ روبہ رو" ایک ایسی کتاب ہے جسے ہم سب کو پڑھنا چاہیئے۔ جمیلہ ہاشمی نے اپنے اس ناول میں ایک ایسی متنازعہ لیکن عظیم ہستی کو موضوع بنایا ہے جس کا نام آج تک خود ایک افسانہ ہے۔ ام سلمٰی، جسے ہم قرۃ العین طاہرہ کے نام سے جانتے ہیں' ایک ایسی بے قرار روح کی مالک تھی جس کے پاس دل بھی بڑا تھا اور دماغ بھی' جو حق کی تلاش میں ساری زندگی سرگرداں رہی اور حق کی تلاش ہی میں جان دے دی۔ حق ہی اس کا محبوب تھا جس کے غمِ ہجر میں وہ ساری عمر تڑپتی رہی۔ آنکھیں جب محبوب کو دیکھنا چاہیں تو پھر کسی اور کو دیکھنے کی تمنا نہیں کرتیں۔ اُس نے رسم پرست معاشرے میں ایک عورت ہوتے ہوئے بھی وہ کام کیا جو ایرانی معاشرے میں اس وقت بہت دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ اس نے فرسودہ قدروں کو تشکیک کی نظر سے دیکھا اور انھیں سوال بنا کر معاشرے کے شعور کو بیدار کر دیا۔ جب اپنی خادمہ ہانی کو قریب بلا کر اس نے کہا:

"تم نے کبھی خدا کو دیکھا ہے؟"۔ تو خادمہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا ـــ "تم یہ سوچتی ہو کہ خدا کو نہیں دیکھ سکتیں، جو ہر شے میں جاری و ساری ہے، جو سب جگہ موجود ہے"۔

اور جب ہانی نے یہ سُنا تو کہا ـــ "آقازادی! اگر خدا ہر شے کے اندر موجود ہے تو

میرے اندر بھی موجود ہوگا۔"

قرۃ العین طاہرہ نے پھر کہا۔ "کیا تم نے اس سے پہلے محسوس نہیں کیا کہ خدا تمہارے اندر موجود ہے۔ تم خدا کا ایک حصّہ ہو"۔

ہانی نے دیوانوں کی طرح جواب دیا۔۔۔ "نہیں بخدا آقا زادی نہیں۔ میں یہ سوچنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہوں۔ میں اتنا بڑا بوجھ کیسے اٹھا سکتی ہوں۔ میں تو صرف ہانی ہوں۔ ایک خادمہ، میرے اندر بھلا خدا کیسے اُتر سکتا ہے"۔

یہ سُن کر وہ دھم سے گر پڑی اور پھر کبھی نہ اٹھی۔ سچائی کا یہی وہ تصور تھا جو قرۃ العین طاہرہ کا بنیادی مسئلہ تھا اور جسے وہ دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا دینا چاہتی تھی۔ قرۃ العین اسی نئے شعور کی علامت تھی اور یہی نیا شعور قرۃ العین کے مہدئ موعود کا ظہور تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پورا ایران ہزار سال گذر چکنے کے بعد امام غائب کے ظہور میں آنے کی پیشین گوئی کا انتظار کر رہا تھا۔ قاچاری سلطنت زیر و زبر تھی اور ایران کی روح خود کو دریافت کرنے کے لیے بے چین تھی۔ قرۃ العین طاہرہ نے اس روح کو علی محمد باب کے روپ میں دیکھا۔ حکم ہوا۔ "اٹھو اور جو کچھ تم نے دیکھا ہے اسے لوگوں کو دکھا دو"۔ اس نے سوچا کہ اب سیاہ رات کا سویرا ہو گیا ہے۔ باب کا مذہب ایران کا اپنا مذہب تھا۔ اپنی وحی اپنے قوانین۔ اُس نے قرآن کریم کو اِعراب سے آزاد کر دیا تھا۔ طاہرہ قایم آل محمد کی تلاش میں بہت دور نکل آئی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کسی بڑے مقصد کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ یہ خداداد ذہانت اُسے یونہی نہیں ملی ہے۔ وہ ایران کے بے عمل، جامد معاشرے کو دلائلِ عقلی کی روشنی سے متحرک کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ساری عمر اسی نئے شعور کے ساتھ زندہ رہی اور اسی شعور کا تخم سرزمینِ ایران میں بو کر فنا ہو گئی۔

جمیلہ ہاشمی نے اسی عظیم عورت کی زندگی اور فکر و فلسفہ کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے جو امِ سلمٰی سے قرۃ العین بنی۔ قرۃ العین سے طاہرہ بنی۔ طاہرہ سے زرین تاج بنی اور پھر ام العالم بن گئی۔ اس موضوع پر یہ اردو زبان میں پہلا ناول ہے۔ عزیز احمد مرحوم نے قرۃ العین طاہرہ کو موضوع بنا کر "زرین تاج" کے نام سے ایک خوب صورت افسانہ لکھا تھا جو آج بھی اردو

کے بہترین افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس صدی کے اوائل میں مولانا عبدالحلیم شرر نے حسن بن صباح کی تحریک کو موضوع بنا کر اپنا ناول "فردوسِ بریں" لکھا تھا جو آج بھی اردو کے اچھے ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ "تاریخ" انسانی فکر، جدوجہد اور شعور و عمل کا وہ خزینہ ہے جس سے سینکڑوں ناولوں کے تار و پود بُنے جا سکتے ہیں۔ جس سے ہم اپنے حال کو ماضی کی روشنی سے منور کر سکتے ہیں۔ عزیز احمد نے "زرین تاج" اور "جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں" لکھ کر ہمارے دور میں جدید تاریخی ناول لکھنے کی بنا ڈالی تھی۔ جمیلہ ہاشمی نے اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ اب دیکھیں ہمارے نئے لکھنے والے تاریخ کو اپنے دور کے حوالے سے کیسے دیکھتے ہیں اور کیسے اپنے نئے ناولوں میں سموتے ہیں۔ مریضانہ ذہن کی رومانیت کا زمانہ گذر گیا۔ اب ہمارے تخلیقی فن کاروں کو چاہیئے کہ وہ ہمارا ناول نویسی کی موجودہ روش کے اس جذباتی دلدل والے دائرے کو توڑ کر باہر نکلیں اور اردو میں محنت و انہماک سے تاریخی ناول لکھنے کے ایسے نئے دور کا آغاز کریں جس میں ایک طرف ماضی حال سے آملے اور دوسری طرف ہمیں زندگی کا نیا شعور بھی ملے۔ ایسا شعور جو ہمیں ذہنی سطح پر نئے سفروں پر اُکساتے اور ہم اَن جانی دنیاؤں کو دریافت کرنے پر نکل کھڑے ہوں۔ ہماری روح اس سفر کے لیے بے چین ہے۔ ہمارے ناول نگار اور ادیب و شاعر اس روح کو نئے سفر کا راستہ دکھا سکتے ہیں۔ ناول اس کام کے لیے سب اہم اور بڑا میڈیم ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ جمیلہ ہاشمی ہمارے لکھنے والوں میں وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے تاریخ کے حوالے سے اس سفر کا آغاز کر کے ذہنِ انسانی کے نہاں خانوں میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں وہ لگن ہے جو لکھنے والے کو ہر دم نئے سفر پر آمادہ رکھتی ہے۔ سفر حرکت کی علامت ہے۔ اَن جانی دنیاؤں کو جاننے کی خواہش کا نام ہے۔ تخلیقی زندگی کا استعارہ ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے بائیس سال پہلے ان کا پہلا افسانہ جب ہفت روزہ "لیل و نہار" میں شائع ہوا تھا تو وہ افسانہ مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے لیل و نہار میں چھپے اور وہ سب کے سب مجھے اچھے لگے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں "داستان گو" لاہور میں ان کا وہ ناولٹ چھپا جسے آج ہم "آتشِ رفتہ" کے نام سے جانتے ہیں اور جو اردو کے

چند اچھے ناولٹوں میں شمار ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ناول "تلاشِ بہاراں" چھپا، جس پر انھیں "آدم جی انعام" ملا۔ اس عرصے میں انھوں نے بہت سی کہانیاں لکھیں جن میں سے بیشتر "نیا دور" کراچی میں چھپیں، اور جو آج بھی پڑھنے والوں کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے بیشتر کہانیاں ان کے مجموعے "آپ بیتی جگ بیتی" میں شامل ہیں۔ پھر انھوں نے ایک ایسے موضوع پر ایک ناولٹ "روہی" کے نام سے لکھا جو اس سے پہلے برصغیر کی کسی زبان میں موضوعِ ادب نہیں بنا تھا۔ ہمارے ملکِ عزیز کے اُس لق و دق صحرا کی کہانی، جسے ہم چولستان کے نام سے جانتے ہیں اور جو جغرافیائی اعتبار سے بھاول پور کا حصّہ ہے۔ اس کے بعد جمیلہ ہاشمی نے تین اور ناولٹ لکھے جو ۱۹۷۴ء میں "اپنا اپنا جہنم" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ جمیلہ ہاشمی کے لکھنے کا اپنا انداز ہے۔ ایک اچھے فن کار کی طرح انسان اور انسانی رشتوں اور چیزوں کو دیکھنے کا اپنا ڈھنگ ہے۔ ان کے اسلوب پر "جوزف کونرڈ" کا گہرا اثر ہے۔ اب وہ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" لے کر آئی ہیں۔ ان جانی چیزوں کو جاننا اُن کا مزاج ہے۔ آج کل وہ منصور حلّاج کی زندگی اور فلسفہ و تصوّف کو اس لیے پڑھ رہی ہیں تاکہ وہ افسانۂ منصور کو از سرِ نو تازہ کر سکیں۔ جمیلہ ہاشمی کا سفر جاری ہے۔ وہ سفر جو فانی انسان کو لافانی بنا دیتا ہے۔

جمیلہ ہاشمی کا تخلیقی مزاج یہ ہے کہ وہ "اسرار" تک تو جا پہنچتی ہیں لیکن اس کا پردہ چاک نہیں کرتیں۔ ان کی روح میں شاعری ہے اسی لیے حقیقت ان کے ہاں افسانہ بن جاتی ہے۔ "چہرہ بہ چہرہ روبرو" میں داستان گو نے تاریخ اور اس کے واقعات سے انحراف نہ کرنے کے باوجود تاریخ کو افسانہ بنا دیا ہے۔ یہ کوئی ایسا رومانی معاشرتی ناول نہیں ہے جس میں موٹر سائیکل کی روانی، کار کی تیز رفتاری اور ہوائی جہازوں کا شور ہو بلکہ یہ ایران کی تاریخ کے اس دور کی کہانی ہے جب ایران کا سیاسی استحکام زوال پذیر تھا اور ایران کو ایک ایسی فکر کی ضرورت تھی جو اُسے دوبارہ متحرک کر کے فرسودہ اقدار کی شدید گرفت سے آزاد کرا سکے۔ جب مذہب محض ایک رسم بن جائے اور اس میں زندگی کو آگے بڑھانے کی قوت باقی نہ رہے۔ عدل و انصاف ختم ہو جائے، جبر و استحصال

کے بوجھ سے عوام کی کمر ٹوٹنے لگے تو ایسے میں علی محمد باب اور بہار اللہ جیسے کردار تاریخ کے اسٹیج پر ظاہر ہوتے ہیں جو رسم پرست معاشرے کے ہاتھوں خود تو فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن مذہب کی رسم پرستی کا بت پاش پاش کر جاتے ہیں۔ جمیلہ ہاشمی نے اس ناول کو محنت اور لگن سے لکھا ہے۔ یہ ایک مشکل ناول ہے جسے پڑھنے کے لیے آپ کو بھی محنت کرنی پڑے گی۔ وہ لوگ جو محنت سے بھاگتے ہیں اور چیزوں کو محنت سے دریافت کرنے اور جاننے کے عادی نہیں ہوتے انھیں اس ناول کے بجائے اُن ضخیم ناولوں کو پڑھنا چاہیئے جو محض صفحے پلٹنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں اور جو عام طور پہ تاجرانِ کتب کے ہاں مل جاتے ہیں۔

"چہرہ بہ چہرہ روبرو" کی نثر کے بارے میں بھی ایک بات کہتا چلوں۔ اس ناول کے بعض حصّے خوب صورت نثر کے نمونے ہیں جن میں مصنّفہ کی باطنی کیفیت نے فکر و احساس کو ایسے اُجاگر کیا ہے کہ ایک جان دار تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ مثلاً یہ چند جملے سُنیئے:

"سماوار کے قریب بیٹھ کر تپش سے وجود سکون پاتا ہے۔ روح غم انگیز واقعات کو بُھلا دیتی ہے۔ دل کاروبارِ حیات میں پھر خوشی تلاش کر لیتا ہے کیوں کہ وقت بڑے سے بڑا زخم مندمل کر دیتا ہے۔ ہاں زخم بھر جاتے ہیں مگر چٹان ٹوٹ جائے تو پہاڑ کا وہ حصّہ اسی طرح بدنما لگتا رہتا ہے اور اُسے صدیاں اور قرنیں بھی درست نہیں کر پاتیں۔" (ص ۱۰)

اب اس سے بالکل مختلف مزاج کے یہ چند جملے سُنیئے:

"قومیں صفحۂ ہستی سے ناپید ہوئیں اور خود اُن پر اُن کی بستیاں الٹائی گئیں۔ طوفان بھیجے گئے۔ زمین و آسمان میں کہیں امان نہ ملی۔ خوارزم شاہی سلطنت تباہ ہوئی اور یاجوج ماجوج کی قوم نے مشرق سے نکل کر ساری بادشاہتوں کو اُلٹ دیا۔ بغداد ایک قصّہ، داستان بن گیا۔ کیا یہ عبرت کافی نہیں۔ اسپین لٹا۔ مسجدیں مرثیہ خوانی کو باقی رہ گئیں۔ مگر اولادِ آدم کسی دوسرے کے قصّے سے سبق نہیں سیکھتی۔ وہ تو یہ چاہتی ہے کہ سب کچھ اس پر بیتے اُس پر گذرے۔ ہر زمانے کے سبق اس کے اپنے پیدا کردہ ہونے چاہئیں۔" (ص ۶۵)

اس نثر میں ایک دوسرے سے مختلف قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک پر احساس حاوی ہے۔ دوسرے میں تاریخ کو ایک دائرے میں سمیٹ کر یک جا کر دیا ہے۔ لیکن جمیلہ ہاشمی کے مزاج نے ان دونوں میں اپنے اندازِ نظر سے ایک ایسی خوش گوار ہم آہنگی پیدا کر دی ہے جس سے اندازِ بیان مؤثر اور تاثر گہرا ہو گیا ہے۔

اسی طرح اس ناول میں جابجا مناجاتیں آتی ہیں۔ یہ سب مناجاتیں خود جمیلہ ہاشمی کی تخلیق ہیں جو ایک طرف ناول کے تاثر کو اُبھارتی ہیں اور دوسری طرف آج کی زبان میں انھیں "نثری نظمیں" بھی کہا جا سکتا ہے۔

(۱۰ ارمئی ۱۹۷۹ء)

(۲)

آج جمیلہ ہاشمی اردو والوں کے لیے ایک ایسا نام ہے جس نے اردو فکشن میں اعتبار کا درجہ پالیا ہے۔ وہ اعتبار جو اچھا اور مسلسل لکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب جمیلہ ہاشمی کے لیے تعلقاتِ عامہ، آرائشِ محفل یا حصولِ شہرت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کا وہ خواب ہے جس کی تعبیر اُن کی کہانیاں ہیں۔ وہ کہانیاں جو زندگی کے باطن میں چھپی ہوئی ہیں اور صرف اُن کو نظر آتی ہیں جو زندگی کے آئینے میں اپنے تجربوں اور محسوسات کی جھلک اس طرح دیکھتے ہیں جیسے دولہا دلہن آرسی مصحف میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ یہی جمیلہ ہاشمی کا تخلیقی عمل ہے جس میں اندھیارے اُجالوں میں اور روشنی ظلمت میں مل کر ایسے رنگ بناتے ہیں جن میں روشنی تاریکی کو اور اجالا اندھیارے کو بدل دیتے ہیں۔ اسی تخلیقی عمل سے وہ نغمہ پھوٹتا ہے جو جمیلہ ہاشمی کی نثر کو نور ظہور کے تڑکے کا سا رنگ اور سماں عطا کرتا ہے۔ یہ رنگ اور سماں ان کی نثر کو ایک ایسی نغمگی دیتا ہے جو اس دور کے دوسرے لکھنے والوں میں کبھی کبھار اور کم کم نظر آتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی نثر میں یہ بات مجھے ہمیشہ محسوس ہوئی ہے اور آج جب "دشتِ سُوس" پر کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو ہمیشہ کی طرح آج

بھی ان کی نثر کا مرغِ چمن مجھے نغموں پُراکسانے لگا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس بات کو کیسے لکھوں تو میری نظر پہلی اس کتاب کے عنوان پر پڑی جس کی ذیلی سرخی "حسین بن منصور حلاّج ۔۔ ایک غنائیہ" ہے اور اس کے تین حصّوں کے نام ۔۔ صدائے ساز، نغمۂ شوق اور زمزمۂ موت ہیں۔ یہ عنوانات جمیلہ ہاشمی نے اپنے تخلیقی مزاج اور اپنے احساسات کی مناسبت سے رکھے ہیں۔ ان سب میں نغمۂ و ساز مشترک ہیں۔ اسی مزاج نے جمیلہ ہاشمی کی نثر کو ایک ایسا رنگ دیا ہے جس میں نغمہ شامل ہے اور ایک ایسا روپ دیا ہے جو ساز کی صدا سے دمک اُٹھتا ہے۔

خواتین و حضرات! ہمارے دور میں اچھی نثر لکھنے کا شوق ماند پڑ گیا ہے اور وا ماندگیٔ شوق نئی نئی پناہیں تراشتی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی نثر اپنی مدُھر لَے اور اپنی دھیمی سُروں والی نغمگی سے مسحور کرتی ہے۔ اُن کے ہاں روکھی پھیکی حقیقت نگاری والی نثر نہیں ملتی بلکہ نغمے میں رچی ہوئی وہ نثر ملتی ہے جس میں شاعری کی روح نثر کے قالب میں اُتر کر زندگی کی نوید دیتی ہے اور عشق کا احساس اور اس احساس سے پیدا ہونے والا شعور مزرعِ گلاب بن کر اُن پگڈنڈیوں پر لے جاتا ہے جہاں منصور حلاّج کی طرح عشق کی نشانیاں، توفیق اور مہربانیاں مجبوریوں کی منزل سے دور لے جا کر انا الحق سے قریب کر دیتی ہیں اور عاشقوں کے قبیلے با وضو ہو جاتے ہیں۔ منصور حلاّج نے کہا تھا: "عشق ہی مزرعِ گلاب ہے اور عشق ہی مزرعِ زندگی ہے"۔ اور اسی سے جمیلہ ہاشمی کی تخلیقی قوت کا خمیر اُٹھتا ہے اور ایک ایسی نثر کو وجود بخشتا ہے جو پڑھنے والے کو سرشاری کی کیفیت میں لے جاتا ہے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ دونوں وقت مل چکے ہیں۔ میں تو یہ بات کہہ کر آپ کی توجہ جمیلہ ہاشمی کی نثر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ وہ نثر جس کی کھیتی ہمارے دور میں سوکھ رہی ہے اور جس کی آبیاری پھر سے ہماری نئی نسل کو کرنی ہے۔ اس نثر کو محسوس کرنے کے لیے میں آپ کو چند جملے پڑھ کر سناتا ہوں۔ آپ اسے سنیے اور دیکھیے کہ اس نثر کی خوشبو دوسری حقیقت نگاری والی نثر کی خوشبو سے کتنی مختلف ہے۔

"مسجد کا صحن نمازیوں سے پُر تھا اور میناروں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں گلرنگ روشنی سے دھندلے سفید اُجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ مؤذن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لیے پہلی سیڑھی پر قدم دھرا، وضو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں، کاروانوں کے سالار اونٹوں کو روکے رکھنے کا حکم دے کر ساربانوں کی معیت میں دالان در دالان اونچی چھتوں سے مزیّن صحنوں میں داخل ہوتے۔ لوگ درود وسلام میں منہمک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبزہ زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشکبو گونج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری وساری بلند ہوئی۔

درویشوں کی ایک ٹکڑی اپنے فرغلوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے کُلاہ تھامے ایک اندازِ مستانہ سے چلتی اپنے نعروں کے خروش کو اپنے سینوں میں دبائے ملحقہ خانقاہ سے آکر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیاب وحضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب سجدے کے لیے جُھکتے تو اُنھیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سُنائی دینے کے باوجود کھڑے رہتے۔ یہ کیسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر پیچ وتاب کھا رہے تھے، جب انھیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد ہوئے تھے؟"

اس نثر میں آہستہ پن ہے نغمگی ہے اونچی لے میں نرم آواز رس گھولتی ہے۔ اس میں تخیل سے جان دار تصویریں بنانے کی قوت موجود ہے۔ یہ تخلیقی نثر ہے۔ جمیلہ ہاشمی فکشن نگاروں کی جدید نسل میں اسی لیے امتیاز رکھتی ہیں۔

(۳ر جنوری ۱۹۸۳ء)

جمیلہ ہاشمی کے آخری لمحات

۱۷ر نومبر ۱۹۲۹ء کو گوجرہ میں پیدا ہونے والی جمیلہ ہاشمی ۱۰ر جنوری ۱۹۸۸ء کو لاہور میں وفات پاگئیں۔ یہ سب کچھ یوں اچانک ہوا کہ قضا وقدر کی اس سفاکی پر یقین نہیں آتا، جیسے مرنا نہ ہو چیل جھپٹا ہو۔ چیل آئی اور زندگی کے ہاتھوں سے، جھپٹا مار کر، جمیلہ ہاشمی کو ابد کی فضاؤں میں اڑا کر لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

یہ ۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ہفت روزہ "لیل ونہار" لاہور میں ایک مختصر سی کہانی چھپی۔ کہانی کا نام تھا "دوخط"۔ پڑھی تو اچھی لگی۔ اس کے بعد اور کئی کہانیاں اس افسانہ نگار کی پڑھیں اور وہ بھی اچھی لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اردو افسانے میں نیا اور تازہ خون شامل ہو رہا ہے۔ جب بھی جمیلہ ہاشمی کی کوئی کہانی چھپتی میں شوق سے پڑھتا۔

۱۹۵۹ء کے دسمبر کی آخری تاریخیں تھیں اور نئے سال کا سورج نئی امنگوں اور ولولوں کے ساتھ طلوع ہونے کے لیے تیار تھا۔ انھیں تاریخوں میں کراچی میں رائٹرز کنونشن ہوا۔ اس وقت کراچی متحدہ پاکستان کا دارالحکومت تھا اور مشرقی پاکستان ہمارے جسم قومی میں دل کی طرح دھڑکتا تھا۔ ادیبوں کے اس کنونشن کے سلسلے میں میرے اور قرۃ العین حیدر کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بعض ادیبوں کو کراچی اسٹیشن سے لاکر انھیں ان کی قیام گاہ تک پہنچایا جائے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز کا سفر اتنا عام نہیں ہوا تھا۔ ریل ہی وہ تیز رفتار سواری تھی جو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتی تھی۔ ہوائی جہاز کے سفر کا مزا اور اخبارات میں بیان چھپوانے کا چسکہ ابھی نہیں پڑا تھا اور

تعلقات عامہ کے دفاتر بھی نہیں کھلے تھے۔ اُس زمانے کا ادیب آج کے ادیب کے مقابلے میں یقیناً پسماندہ تھا۔ وہ زیادہ پڑھتا تھا اور زیادہ بحث کرتا تھا اور حیات و کائنات، سماج اور زندگی کے مسائل پہ ایسے غور کرتا تھا جیسے یہ اُس کے اپنے مسائل ہوں اور انھیں سُلجھانا اس کی اپنی ذاتی ذمہ داری ہو۔ میں اور عینی بیگم (قرۃ العین حیدر کو ہم سب اسی نام سے پکارتے تھے) اسٹیشن گئے اور چند ادیبوں کو ان کی قیام گاہ تک پہنچا دیا۔ انھیں ادیبوں میں سفید گرم چادر لپیٹے ایک صحت مند نوجوان سی لڑکی بھی تھی۔ تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی خاتون ہیں جن کے افسانے میں نے "لیل و نہار" میں پڑھے تھے۔ نام جس نے آج ساری اردو دنیا میں مسلسل اور اچھا لکھنے سے اعتبار کا درجہ پا لیا ہے، جمیلہ ہاشمی تھا، اسے نام کی مناسبت کہیے یا تذکیر و تانیث کی مطابقت۔ اس دن سے مرنے کے دن تک، دوستی و خلوص کا رشتہ ماہ و سال کی گردش سے بے نیاز ہو کر قائم رہا۔ آج یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ رشتہ سدا سے تھا اور سدا رہے گا۔ جمیلہ ہاشمی کا نام نیا دور کراچی کی مجلسِ ادارت کی آج تک زینت ہے۔

ابھی پچھلے دنوں جمیلہ ہاشمی ۸ر دسمبر ۱۹۸۷ء کو، میری بیٹی فرح کی شادی میں شرکت کے لیے کراچی آئی تھیں اور ۷ار دسمبر ۱۹۸۷ء کو ان سے میری آخری ملاقات ہوئی تھی جب وہ شادی کی تقریبات سے نمٹ کر اپنی بیٹی عاشی کے ساتھ اپنے گاؤں خانقاہ شریف جا رہی تھیں۔ ان دس دنوں میں وہ خوش و خرم رہیں۔ لڑکیوں کے ساتھ گانے بجانے میں شریک رہیں۔ مہندی میں آئی گئیں۔ ولیمے میں شرکت کی۔ پرہیز بھی کیا۔ بد پرہیزی بھی۔ پرہیز میری مروّت میں اور بد پرہیزی اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر۔ میں شاید واحد آدمی تھا جس کا وہ لحاظ کرتی تھیں۔ ایسا لحاظ جیسا بہنیں بھائیوں کا کرتی ہیں۔ وہ ذیابیطس کی مریض تھیں۔ میٹھا کھا رہی ہوتیں تو مجھے دیکھ کر پلیٹ دور کر دیتیں۔ جس دن بد پرہیزی کا ارادہ ہوتا اور نیت ڈانواڈول ہوتی تو میرے ساتھ کھانا نہ کھاتیں: جمیل صاحب! میں نے ناشتہ دیر سے کیا ہے۔ میں بعد میں ٹھہر کر کھاؤں گی۔ جب لاہور یا خانقاہ شریف سے آتیں تو میرے سب بہن بھائیوں سے ملتیں۔ میری بیوی کی تو ایسی گرویدہ تھیں کہ تعریف

کرتے کرتے زبان سُوکھ جاتی۔ اپنی بیماری کا کبھی ذکر نہ کرتیں۔ جمیلہ بی کیسی ہیں آپ۔ میں پوچھتا۔ اچھی ہوں جمیل صاحب۔ نیا ناول شروع کر دیا ہے۔ موضوع فوراً بدل جاتا اور مسلم اسپین کی تاریخِ پارینہ کا قصّہ چھڑ جاتا جس پر وہ اپنا نیا ناول لکھنے کی تیاری گذشتہ دو سال سے کر رہی تھیں۔ جمیل صاحب! یہ ناول آپ کو پسند آئے گا اور اس بار آپ مجھ سے ضرور کہیں گے: جمیلہ بی! یہ وہ تحریر ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ میں بھی جمیلہ بی سے بہت توقعات رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ایسے ناول یا افسانے لکھیں کہ زندگی ہی میں کلاسیک بن جائیں۔ آج جب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں میں اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ جمیلہ ہاشمی نے اردو ادب کو ایسی کہانیاں، ناولٹ اور ناول دیے ہیں کہ اُن کا نام تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ آتشِ رفتہ، روہی اور دشتِ سُوس وہ ادب پارے ہیں جو آنے والے زمانوں میں بھی تازہ و زندہ رہیں گے۔

۱۹۷۹ء میں میری بیوی اور جمیلہ ہاشمی نے حج کا پروگرام بنایا۔ طے پایا کہ میں اور میری بیوی کراچی سے جدّہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور جمیلہ ہاشمی اور اُن کے میاں سردار احمد اویسی لندن سے جدہ ہوتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچیں گے اور ہم سب ۱۸ اکتوبر کو معلم کے یہاں ملیں گے۔ ۱۸ اکتوبر کو ہم دونوں سارے دن ان کا انتظار کرتے رہے مگر وہ ..... نہیں آئے۔ تین چار دن بعد کسی نے کراچی کا اخبار "جنگ" لا کر دیا تو ایک خبر پر میری نظر جمی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ میاں سردار احمد اویسی اُس وقت وفات پا گئے جب اُن کا جہاز جدّہ کے ہوائی اڈے پر اُتر رہا تھا۔ ان کی میت کراچی واپس لائی گئی۔ جمیلہ ہاشمی اور ان کی اکلوتی بیٹی عائشی ساتھ تھے۔ سردار احمد ہیرا آدمی تھے۔ سیدھے سادے، شریف النفس اور وضع دار۔ جمیلہ ہاشمی کا ایسا خیال رکھتے جیسے مالی تازہ گلاب کا رکھتا ہے۔ ساری ذمہ داری، گھر کی، باہر کی، خود اٹھاتے اور جمیلہ کو لکھنے پڑھنے کے لیے تازہ دم رکھتے۔ جو وہ کہتیں وہ کرتے۔ عائشی کو ہر دم اپنے ساتھ رکھتے، جو اُس کے مُنہ سے نکلتا پورا کرتے۔ ناز و نعم میں پلی بچّی اب بن باپ کے رہ گئی تھی اور جمیلہ بھی جائداد کے جھگڑوں اور مقدموں سے نمٹنے کے لیے اکیلی رہ گئی تھیں۔ جس پامردی سے انھوں نے زندگی کے جھمیلوں کا مقابلہ کیا

جمیلہ کی زندگی کا وہ پیارُخ سامنے آیا جواب تک چھپا ہوا تھا۔ انھوں نے بیٹی کے ساتھ مل کر زمینوں اور جائداد باغ کے انتظام کو ایسے سلیقے سے چلایا کہ سب دیکھتے رہ گئے۔ پہلے باپ کی لاش عاشی اپنے گاؤں لے کر گئی تھی اور ۱۱ جنوری ۱۹۸۸ء کو وہ اپنی ماں کی لاش اپنے گاؤں لے کر گئی تاکہ آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دے۔ مصحفی نے کہا تھا:

کیا تماشا نظر آتا ہے انھیں، حیراں ہوں

یار کیوں خاک کے پردے میں چلے جاتے ہیں

۱۰ جنوری ۱۹۸۸ء ــــ میں اسلام آباد میں تھا کہ کراچی سے فون آیا۔ جمیلہ ہاشمی بہت بیمار ہیں اور انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں کل رات سے داخل ہیں۔ میں نے لاہور ٹیلی فون کیا۔ عاشی نے اٹھایا۔ وہ رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امّی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انکل میں کیا کروں۔ میں نے تسلی دی۔ ڈھارس بندھائی اور کہا میں ابھی دوبارہ فون کرتا ہوں۔ کشور ناہید کو فون کیا۔ وہ نہیں ملیں۔ سائرہ ہاشمی کے گھر فون کیا۔ وہ بھی نہیں ملیں۔ انتظار حسین کو فون کیا وہ بھی نہیں ملے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج لاہور خالی ہوگیا ہے۔ دوبارہ عاشی کو فون کیا۔ جمیلہ ہاشمی کے بہنوئی یعقوب خان صاحب بول رہے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ کل رات ساڑھے دس بجے کے قریب اچانک طبیعت خراب ہوئی، فوراً ہسپتال لے گئے۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو بلڈ پریشر کی مشین خط مستقیم بنا رہی تھی۔ خون میں شکر کی سطح ۳۹۶ ہوگئی تھی اور اسی وجہ سے دماغ متاثر ہوگیا تھا۔ رات سے لے کر دوسرے دن ایک بجے تک انھیں زندہ کرنے اور زندہ رکھنے کی کوششیں مسیحائے لاہور کرتے رہے۔ جب سانس کا دھاگا ٹوٹنے لگتا تو وہ سانس بحال کرنے اور زندہ کرنے کے لیے پسلیوں اور سینے کو دباتے۔ بجلی کے جھٹکے دیتے۔ اس عمل سے پسلیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ دس بارہ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد وہ آس نراس کی کیفیت سے باہر نکلے اور ایک بج کر تین منٹ پر اعلان کیا کہ مریض نے دم توڑ دیا ہے اور وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ میں نے پوچھا عاشی کہاں ہے؟ وہ دہاڑے مار کر رو رہی تھی۔ انکل میں کیا کروں۔ امّی مجھے چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ میں نے مقدور بھر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا میں جلد پہنچتا ہوں۔ اس وقت تک جمیلہ ہاشمی کی میت ہسپتال میں تھی۔ گھر

نہیں آئی تھی۔ میں نے اسلام آباد سے لاہور پہنچنے کے انتظامات کیے اور ساڑھے تین بجے کے قریب پھر فون کیا۔ عاشی فون پر تھی۔ اب اُس کے آنسو سوکھ چکے تھے اور سارا غم دل میں اُتر گیا تھا۔ انکل میں امی کی تدفین کہاں کروں۔ "بیٹا!" میں نے کہا "اپنے گاؤں میں۔ میں انشاءاللہ ۱۲/۴ بجے کے جہاز سے پہنچ رہا ہوں"۔ انکل تو پھر ہم میت کو ایک گھنٹے میں خانقاہ شریف لے جائیں گے۔ میں نے پھر تسلی تشفی کی باتیں کیں اور فون رکھ دیا۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ اختر جمال کا فون آیا۔ بھائی! میں نے بہن سے بات کی ہے۔ میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ خانقاہ شریف چلوں گی۔ ۱۱ر جنوری کو ہم تینوں اسلام آباد سے لاہور، لاہور سے ملتان اور ملتان سے گاڑی میں خانقاہ شریف پہنچے تو ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ قبرستان پہنچے تو جمیلہ ہاشمی کی کچی قبر پر حافظ صاحب قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔ جھاڈٹ کی ہوا تیر کی طرح جسم میں پیوست ہو گئی۔ ہوا سرد اور تیز ہو تو آنسو بھی آجاتے ہیں۔ میں نے آنسو پونچھے اور ہوا کے رُخ کی طرف پیٹھ کر لی۔ فاتحہ پڑھی اور جمیلہ ہاشمی کے باغ میں آگیا جہاں گلاب کے بے شمار پودے دَم سادھے چُپ چاپ کھڑے تھے۔ کشور ناہید اور نثار عزیز بٹ تصویرِ غم بنی ساکت وصامت سر جھکائے بیٹھی تھیں اور مصحفی مجھ سے کہہ رہے تھے:

تھی جن سے گفتگو ہمیں، وہ یار مر گئے
جنسِ سخن کے اپنی خریدار مر گئے

(یکم فروری ۱۹۸۸ء)

عصمت چغتائی

عصمت چغتائی کے افسانے اور ناول ساری اُردو دُنیا میں شوق و دل چسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ متعدد زبانوں میں اُن کی کہانیوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ عصمت چغتائی نے اپنی کہانیوں کے ذریعے متوسط طبقے کی اُن عورتوں کی ترجمانی کی ہے جو اب تک گونگی اور بے نام تھیں۔ انھوں نے اُن کے باطن کی اَن کہی کہانیاں، ایسے دل چسپ انداز اور اُنھیں کی زبان، روزمرہ و محاورہ میں، ایسی بے باکی سے سُنائی ہیں کہ اس سے پہلے ایسی کہانیاں اس طور پر نہیں لکھی گئی تھیں۔ ان عورتوں میں کنواریاں بھی شامل ہیں اور شادی شدہ بھی۔ بے اولاد بوڑھیاں بھی ہیں اور بھرے پُرے گھر میں حکمرانی کرنے والی ساسیں، دادیاں اور نانیاں بھی۔ وہ ایک مقبول اور بے باک افسانہ نگار ہیں۔ وہ جب بھی پاکستان آئیں اہلِ پاکستان نے نہ صرف اپنی محبت اور عقیدت کا برملا اظہار کیا بلکہ پروانہ وار اُن تک پہنچتے رہے۔ ایک لکھنے والے کے لیے یہی عظمتوں کی معراج ہے کہ اس کی تحریریں کتنے لوگوں تک پہنچتی ہیں اور اُن تحریروں کے پڑھنے والے اس کی تحریروں کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ اظہارِ محبت یا اظہارِ عقیدت پڑھنے والوں کی پسندیدگی کا مُنھ بولتا ثبوت ہوتا ہے اور میرا خیال ہے کہ عصمت چغتائی اُن گنے چنے ادیبوں میں سے ایک ہیں جو تقریباً پینتالیس پچاس سال سے مسلسل لکھ رہی ہیں اور جن کی تحریریں آج بھی اسی طرح پسند کی جاتی ہیں، جس طرح پہلے کی جاتی تھیں۔ میں بھی ان کا ایک قاری ہوں اور اس وقت سے ان کی تحریریں پڑھ رہا ہوں جب بحیثیت افسانہ نگار ان کی شہرت کا آغاز ہوا تھا اور ان کے افسانے شاہد احمد دہلوی مرحوم کے ساقی دہلی میں شائع ہوتے تھے۔ اس وقت میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا۔ یہ بات ۴۲/۴۳ء

کی ہے کہ کالج کی لائبریری میں ایک کتاب آئی۔ کتاب کا نام تھا "میرا بہترین افسانہ" اور اس کے مرتب تھے محمد حسن عسکری۔ اس میں ۱۵ افسانے شامل تھے اور ہر افسانہ نگار نے اپنے بہترین افسانے کی نشان دہی کی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے یہ کہانی کیوں پسند ہے۔ اس میں کم و بیش وہ سب افسانہ نگار شامل تھے جو آج اپنی عظمتوں کی انتہاؤں پر پہنچ چکے ہیں یا اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ مجھے یاد ہے اس مجموعے میں سعادت حسن منٹو، علی عباس حسینی، غلام عباس، کرشن چندر، اختر اورینوی، راجندر سنگھ بیدی، چودھری محمد علی اور اور رشید جہاں اور خود حسن عسکری صاحب کے افسانے بھی شامل تھے یہ سب لوگ وفات پا چکے ہیں اور اوپندر ناتھ اشک، اختر حسین رائے پوری، دیوندر ستھیارتھی، ممتاز مفتی اور عصمت چغتائی کے بھی افسانے شامل تھے۔ اس مجموعے میں اکثر ایسے افسانے بھی شامل تھے جو آج بھی اردو کے بہترین افسانے شمار ہوتے ہیں مثلاً چودھری محمد علی کا تیسری جنس، راجندر سنگھ بیدی کا دس منٹ بارش میں، سعادت حسن منٹو کا کالی شلوار، غلام عباس کا آنندی، محمد حسن عسکری کا حرام جادی اور عصمت چغتائی کا افسانہ "تل"۔ آج چالیس پینتالیس سال بعد جب ان افسانوں کو یادوں کی بستی کے گلی کوچوں میں دریافت کرتا ہوں تو دو قسم کی خوشبوؤں سے دل و دماغ معطر ہو جاتا ہے۔ ایک خوشبو اس چیز سے پیدا ہوئی تھی کہ افسانہ نگار نے "کہانی" کے موتی براہِ راست متلاطم زندگی کے سمندر سے حاصل کیا تھا۔ دوسری خوشبو اس تخلیقی عمل سے پیدا ہوئی تھی جس کے ذریعے افسانہ نگار نے اس اثر کو "لفظوں کی مدد سے" کہانی کے نقش میں اس طور پر بُنا تھا کہ کہانی کا وہ اثر پیدا ہو گیا تھا جس نے خود افسانہ نگار کے اندر پرورش پا کر اسے کہانی لکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اسی لیے اس دور کی کہانیاں، آج کے دور کی کہانیوں کے برخلاف، بہت زیادہ مقبول تھیں۔ نہ یہاں علامتوں کا مسئلہ تھا کہ جس نے ابلاغ کو بے معنی بنا دیا ہے اور نہ اظہار کی سطح پر وہ پھوہڑ پن تھا جو آج کی کہانیوں میں عام طور پر نظر آتا ہے۔ اس وقت کے لکھنے والے زبان و بیان پر قدرت رکھتے تھے۔ اظہار کو ادب کی بنیادی خصوصیت سمجھتے تھے۔ غلط زبان لکھنے پر فخر نہیں کرتے تھے اور اپنی بات کو اظہار کا جامہ پہنانے کے لیے

محنت کرتے تھے۔ اسی لیے ان لوگوں کی وہ کہانیاں جو آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے لکھی گئی تھیں آج بھی ہمارے احساس کے تاروں کو اسی طرح مرتعش کرتی ہیں جس طرح اس وقت کرتی تھیں جب وہ لکھی گئی تھیں۔ عصمت چغتائی کی کہانیاں اس وقت بھی اور آج بھی دو باتوں کی وجہ سے پسند آتی تھیں۔ ایک یہ کہ انھوں نے اپنے تجربے کے تانے بانے کو پُراثر انداز میں کہانی کا روپ دیا تھا اور دوسرے اسے روزمرہ کی عام زبان میں ایسے سلیقے اور سگھڑپن سے بیان کیا تھا کہ پڑھنے والا زبان و بیان کی دلکشی سے کہانی کے اثر میں آجاتا تھا۔ یہی وہ عمل ہے جو آج بھی موثر ہے اور ہمارے نئے لکھنے والوں کو عصمت چغتائی کی کہانیوں کے فن سے اسے سیکھنا چاہیے۔

(۲۰ر مارچ ۱۹۸۶ء)

رضیہ فصیح احمد کے افسانے

افسانہ ہمیشہ سے ادب کی مقبول ترین صنف رہا ہے اور یہ صنف آج بھی اسی طرح مقبول ہے لیکن یہ شکایت عام طور پر سننے میں آتی ہے کہ آج کل افسانوں کے مجموعے نہیں بکتے۔ اس کے برخلاف یہ بھی اپنی جگہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی رسالہ بغیر افسانوں کے فروخت نہیں ہوتا۔ اس سے اس بات کا پتا چلا کہ افسانہ رسالوں میں تو مقبول ہے لیکن کتاب میں نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ افسانے چوں کہ پہلے رسالوں میں شائع ہو جاتے ہیں اور پڑھنے والے عام طور پر انھیں وہیں پڑھ لیتے ہیں، اس لیے جب یہ کتابی شکل میں آتے ہیں اور افسانوں کا قاری افسانوں کے مجموعے پر نظر ڈالتا اور دیکھتا ہے کہ یہ افسانے تو اس کے پڑھے ہوئے ہیں تو وہ جلدی سے کتاب بند کر کے اسی جگہ رکھ دیتا ہے جہاں سے اُس نے اٹھائی تھی۔ قاری کا یہ رویہ افسانوں کے مجموعوں کے ساتھ اس لیے درست ہے کہ زمانۂ قدیم کے دانشوروں کا یہ نیک مشورہ کہ "زن بیوہ مکن گرچہ حور است" اس کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ دوسری طرف گذشتہ دس بارہ سال میں ایک اور تبدیلی آئی ہے۔ پہلے ہر رسالہ ادبی رسالہ ہوتا تھا جس میں افسانے بھی ہوتے تھے اور فکری و تنقیدی مضامین بھی۔ مسائل و مباحث بھی ہوتے تھے اور شعر و شاعری بھی۔ قاری ان سب چیزوں میں ایک ساتھ دلچسپی لیتا تھا لیکن اب ڈائجسٹوں نے ہر قسم کے افسانوں کا ٹھیکہ اٹھا لیا ہے۔ وہ پڑھنے والے کو اندھا کر دینے والی نہایت باریک کتابت میں اپنی زبان کے افسانوں کے علاوہ، دُنیا کی دوسری زبانوں کے افسانے اخذ و ترجمہ

کرکے چھاپتے ہیں اور پانچ سات روپے میں ڈھیر سارا سستا مال قاری کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔ اسی لیے عام قاری سستی رومانی، معاشرتی، جاسوسی، جنسی، شہوانی، تاریخی، مذہبی، تبلیغی، سوانحی، فراری کہانیوں کے لیے اردو زبان میں چھپنے والے لاتعداد ڈائجسٹوں سے رجوع کرتے ہیں۔ انہیں ڈائجسٹوں میں منٹو، کرشن چندر، عصمت، بیدی، غلام عباس، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، ابوالفضل صدیقی، رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے اچھے اور بُرے لکھنے والوں کے افسانے بھی مل جاتے ہیں۔ ڈائجسٹوں میں محمود و ایاز ایک صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ڈائجسٹوں کی حیثیت اس ٹھیلے کی سی ہے جس پر ہر قسم کا سامان رکھا ہے اور اس کا مالک زور زور سے آواز لگا کر کہہ رہا ہے۔ "ہر مال ملے گا چار آنے"۔ ڈائجسٹوں نے اسی لیے افسانے کے مجموعوں کی اشاعت کو شدت سے متاثر کیا ہے۔ اب ایسے پیغمبری وقت میں اگر کوئی افسانہ نگار اپنا مجموعہ شایع کراتا ہے تو ہمیں مل کر اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے اور دل کھول کر اُسے مبارک باد دینی چاہیے۔

رضیہ فصیح احمد ہماری اُن خواتین افسانہ نگاروں میں سے ایک اور ممتاز ہیں، جنھوں نے ناول اور افسانے میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اُن کے اب تک چھ ناول ــ یمیں، آبلہ پا، اک جہاں اور بھی ہے، انتظارِ موسمِ گُل، متاعِ درد اور آزارِ عشق کے نام سے شایع ہو چکے ہیں۔ "آبلہ پا" پر اُنھیں ۱۹۶۴ء کا "آدم جی ادبی انعام" بھی ملا تھا اور انعام کی اُسی رسمِ تُل میں میری اُن سے ڈھاکہ میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان چھ ناولوں کے علاوہ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ "دو پاٹن کے بیچ" اور ایک ناولٹ "تپتی چھاؤں" بھی شایع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے کہانیوں کا مجموعہ "آنکھ مچولی" کے نام سے اور ایک سفرنامہ "سیرِ پاکستان" بھی شایع ہو چکا ہے۔ وہ شاعری بھی کرتی ہیں اور شاید مجھ سے بہتر شعر کہتی ہیں اور ساتھ ساتھ تصویریں بھی بناتی ہیں اور مجھ سے بہتر تصویریں بناتی ہیں۔ لیکن میں اپنی طرح ان کی شاعری و مصوّری کے عمل کو "ہیرا پھیری" کے ذیل میں لاتا ہوں۔ ان کی مصوّری تو اس کام بھی نہ آئی کہ وہ اپنے افسانوں کے اس اچھے سے مجموعے 'بے سمت مسافر' کا سرورق ہی بنا لیتیں۔ رضیہ فصیح احمد نے ڈرامے بھی لکھے ہیں اور بہت سے افسانے بھی جو ابھی بصورتِ کتاب وجود میں آنے کے لیے بے تاب

ہیں۔

رضیہ فصیح احمد کے اس مجموعے (بے سمت مسافر) میں پانچ اچھے افسانے شامل ہیں جن میں سے تین یعنی آگ اور پانی، پہلی دراڑ اور آشیاں گم کردہ، نیا دور میں شایع ہو کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکے ہیں۔ یہ پانچوں افسانے رضیہ فصیح احمد کے فنِ افسانہ نگاری کے نمایندہ افسانے ہیں اور یقیناً یہ ایسے افسانے ہیں جنھیں ایک سے زیادہ بار دلچسپی کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد اپنے افسانوں کے تاروپود متوسط طبقے کی گھریلو زندگی سے بُنتی ہیں۔ وہ متوسط طبقہ جو رسم پرست اور بزدل ہے، جو جھوٹی عزت و ناموس، خاندانی وقار اور اقدار کو بندریا کی طرح مُردہ بچّے کو سینے سے چمٹائے ہوئے ہے۔ یہ وہی متوسط طبقہ ہے جس کا خود رضیہ فصیح احمد ایک حصّہ ہیں اور اسی لیے جب وہ اس طبقے کی کہانی سُناتی ہیں تو ان کہانیوں کی واقعیت اور سچّائی ہمیں متاثر کر کے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ "بے سمت مسافر" میں اسی متوسط طبقے کا ماحول، زبان اور کردار سامنے آتے ہیں۔ اُن کے افسانوں میں دو قسم کے کردار ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایک وہ جو اس طبقے کے خیالات اور جذبات و احساسات کا نمایندہ ہے اور دوسرا وہ جو اس سے باغی ہے۔ "ڈائن" کی ندرت اور "پہلی دراڑ" کا امجد باغی نوجوانوں کے نمایندہ ہیں۔ "پہلی دراڑ" اس نقطۂ نظر سے ایک نمایندہ کہانی ہے جس میں افسانہ نگار نے ایک ایسے متوسط طبقے کی کہانی لکھی ہے جسے اس نے "فسی فیملی" کا نام دیا ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے ایک باغی نوجوان کے الفاظ میں جس کی "ہر روایت خود ساختہ اور بناوٹی ہے۔ ہماری نانی کو دیکھو دھیلا بھر پیار نہیں کرتیں ہم لوگوں کو، مگر جب کوئی آئے گا تو ایک ایک کو بُلائیں گی کہ صبح سے دیکھا نہیں۔ آنکھیں ترس رہی ہیں اور جناب سینے سے لگائیں گی، بلائیں لیں گی، پیار کریں گی اور حکم دیں گی کہ سامنے بیٹھے رہو کہ دل بھر کے دیکھ لوں۔ یار اتنی ہنسی آتی ہے ان کی بناوٹ پر۔ مگر حیرت ہے کہ جیسے سب کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ چُپ چاپ ان کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ میرا تو دم گھٹنے لگتا ہے۔" یہی وہ گھٹن ہے جس سے اس طبقے کی نوجوان نسل دوچار ہے اور جو تیزی کے ساتھ اس مکڑی کے جالے کو نوچ کر پھینک رہی ہے۔ یہی وہ طبقہ

ہے جو تبدیلی کے عمل کو روکتا ہے ، نام نہاد اقدار کا خود کو پاسبان سمجھتا ہے ۔لیکن جب نئی نسل اس جال کو توڑ کر نکلتی ہے تو امجد کا باپ ،کہا ہی جاتا ہے ، حرکتِ قلب کے بند ہو جانے سے مرجاتا ہے ۔" ڈائن " کا ہیرو سعید کار کے نیچے دب کر مرجاتا ہے اور " بے سمت مسافر " کا سجاد عظیم خودکشی کا مصمم ارادہ کرلیتا ہے ۔سعید کی موت پر جب ندرت روتی ہوئی داخل ہوتی ہے تو سعید کی ماں ، جو اس طبقے کی نمائندہ عورت ہے ، ندرت کے بال نوچ کر دیوانوں کی طرح چیخ کر کہتی ہے ۔۔۔ ڈائن کٹنی تو نے آخر میرے بچے کی جان لے کر چھوڑی ! اور ندرت سوچنے لگتی ہے ۔۔" تم اب بھی نہیں سمجھیں کہ ڈائن میں نہیں ، تم ہو ۔سعید کو میں نے نہیں تم نے مارا ہے ۔" اسی طرح آشیاں گم کردہ کی نوجوان لڑکی ببانگِ دہل کہتی ہے کہ " تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لڑکی پٹھانوں کے دقیانوسی ، سوفی صد مردانہ سماجی ڈھانچے میں خوش نہیں رہ سکتی ۔میں اپنی ماؤں کی سی محبت میں یقین نہیں رکھتی ، جہاں مرد کی ہر اچھی بری عادت سے پیار کیا جاتا ہے ۔ایسا پیار جیسا پالتو جانور اپنے مالک سے کرتے ہیں کہ جس وقت بھی آیا اس کے جوتے چاٹنے شروع کر دیے ۔اس نے جب چاہا گود میں لے لیا ، اپنے بستر میں سُلا لیا اور جب چاہا ٹھوکر سے پرے دھتکار کر شکار پر چلا گیا ۔پڑھی لکھی لڑکی کو جیون ساتھی چاہیے نہ پوجا کے لیے لمبا چوڑا اپالو کا مجسمہ ، نہ رات کے لیے کوئی گھگو ۔" بے سمت مسافر " کے سارے افسانوں میں یہ کش مکش نظر آتی ہے ۔رضیہ فصیح احمد نے اس طبقے کی منافقت اور جذباتی مسائل کا پردہ بے باکی سے چاک کیا ہے ۔

رضیہ فصیح احمد کا اسلوب ان کے افسانوں کے مزاج و ماحول کے عین مطابق ہے ۔ اس میں دلچسپ روانی بھی ہے اور زبان کا ٹکسالی پن بھی ،لیکن ان کی عبارت میں انگریزی الفاظ کا استعمال بُری طرح کھٹکتا ہے ۔گذشتہ چار پانچ سال سے اس رُجحان نے پھر زور پکڑا ہے کہ ہمارے لکھنے والے انگریزی الفاظ کافی تعداد میں استعمال کرنے لگے ہیں ۔ اس عمل سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ہم پھر سے مغرب کی طرف جا رہے ہیں اور اپنے باطن کی گہرائیوں میں ہم نے اپنی تہذیب کو مسترد کر کے مغرب کی فکر و تہذیب کو قبول کرنے کا ارادہ کر لیا ہے ۔یہ عمل سرسید کے دور میں شروع ہوا تھا اور ہماری تہذیب کی روح اور مزاج کو بدل گیا

تھا۔ اس کے زیرِ اثر نہ صرف ہماری خواہشیں، ہماری منزلیں، ہمارے خواب، ہمارے اسالیب بیان اور ہماری اصنافِ ادب بدل گئی تھیں، بلکہ اردو زبان کے جُملے کی ساخت بھی بدل گئی تھی۔ آج جو ہم نثر میں جُملے لکھتے ہیں وہ میرامن کی "باغ و بہار" یا شاہ عالم آفتاب کے "قصص العجائب" سے اسی لیے بالکل مختلف ہیں۔ یہ وہ نثر بھی نہیں ہے جو غالب کے خطوط میں نظر آتی ہے۔ اب اُردو جُملے پر انگریزی جُملے کی ساخت کا گہرا اثر ہے۔

جب تہذیب بدلتی ہے تو اس تہذیب کے اسالیب اور جُملے کی کی ساخت بھی بدل جاتی ہے لیکن اگر یہ تبدیلی ہمارے شعور کا ایک حصّہ بن کر آتی تو اس صورت میں ہماری تخلیقی توانائی بھی باقی رہتی لیکن ہمارے ہاں یہ عمل بے سوچے سمجھے ہو رہا ہے اور ہم رفتہ رفتہ کمزور تخلیقی قوت والی ایک ایسی بے جان سی "چیز" بنتے جا رہے ہیں جیسے ہم ایک ایسی کاربن کاپی ہیں جس کو دیکھ کر یہ تو پتا چلتا ہے کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے لیکن کیا لکھا ہوا ہے آتشیں شیشہ لگا کر بھی اس کا پتا نہیں چلتا۔ ہمارا موجودہ ادب اسی صورتِ حال کا ترجمان ہے اور اسی لیے وہ خود بھی ایک ایسی کاربن کاپی بنتا جا رہا ہے جسے پڑھا نہیں جا سکتا۔ ہمارا معاصر ادب بحران، بے جہتی، عدم شعور، انتشار کا اظہار تو کر رہا ہے لیکن وہ اپنے قاری کو اپنے معاشرے کو کوئی جہت یا سمت نہیں دکھا رہا ہے۔ یہی بے سمتی ہمارا اجتماعی اور تہذیبی المیہ ہے اور رضیہ فصیح احمد اسی بے سمتی کے المیے کی ترجمان ہیں۔

(۲۴ رمئی ۱۹۷۹ء)

مشرف احمد کے افسانے

مشرف احمد ان نئے افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے تخلیقی سفر کو نہ صرف میں نے بغور اور مسلسل دیکھا ہے بلکہ جن کی تحریروں کو میں نے دل چسپی اور توجہ سے پڑھا ہے۔ ویسے بھی نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو میں ہمیشہ دل چسپی سے پڑھتا ہوں اور ان لکھنے والوں کی تحریروں کو تو خاص طور پر مسلسل پڑھتا رہتا ہوں جن میں تخلیقی جوہر کی چمک مجھے نظر آتی ہے۔ اسی لیے ان تمام افسانہ نگاروں کے تخلیقی سفر کا میں عینی شاہد ہوں جو آج کے ادبی منظر کا حصہ بن گئے ہیں یا بننے والے ہیں۔ ادب تخلیق کرنا جان جوکھوں کا کام ہے جو مسلسل ریاض اور محنت کے ساتھ بے لوث عشق کا طالب ہوتا ہے۔ جو لوگ ادب سے پورا عشق نہیں کرتے یا اس عشق کو دیوانگی نہیں بننے دیتے، وہ ذرا دیر کو نور و روشنی ضرور پھیلاتے ہیں اور پھر شہاب ثاقب کی طرح کائنات کی گہری تاریکیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ مشرف احمد نے ادب سے نہ صرف عشق کیا ہے بلکہ دیوانہ وار اس کی تلاش میں سفر بھی کیا ہے اور اب کئی سال کے بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "جب شہر نہیں بولتے" سامنے آیا ہے۔ وہ جب اپنا مجموعہ میرے لیے لائے تو میں نے فہرست پر نظر ڈال کر کہا کہ ۲۳ افسانوں میں سے چار ایسے ہیں جو میں نے نہیں پڑھے تو انھیں اس لیے حیرت نہیں ہوئی کہ ان کو معلوم تھا کہ میں اکثر ان کے افسانوں کے بارے میں بات کرتا رہا ہوں۔ لیکن اب تک یہ باتیں میں صرف ان سے ہی کرتا رہا ہوں اس لیے ضروری ہے کہ آج مشرف احمد کے افسانوں کے بارے میں آپ سے بھی کچھ باتیں کروں۔

مشرف احمد کے افسانوں کو ہم تین موضوعات میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ ایک وہ افسانے

جن میں بے خبری، تنہائی اور بے بسی کا تاثر ابھرتا ہے۔ ان موضوعات پر انھوں نے زیادہ تر تمثیلی انداز میں لکھا ہے۔ ان افسانوں کو آپ علامتی بھی کہہ سکتے ہیں لیکن علامت نگاری زیادہ پیچیدہ عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں ایک پوری نسل ناکام رہی ہے۔ مشرف احمد کے یہاں علامت نگاری کی کوشش تو ملتی ہے مگر وہ اتنے واضح انداز میں یہ کام کرتے ہیں کہ اگر اسے تمثیلی انداز کہا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

دوسری قسم کے افسانے وہ ہیں جن میں شہری زندگی کو انھوں نے ایک دوسرے انداز سے دیکھا ہے۔ شہر ایک سرد، بے حس، مشینی عفریت کا نام ہے جس کے آہنی پنجوں اور دانتوں کے درمیان انسانی خواب، خواہش اور معصوم آرزوئیں دن رات پستی رہتی ہیں۔ اسی لیے خود انسان ایک خوف زدہ، بے حس، سرد اور مردہ عنصر بن کر رہ گیا ہے۔ اس احساس کو بھی مشرف احمد تمثیلی انداز میں پیش کرتے ہیں اور یہ دونوں موضوعات ان کے یہاں بڑی سچائی اور خوب صورتی سے بیان میں آتے ہیں۔

تیسری قسم ان کے افسانوں کی وہ ہے جن میں وہ پاکستان کے عومی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر لکھتے ہیں۔ ان کو اگر معاشرتی حقیقت نگاری کی روایت میں دیکھا جائے تو یہ وہ بنیادی روایت ہے جس میں مشرف احمد کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسے افسانوں میں ان کے یہاں تلخی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور اسلوب میں طنز کا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔ یہاں تمثیلی انداز اگر وہ اختیار بھی کرتے ہیں تو وہ دھیما نہیں ہوتا بلکہ تیز ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان کی جدید نسل کو یہ احساس اگر ہے تو وہ بے سبب نہیں ہے۔ یہ وہ تینوں موضوع ہیں جن سے بلاشبہ ہماری اجتماعی زندگی کے پورے دور کی نسبت قائم ہے اور مشرف احمد کا زیر نظر مجموعہ ان سب کا احاطہ کر کے ہمارے دور کی روح کو کہانیوں میں بیان کر دیتا ہے۔ اس لیے ان کی کہانیاں زندگی سے قریب ہیں اور اسی لیے میں انھیں "جدید افسانہ نگار" کہتا ہوں۔

مشرف احمد کے افسانوں کا اسلوب اور انداز تحریر بھی ان کے افسانوں کے موضوعات کی طرح تنوع رکھتا ہے۔ یہ اسلوب کہیں بیانیہ ہو گیا ہے، کہیں تمثیلی انداز اختیار کر لیتا ہے

اور کہیں خود کلامی کی سطح پر آجاتا ہے۔ لیکن وہ مبہم کہیں نہیں ہوتا۔ واضح اظہار، صاف اور چمکیلی تصویریں ان کے ہاں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ وہی پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں جو موضوع کا تقاضا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ ہمارے نئے افسانہ نگاروں میں باخبر افسانہ نگار کہلائے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کے چند ایسے افسانوں میں، جن میں ان کا موضوع اور تنوع ایک جان ہو گیا ہے، 'جب شہر نہیں بولتے'، 'خوف'، 'پرندے'، 'درخت'، 'بے نام گلیوں اور محلوں کا نوحہ'، 'موت'، 'دیدار' اور 'شہرِ ہجر' کو شمار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ اسی انداز سے چلتے رہے تو وہ آگے بڑھ کر اپنا نمائندہ اسلوب وضع کر لیں گے، جو یقیناً ان کی پہچان بن جائے گا۔

مجھے مشرف احمد سے، اردو افسانے کے تعلق سے، بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ مستقبل کے منظر میں مشرف احمد مجھے ایک روشن ستارہ بن کر چمکتے ہوئے نظر آرہے ہیں اور اسی لیے مجھے ان کے تخلیقی سفر سے گہری دلچسپی ہے۔

زبان ز نکتہ فرو ماند و راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست (عرفی)

(۱۹۸۶ء)

آصف فرخی کے افسانے

آج سے دو سال پہلے آصف فرخی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "آتش فشاں پر کھلے گلاب" شائع ہوا تھا اور مجھے یاد ہے کہ اس کتاب کی تقریبِ سعید کے پُرمسرت موقع پر میں نے بھی اختصار کے ساتھ اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۸۳ء میں آصف فرخی کی ایک اور کتاب شائع ہوئی اور ہرمن ہیسے کے ناول "سدھارتھ" کا ترجمہ تھا اور اب ۱۹۸۴ء میں ان کے افسانوں کا نیا مجموعہ "اسم اعظم کی تلاش" شائع ہوا ہے اور اسی کے ساتھ دو نئی کتابوں کی نوید دی گئی ہے۔ ایک کہانیوں کا مجموعہ جس کا نام "چیزیں اور لوگ" رکھا گیا ہے اور دوسری کتاب "قطب نما" کے نام سے جس میں لاطینی امریکا کے جدید افسانوی ادب کا انتخاب شائع کیا جائے گا۔ آصف فرخی جس خشوع و خضوع کے ساتھ وظیفۂ ادب کھینچ رہے ہیں مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اردو ادب کو ایسے سدا بہار ادب پاروں سے مالا مال کریں گے کہ آنے والا دور تخلیقی ادب کے حوالے سے آصف فرخی کو مقام ممتاز پر فائز کرے گا۔ کم از کم میں تو یہی سمجھ رہا ہوں اور زیادہ سے زیادہ میری یہی خواہش بھی ہے۔ یہ بات میں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ کہی ہے اور اس لیے کہی ہے کہ تخلیقِ ادب کے لیے جس دیوانگی، جس لگن اور جس تیاری کی ضرورت ہوتی ہے آصف فرخی دن رات اس میں لگے ہوتے ہیں۔ ادب عشق کا نام ہے اور عشق جز وقتی نہیں ہوتا۔ وہ تو ہر پل، ہر لمحہ آپ کے پورے وجود پر چھایا رہتا ہے اور تب کہیں جا کر نام لیلی وردِ زبان ہوتا ہے۔ یہ بات کہہ کر میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ آصف فرخی نے اپنی منزل کو پالیا ہے بلکہ ان کا یہ نیا مجموعہ پڑھ کر یہ بات اور

واضح ہوگئی کہ وہ شہرِ بے چراغ سے "تلاش" کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں تاکہ وہ بکاولی کو پا سکیں۔ اُردو ادب کی نئی نسل میں تلاشِ بکاولی کی یہ خواہش مجھے اُس دورِ گذشتہ کی یاد دلاتی ہے جب مسلمانوں کی روحِ تخلیق ادب کے اسپوں پر سوار آبِ حیات کی تلاش میں نکلی تھی اور ساری دنیا کے کونے کونے کو چھان مارا تھا۔ اسی لیے میں جب آج کے لکھنے والوں کی تحریروں کو پڑھتا ہوں تو تلاش و جستجو اور تجربہ و شعور کے عمل و فکر کو دیکھ کر مجھے اُردو ادب کا مستقبل روشن نظر آتا ہے اور اس مستقبل میں آصف فرخی کا چہرہ مجھے صاف نظر آرہا ہے۔

"اسم اعظم کی تلاش" میں آصف فرخی نے بیک وقت کئی کام کیے ہیں جن پر میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن نہ تو اب اتنا وقت ہے کہ اس کا طلسم میں آپ پر کھولوں اور پھر ہوائی جہاز میں جہاں یہ سطور لکھتے وقت میں ہوں' میرے بائیں طرف جو صاحب بیٹھے ہیں' اخبار پڑھنے کے بہانے' میرے لکھے کو یوں پڑھ رہے ہیں جیسا یہ ان کا نوشتۂ تقدیر ہو۔ بہر حال اختصار کے ساتھ میں اس وقت صرف چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ایک یہ کہ یہ مجموعہ واقعی مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں آصف فرخی نے تکنیک اور اسلوب دونوں کے تجربے کیے ہیں۔ مکاشفہ' عہدِ جدید" اور "یزید کی پیاس" دونوں افسانے تکنیک کو کامیابی سے برتنے کی مثال ہیں۔ اسلوب میں آصف فرخی نے کئی لہجوں اور انداز کو ملا کر ایک رنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں اَسطور کی رمزیت، داستانی انداز، مقدس صحیفوں کے اندازِ بیان اور تصوف کے مزاج کو شامل کر کے افسانے کی فضا کو پُر اثر اور طلسماتی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی کے ساتھ سوال کو جواب اور جواب کو پھر سوال بنا کر پلٹنے کے عمل سے اسلوب میں پُراسراریت کا تاثر پیدا کیا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے یہ کہانیاں ان تاثرات کا اظہار ہیں جو معاشرے کے حوالے سے تخلیقی ذہن کے اس کرب سے پیدا ہوئی ہیں جس سے نئی نسل دوچار ہے۔ یہ عمل خارج میں نہیں بلکہ باطن کے نہاں خانوں میں ہو رہا ہے۔ اسی لیے جدید نسل خارج سے پلٹ کر باطن میں

اُترنے کو ترجیح دے رہی ہے۔ اس موضوع پر بات یقیناً کی جاسکتی ہے لیکن یہاں تو میں
آصف فرخی اور جدید نسل کے افسانہ نگاروں کے تخلیقی عمل کو بیان کر رہا ہوں جو خوف،
بے یقینی، باطن میں اٹھنے والے سوال، تخیل کی پرواز اور خواب دیکھنے کے امتزاج سے پیدا
ہوا ہے جہاں آصف فرخی کے الفاظ میں "افسانہ گزیدہ ذہن فسانہ سازی کو درون بینی
کا واحد ممکنہ ذریعہ اور کہانی کہنے کو آپ سے اپنے بارے میں باتیں کرنے کا بہترین طریقہ
سمجھتا ہے ......۔ جس میں چیزیں اور لوگ حقیقت سے زیادہ اصلی معلوم ہوں۔
غیر مرئی بھی سامنے آجائے جس کے انجام میں ساری گتھیاں سلجھ جائیں۔ گلفام کو سبز پری
اور لکڑہارے کو جنگل میں کھوئے ہوئے بچے مل جائیں۔" (ص ۲) ان الفاظ میں
آصف فرخی کا ماضی حال اور مستقبل سب موجود ہیں۔ کافکا کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ عام آدمی کو،
جو کیڑا بن گیا ہے کیسے دوبارہ انسان بنائے۔ آصف فرخی کا بھی یہی مسئلہ ہے کہ وہ اس آدمی
کو جو بد دعا کے اثر سے بدصورت مینڈک بن گیا ہے دوبارہ بانکا شہزادہ کیسے بنائیں۔
"کیسے بنائیں" کے لیے اسم اعظم کی تلاش ہی آصف فرخی کے افسانوں کے اس مجموعے
کا بنیادی مسئلہ ہے جس میں قدیم و جدید اثرات اور حکایات و اسطور مل کر، یہ معلوم کرنے
کے لیے، ایک نئے تخلیقی سفر پر نکلے ہیں کہ

"اگر کل صبح تک کہانی کے بادشاہ کو شہرزاد کے قتل سے باز رکھا
تو اس سے پوچھوں گا کہ بار بار بدلتے نیند اور خواب کے اس سلسلے
میں مَیں کہاں ہوں۔" (ص ۵۸)

"کیسے بنائیں" اور "کہاں ہوں" کی تلاش میں، جیسا کہ میں نے ابھی
کہا تھا آصف فرخی نے مختلف اساطیر سے، قدیم مذہبی و نیم مذہبی حکایات و داستانی
روایات سے، بچپن میں کھیلے جانے والے کھیلوں کے بولوں سے، مقدس صحیفوں سے، تصوف
کے کراماتی قصوں اور فلسفیانہ تحریروں سے لہجہ و اسلوب بھی لیا ہے اور نفس مضمون بھی اور ان
سب کی مدد سے شعوری طور پر وہ فنی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دل کشی،
جاذبیت اور پُراسراریت پیدا ہو سکے۔ یہ سب عناصر ابھی عمل امتزاج سے گذر رہے ہیں۔ اس

مجموعے میں آصف فرخی کا فکر و فن "آتش فشاں پر کھلے گلاب" سے یقیناً آگے بڑھا ہے۔ "اسم اعظم کی تلاش" میں ایک جہت ہے اور میرا خیال ہے کہ اگلے مجموعے میں جو "چیزیں اور لوگ" کے نام سے شائع ہوگا وہ علامت نگاری کے حصار سے بھی باہر نکلیں گے۔ میرا یہ بھی خیال ہے کہ اندرون بینی بیرون بینی کے ساتھ مل کر نئے افسانے کو ایک نئی جہت دے سکے گی۔ یہی کام پیغمبروں نے کیا ہے اور یہی کام نئی نسل کے تخلیق کاروں کو بھی کرنا چاہیئے۔

(۱۳ر نومبر ۱۹۸۴ء)

نذرالحسن صدّیقی کے افسانے

نذرالحسن صدیقی مجھے تین وجوہ کی بنا پر عزیز ہیں۔ ایک یہ کہ وہ میرے بزرگ دوست ابوالفضل صدیقی صاحب کے بھتیجے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ خوش اخلاق اور نیک دل انسان ہیں اور تیسری اور اصل بات یہ ہے کہ وہ نئے افسانہ نگاروں میں اپنے انداز اور شعور و احساس کی وجہ سے ممتاز ہیں۔ پچھلے دس پندرہ سال سے ان کے افسانے "نیا دور" میں شائع ہو رہے ہیں بلکہ ان کی افسانہ نگاری نے نیا دور کی گود ہی میں شعور کی آنکھ کھولی ہے اور یہ ان کا پہلا مجموعہ (سرد لہو کا نوحہ) ہے جو کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ افسانہ ویسے تو ادب کی سب سے مقبول صنف ہے لیکن افسانے کی کتاب کم مقبول ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ افسانے کے قارئین جب کتابی شکل میں ان افسانوں کو دیکھتے ہیں جو وہ پہلے ہی پڑھ چکے ہیں تو وہ کوئی ایسی کتاب خرید لیتے ہیں جو انھوں نے نہیں پڑھی ہے۔ ان حالات میں میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو اپنے مجموعے میں کم سے کم آدھے افسانے ایسے شامل کرنے چاہئیں جو پہلے کہیں نہ چھپے ہوں۔

نذرالحسن صدیقی نے گاؤں دیہات کے ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ وہ خود ایک زمیندار گھرانے کے فرد ہیں۔ پاکستان بنا تو وہ اپنے والدین کے ساتھ یہاں آگئے اور اس کے بعد ان کی ساری عمر اسی شہر کراچی میں بسر ہوئی۔ کراچی جو صنعتی و تجارتی مرکز ہونے کے علاوہ پاکستان کا سب سے بڑا شہر ہے۔ جہاں مختلف علاقوں کے لوگ آباد ہیں۔ جہاں ہر بڑے شہر کی طرح وہ سارے مسائل موجود ہیں جن کا تعلق جدید شہری زندگی سے ہے۔ جہاں تضاد کا عفریت اور بدلتی دنیا کے اثرات، سماجی زندگی کو لمحہ بہ لمحہ بدل رہے ہیں، جہاں

زندگی پے چیدہ اور زندگی سے پیدا ہونے والے تجربے اس سے بھی زیادہ پے چیدہ ہیں اور اسی وجہ سے "جدید" افسانہ نگار کا تخلیقی عمل بھی پے چیدہ ہو گیا ہے۔ یہ وہ تجربہ ہے جس سے ابوالفضل صدیقی کی نسل کو واسطہ نہیں پڑا تھا۔ جدید شہر ایک زندہ حقیقت ہے اور نذرالحسن صدیقی جدید شہر کی پے چیدہ زندگی سے پیدا ہونے والی پیچیدہ تہذیبی، ذہنی اور مادی صورت حال کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ جدید شہر جہاں اخلاقی قدروں میں سیلاب آگیا ہے، جہاں دولت نے زندگی کی اہم اور بلند قدر کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ جہاں دولت عزت بھی ہے اور خدا بھی۔ نظام زندگی میں جہاں دولت مرکزی حیثیت اختیار کر لیتی ہے تو مادی قدریں سب قدروں پر غالب آجاتی ہیں اور تضاد نمایاں ہو کر زندگی کو زخمی و بیمار کر دیتے ہیں۔ انفرادی و اجتماعی سطح پر اخلاقی اقدار شکست و ریخت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ نذرالحسن صدیقی نے جدید شہر کی اسی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جہاں فرد کا المیہ اجتماعی المیہ بن کر سامنے آتا ہے۔ اسی لیے میں نذرالحسن صدیقی کو "جدید" افسانہ نگار کہتا ہوں۔ یہاں میں نے لفظ "جدید" "نئے" یا نوجوان کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس افسانہ نگار کے لیے استعمال کیا ہے جو جدید صنعتی شہر کی پیچ در پیچ زندگی سے پیدا ہونے والے تجربات کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتا ہے۔ وہ جدید شہر جہاں احساسِ مرگ اور احساسِ زیست زندگی کے تانے بانے میں بُنے ہوئے ہیں۔ یہی زندگی مجھے نذرالحسن صدیقی کے افسانوں میں ملتی ہے۔

جزئیات نگاری اسی لیے ان کے ہاں ایک فن کا درجہ رکھتی ہے جس سے وہ اپنی کہانیوں میں ایسے رنگ بھرتے ہیں کہ جدید زندگی کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ کرداروں کو وہ اس طرح اُبھارتے ہیں کہ کردار بُنیادی طور پر "ٹائپ" ہوتے ہوئے بھی کہانیوں کے آنگن میں چلتے پھرتے، جیتے جاگتے نظر آتے ہیں خواہ وہ منشی جی (سرد لہو کا نوحہ) ہوں یا کرنل واحدی (ایک دو تین) یا جبّار بھائی چھالیہ والا (روشن اندھیرا) ہوں۔ تکنیکی اعتبار سے بھی ان کے ہاں ایک تنوّع ہے جو دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں خال خال نظر آتا ہے: "سرد لہو کا نوحہ" میں "وقت" کہانی سُناتا ہے۔ کہانی ماضی و حال میں ساتھ

ساتھ چلتی ہے۔ "ایک دو تین" میں معاشرہ کہانی بیان کرتا ہے اور تین الگ کہانیوں کو ایک رشتے میں پرو دیتا ہے۔

نذر الحسن صدیقی ایک باشعور افسانہ نگار ہیں جنھیں یہ معلوم ہے کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں، کیوں لکھ رہے ہیں اور کیسے لکھ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں تیکنیک کا تنوع بھی ہے اور اسلوب کا رچاؤ بھی۔ آج جب علامتی افسانے نے کہانی کا دائرۂ اثر محدود کر دیا ہے اور اردو افسانے کو صرف ایک رنگ میں رنگ کر نامقبول بنا دیا ہے نذر الحسن صدیقی کی کہانیاں جھلسا دینے والی لو زدہ فضا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کے احساس سے پڑھنے والوں کو تازہ دم کر دیتی ہیں۔ ان کے افسانے حسن عسکری صاحب کے افسانوں کی طرح دھیمے دھیمے چلتے ہیں اور پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ جدید افسانہ نگار کے اس مجموعے کو ضرور پڑھیں تاکہ "جدید افسانے" کے بدلتے موسم کا پتا چل سکے۔

سرسیّد احمد خان

سرسیّد احمد خان جو ۱۷ر اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے اور جنھوں نے ۲۷ر مارچ ۱۸۹۸ء کو ۸۱ سال کی عمر میں وفات پائی، جنوبی ایشیا کے ان عظیم رہنماؤں میں سے تھے جن کے افکار اور جن کی قوتِ عمل نے یہاں کے مسلمانوں کی زندگی پر گہرے اور ان مٹ نقوش ثبت کیے۔ ایسے نقوش جن سے انسان کی سوچ بدل جاتی ہے اور جن سے معاشرہ تبدیل ہو کر نئی اور شاداب منزلوں کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں اٹھارویں صدی برصغیر کے مسلمانوں کے زوال کی صدی ہے۔ اس صدی میں تاج محل والی مغلیہ تہذیب انتشار کا شکار ہو کر کم زور پڑ جاتی ہے اور سات سمندر پار سے آنے والی انگریز قوم اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ انگریزوں نے یہ اقتدار چوں کہ مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے وہ اُن سے خاص طور پر اس لیے خائف تھے کہ کہیں دوبارہ مسلمان یہ حکومت ان سے واپس نہ لے لیں۔ اس کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں کو معاشی و سماجی اعتبار سے کم زور کرنے کے لیے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ وہ رفتہ رفتہ کم زور و بے اثر ہو جائیں تاکہ وہ پھر کبھی سر نہ اٹھا سکیں۔ اسی حکمت عملی کے پیش نظر انھوں نے ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کی اور انھیں آگے بڑھایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابھی نصف صدی بھی نہ گذری تھی کہ مسلمان تعلیمی اعتبار سے پیچھے، تجارتی سطح پر کم زور اور معاشی لحاظ سے ٹوٹ گئے۔ ابھی نام کی بادشاہی قائم تھی اور بہادر شاہ ظفر انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے قلعۂ معلّٰی کی چہار دیواری میں مقید تھے۔ ۱۸۵۷ء جسے انگریزوں نے غدر اور مسلمانوں نے جنگ آزادی کا نام دیا، برصغیر کی تاریخ کا اہم موڑ ہے۔ اس سال بہادر شاہ ظفر معزول کر کے رنگون بھیج دیے گئے اور اب نام

کی بادشاہی بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ اس وقت مسلمان قوم ایک شکست خوردہ قوم کی نفسیات کی حامل تھی۔ اقتدار چھن جانے کا غم، پرانی تہذیب کی عمارت گرنے کا دُکھ اور نئے حکمران انگریزوں کے رویے نے انھیں نئی تبدیلیوں کو قبول کرنے سے دُور کر دیا۔ وہ اب بھی اپنے ماضی کی طرف دیکھ رہے تھے اور انھیں اقدار سے وابستہ رہنا چاہتے تھے جو اسلاف سے انھیں ورثے میں ملی تھیں۔ انگریزی تعلیم، جو وقت کی ضرورت تھی، اسے کفر کے مترادف قرار دیا گیا اور انگریزی ملازمت ایک اختلافی مذہبی مسئلہ بن گئی۔ اس طرح ایک عرصے تک مسلمان قوم ان معاشرتی اور تعلیمی تقاضوں سے محروم رہی جن سے برصغیر کی دوسری قومیں فائدہ اٹھا رہی تھیں۔

ایسے میں مسلمان مفکروں کے سامنے یہ بنیادی مسئلہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں میں بیداری کی روح پھونکی جائے تاکہ وہ اپنے اندر کے خول سے باہر نکل کر دورِ جدید کے تقاضوں سے آنکھیں ملا سکیں۔ ۱۸۵۷ء میں سرسید احمد خان کی عمر چالیس برس کی تھی۔ یہ اس دور میں جدید نسل کے نمائندہ تھے۔ سرسید نے اس مسئلہ پر غور کیا، ساری صورتِ حال کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی ساری سیاسی، معاشرتی اور معاشی خرابیوں کا واحد حل یہ ہے کہ انھیں زیورِ علم سے آراستہ کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو نئے خیالات کی طرف مائل کیا جائے اور انھیں ترغیب دلائی جائے کہ وہ بدلے ہوئے منظر میں نئی تہذیب کے صحت مند عناصر کو اپنے اندر جذب کریں۔ یہ آسان کام نہیں تھا۔ اس کا تعلق مسلمانوں کی سوچ اور ان کے اندازِ فکر کو بدلنے سے تھا۔ سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمان نئی تعلیم ہی سے اپنے اوہام اور تعصبات سے نکل کر عہدِ جدید کی نئی قوتوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ۱۸۵۹ء میں انھوں نے مراد آباد میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۸۶۴ء میں غازی پور میں ایک اور اسکول قائم کیا اور اسی سال سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید علوم کی کتابیں اُردو زبان میں ترجمہ کی جائیں۔ متعدد کتابوں کے اردو ترجمے اس سوسائٹی سے شائع کیے گئے۔ ۱۸۶۹ء میں اپنے تعلیمی پروگرام کو آخری شکل دینے کے لیے سرسید نے انگلستان کا سفر کیا تاکہ وہ وہاں کے تعلیمی ادارے دیکھ سکیں اور انھی خطوط پر برصغیر میں مسلمانوں

کے تعلیمی ادارے قائم کرسکیں۔ برصغیر واپس آکر انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا جس کا مقصد نئے خیالات کی ترویج اور مسلمانوں کو توہم پرستی اور جامد خیالات کے حصار سے باہر نکالنا تھا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے مسلمانانِ ہند کی تعلیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی جس کے وہ سکریٹری مقرر کئے گئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق طے پایا کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود انتظام کریں۔ اس رپورٹ میں ایک کالج کا خاکہ بھی پیش کیا گیا۔ ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۵ء تک کالج کے قیام کی ضروری تیاریاں کی گئیں اور ۲۴ر مئی ۱۸۷۵ء کو مسلم اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ میں کھول دیا گیا۔ اس کالج کی تعلیم میں سرسید نے جدید اور قدیم تعلیم دونوں کو ایک نئے نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مشرق اور مغرب کی تعلیم مل کر ایک نئی وحدت، ایک نئی اکائی بن جائے۔ کالج میں جدید تعلیم اور جدید مضامین کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی اہمیت دی گئی۔

سرسید کا نقطۂ نظر ان کے ایک جملے سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ :

"علی گڑھ مدرسہ کے قیام کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہاتھ میں قرآن، دوسرے پر سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج"

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ سرسید مسلمانوں کو بیدار کرکے جہاں جدید علوم اور سائنس سے بہرہ مند کرنا چاہتے تھے وہاں وہ انھیں اپنے مذہب و عقائد سے بھی دور کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ دل سے چاہتے تھے کہ مسلمان مسلمان رہیں اور جدید روشنی سے راہِ حیات میں منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں۔ وہ بدلے ہوئے زمانے کے تیور پہچانتے تھے۔ وہ مسلمانوں کے فکری انجماد کو دور کرنا چاہتے تھے اور انھیں علمی، معاشرتی، سیاسی و ذہنی سطح پر دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کے برابر لانا چاہتے تھے۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان رفتہ رفتہ نئی تعلیم کی طرف آنے لگے اور جلد ہی جدید دور میں داخل ہوگئے۔ یہ سرسید کی فکر ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمان آج جدید علوم سے بہرہ مند ہیں اور ان مسائل کے جال سے نکل آئے ہیں جس میں سرسید کے دور کے مسلمان گرفتار تھے۔

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سر سید نے تین سطحوں پر کام کیا: ایک یہ کہ نئی تعلیم کی طرف رجوع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کو موجودہ احساسِ ذلت سے نکالا جائے اور ان میں عظمتِ رفتہ کا احساس پیدا کیا جائے۔ اس کام کے لیے انھوں نے خود بھی "تہذیب الاخلاق" میں مضامین لکھے اور شبلی نعمانی کو خصوصیت کے ساتھ اس کام پر لگایا۔ شبلی کی بیشتر تصانیف اور مضامین اسی طرزِ فکر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر انھوں نے دوسرا کام یہ کیا کہ مسلمانوں کو فرسودہ رسم ورواج سے نکالنے اور ان کے ذہنوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اجتہاد پر زور دیا۔ تیسرا کام یہ کیا کہ افادہ و عقل کے تصورات کو اپنے مضامین میں ایسی اہمیت دی کہ وہ عام طور پر مقبول ہونے لگے۔ ان فکری عناصر نے مسلمانوں کے بند ذہنوں کے دریچوں کو کھول دیا اور تازہ خیالات کی ہوا سے وہ تازہ دم ہونے لگے۔ سر سید نے بتایا کہ زندگی ایک ایسا راستہ ہے جس پر آگے چلنا ہوتا ہے اور زندگی آگے بڑھنے اور آگے چلنے کا عمل ہے۔

آج یہ باتیں عام اور معمولی نظر آتی ہیں لیکن انیسویں صدی کا تصور کیجیے کہ ان خیالات کو عام کرنے کے لیے سر سید کو کتنی جدوجہد، کتنی کوشش و کاوش، کتنی قوت اور کتنے اخلاص اور کتنی گہری فکر و نظر کی ضرورت پڑی ہوگی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ سر سید نے صرف تعلیمی سطح پر کام نہیں کیا بلکہ ذہنوں کو بدلنے کے لیے ان تمام شعبوں میں کام کیا جن سے مسلمانوں کے فکر و نظر بدل سکیں۔ ان کا یہ دائرۂ کار مذہب سے لے کر علمی و ادبی خدمات تک، سیاسی سرگرمیوں سے لے کر سماجی خدمات تک پھیلا ہوا ہے۔ سر سید احمد کی سرگرمیوں میں آپ کو یکسانیت کے ساتھ فکر و عمل کا اتحاد نظر آئے گا۔ سر سید نے ذاتی طور پر زندگی میں بیک وقت دو سطحوں پر کام کیا۔ ایک سطح غور و فکر اور حکمت عملی وضع کرنے کی تھی اور دوسری سطح اس فکر اور حکمت عملی کو عملی جامہ پہنانے کی تھی۔ انھوں نے فکر اور عمل کو ملا کر ایک کر دیا اور اسی لیے وہ زندگی میں اس کامیابی سے ہم کنار ہو سکے جس کی آج وہ خود پہچان ہیں۔

آج سر سید احمد خان مسلمانوں کے نشاۃ الثانیہ کی علامت ہیں۔ مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب ان کی پہچان ہے اور اس تعلیمی انقلاب کے لیے انھوں نے قلم اور زبان دونوں کو استعمال کیا۔ قلم سے انھوں نے مختلف مسائل و افکار پر جو کچھ لکھا وہ سولہ جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور زبانی جو کچھ کہا اس کے اثرات آج ہمیں نئے ذہن کی صورت میں ورثے میں ملتے ہیں۔ سر سید کی وفات ۱۸۹۸ء سے لے کر اب تک تقریباً ۸۸ سال کا عرصہ گذر چکا ہے اور ان کی فکر کا دریا آج بھی بھرا پُرا بہہ رہا ہے اور ان کا بتایا ہوا راستہ آج بھی نشانِ منزل ہے۔ سر سید نے انگریزی تعلیم کو ہماری تعلیم کا حصہ ضرور بنایا ہے لیکن وہ اس تعلیم کو اُردو زبان کے ذریعے دینے پر ہمیشہ زور دیتے رہے اور اس کو اصل ترقی کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس سلسلے میں سر سید کے اپنے الفاظ میں ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ :

> " انگلستان کی تہذیبی ترقی کی وجہ یہ ہے کہ اس کے تمام ادبی اور سائنسی علوم ملک کی اپنی زبان میں ہیں۔ پس وہ جو ہندوستان کی حالت کو ترقی دینے اور بہتر بنانے کی خواہش رکھتے ہیں یاد رکھیں کہ اس مقصد کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ تمام جدید سائنسی اور ادبی علوم کا اپنی زبانوں میں ترجمہ کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ الفاظ میں موٹے حروف میں ہمالیہ پر لکھ دوں تاکہ آنے والی نسلیں اس کو یاد رکھیں۔"

آج سر سید ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کے یہ الفاظ آج بھی ہماری منزل کا پتہ دے رہے ہیں۔ ہمیں انگریزی کو ضرور سیکھنا چاہیے۔ اور اس پر پوری قدرت حاصل کرنی چاہیئے لیکن اسے ذریعۂ تعلیم نہیں بنانا چاہیئے، ورنہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں کبھی پوری طرح پروان نہیں چڑھ سکیں گی اور ہم ہمیشہ صرف نقل اور پیروی کے راستہ پر چلتے رہیں گے اور اسی طرح دوسری قوموں کی

دیکھتے اور اُن کے محتاج رہیں گے۔ آج پاکستان کے لیے سرسید کا یہی پیغام ہے اور یہی ہماری منزل اور یہی ہمارا راستہ ہے۔ جب تک ہم اس راستے پر نہیں چلیں گے اسی طرح بے شناخت، منتشر اور گمراہ رہیں گے۔

۱۰ر فروری ۱۹۸۶ء

شبلی نعمانی

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برِعظیم کے مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو گئی کہ اب وہ حکمران نہیں رہے۔ مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہو چکا ہے اور انگریز اب اقتدارِ اعلیٰ کے مالک ہیں۔ سلطنت چوں کہ انگریزوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اور ۱۸۵۷ء میں ان کا مقابلہ مسلمانوں سے تھا اس لیے جتنا ظلم و جبر ممکن تھا انگریزوں نے مسلمانوں پر توڑا۔ انگریزوں نے پوری کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان تمام اساسی عہدوں اور کلیدی جگہوں سے ہٹا دے تاکہ آئندہ کسی قسم کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے۔ اس عالم میں مسلمانوں میں شدید احساسِ بے چارگی پیدا ہوا۔ ایک طرف ان کا شاندار ماضی تھا، پُرعظمت مغلیہ سلطنت کے نشانات سارے برِعظیم میں پھیلے ہوئے تھے اور دوسری طرف اب وہ معاشی سطح پر کنگال اور نفسیاتی سطح پر شدید احساسِ محرومی کا شکار تھے۔ یاد رہے کہ ۱۸۵۸ء میں سرسیّد احمد خان کی عمر ۴۱ سال کی تھی اور شبلی نعمانی اِسی سال پیدا ہوئے تھے۔ ان حالات کا جائزہ لے کر سرسیّد احمد خان نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ انگریزی تعلیم حاصل کریں۔ جدید علوم سیکھیں تاکہ بدلے ہوئے منظر میں خود کو پھر سے قائم کر سکیں۔ اگر اس دور میں اور اس موقع پر سرسیّد احمد خان یہ نہ کرتے تو مسلمانوں کی حالت کے سُدھرنے کا امکان بھی باقی نہ رہتا۔ سرسیّد ایک عظیم رہنما تھے۔ عظیم رہنما کبھی اکیلا نہیں چلتا بلکہ اپنے ساتھ ہم خیال لوگوں کا ایک قافلہ لے کر چلتا ہے جس میں جوان اور بوڑھے نئے اور پرانے اور مختلف الخیال لوگ شامل ہوتے ہیں۔ جب ۱۸۷۵ء میں سرسیّد نے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج قائم کیا تو یہ دراصل برِعظیم میں مسلمانوں کی نئی

زندگی کا پہلا مرکز تھا۔ ۱۸۸۲ء میں شبلی نعمانی کی عمر تقریباً ۲۵ سال تھی۔ وہ علی گڑھ گئے، سرسید سے ملے اور ان کے خیالات سے ایسے متاثر ہوئے کہ ان کے گرویدہ ہو گئے اور اسی سال کالج سے وابستہ ہو گئے اور ۱۸۹۸ء میں جب سرسید کا انتقال ہوا شبلی کالج سے الگ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ واپس آ گئے۔

شبلی سرسید کے خیالات سے حد درجہ متاثر تھے۔ سرسید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کی ترقی و عروج کے خواہاں تھے اور چاہتے تھے کہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمانوں کو ذہنی پستی سے نکال کر نئے راستے پر ڈالنا ضروری ہے۔ سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ زندگی ایک راستہ ہے جس پر ہمیشہ آگے چلنا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں خود سرسید نے جو پروگرام بنایا تھا اس کے چار پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کو موجودہ ذلت و پستی کا احساس دلایا جائے۔ دوسرے یہ کہ انھیں اپنی عظمت رفتہ سے واقف کرایا جائے تاکہ ان میں احساس عظمت پیدا ہو کر اعتماد بحال ہو سکے۔ تیسرے انھیں جدید علوم اور سائنس کی تعلیم کی طرف رجوع کیا جائے۔ چوتھے یہ کہ ان کے دل و دماغ میں یہ بات ڈالی جائے کہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو قیامت تک کے لیے آیا ہے۔ یہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے والا مذہب ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں اجتہاد کی اہمیت و ضرورت پر زور دیا جائے تاکہ اسلام جو بظاہر ہندو مذہب کی طرح رسوم و رواج کا شکار ہو گیا تھا پھر سے نئی توانائیوں کو پیدا کر سکے۔ اسی طرح مسلمانوں کے بند ذہن کو کھول کر نئے خیالات کو اس میں داخل کیا جا سکتا ہے۔ شبلی نعمانی سرسید کی اس فکر اور سوچ سے پوری طرح متفق تھے۔ مسلمانوں کو اپنی موجودہ پستی اور ذلت کا احساس دلانے کا کام مولانا الطاف حسین حالی نے کیا اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کے واقعات و تاریخ سے روشناس کرانے، ان میں نیا اعتماد بحال کرنے اور ان میں جذبۂ ترقی کو پیدا کرنے کا کام مولانا شبلی نعمانی نے کیا۔ جب شبلی سرسید کی وفات کے بعد علی گڑھ سے چلے آئے تو اس وقت تک مسلمان اس سمت میں لمبا راستہ طے کر چکے تھے۔ شبلی نعمانی نے نئی نسل کو دیکھ کر، جو اس نئی تعلیم سے بہرہ مند ہو کر سامنے آئی تھی، کہا کہ علی گڑھ کی تعلیم نے کوٹ پتلون تو پہنا دیا ہے لیکن شوقِ علم بیدار نہیں کیا۔ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ ہمیں انگریزی تعلیم و تہذیب

سے اسی قدر لینا چاہیے جس قدر وہ ہمارے لیے ضروری ہے۔ مغرب کی اندھی تقلید مسلمانوں کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسلمانوں نے بنو عباسیہ کے دور میں یونانی علوم کو اس حد تک قبول کیا جس حد تک وہ ان کے لیے مفید تھے اور باقی حصے کو مسلمان مفکروں نے دلائل کے ساتھ رد کر دیا۔ شبلی کے نزدیک کردار، نئی نسل کی ذہنی تربیت اور اسلام پر اُن کے عقیدے کو اسی وقت برقرار رکھا جا سکتا ہے جب وہ اسلام کی تاریخ اس کی عظمت اور اس کی بنیادی فکر سے نہ صرف واقف ہوں بلکہ اس پر پورا اعتماد بھی رکھتے ہوں۔ یہ ایک مثبت نقطۂ نظر تھا اور شبلی نے برِعظیم کے مسلمانوں کی ترقی و بیداری کے لیے انھی خطوط پر کام کیا۔ اسی لیے شبلی نے اپنی تحریروں سے پُرانے علوم سے دل چسپی کو دوبارہ پیدا کیا۔ انھوں نے علم الکلام کو دوبارہ رواج دیا۔ شبلی نعمانی مغرب کی اندھی پیروی کے خلاف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنی روایات، اپنے دین سے وابستہ رہتے ہوئے جدید دور میں داخل ہوں۔ اسی صورت میں وہ صحیح معنوں میں ترقی کر سکتے ہیں۔ صرف مغرب کی پیروی اور انگریزوں کی آنکھیں بند کر کے تقلید سے وہ کہیں کے نہ رہیں گے۔ یہ وہ نقطۂ نظر تھا جو سرسیّد کی تعلیمی و فکری تحریک کا ایک حصہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ تھا اور مسلمانوں کو ترقی کے راستے پر چلانے کا صحیح طریقہ تھا۔

شبلی نعمانی کی تصانیف پر نظر ڈالیے تو ہمیں ان میں غیر معمولی تنوّع نظر آئے گا۔ ایک طرف انھوں نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق اور سیرۃ النبی جیسی تصانیف لکھ کر مسلمانوں کے عظیم شاندار ماضی کی نئی تشکیل کی۔ اسی کے ساتھ فلسفہ و کلام کے ذیل میں علم الکلام، الکلام، الغزالی، سوانح مولانا روم جیسی تصانیف لکھ کر فکر و فلسفۂ کلام کو دوبارہ زندہ کیا۔ ادبیات میں موازنۂ انیس و دبیر اور شعر العجم کے علاوہ ان کے وہ مقالات ہیں جو تعلیمی، تاریخی، ادبی، تنقیدی وغیرہ موضوعات پر لکھے گئے ہیں۔ تاریخ کے ذیل میں تاریخی مضامین اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، خاص اہمیّت رکھتے ہیں۔ یہ سب تصانیف اردو زبان میں ہیں اور اپنے اسلوب اور قوتِ بیان کی وجہ سے ہماری تاریخ کا حصّہ ہیں۔ ان کے علاوہ انھوں نے عربی میں بھی تصانیف کیں اور فارسی و اردو میں شاعری بھی کی۔

شبلی ایک عظیم مصنف، ایک منفرد مفکر، ممتاز عالم اور پرجوش عملی انسان تھے۔ یہ سب چیزیں ایک ذات میں کبھی کبھی جمع ہوتی ہیں۔ شبلی نعمانی وہ عظیم انسان تھے جنھوں نے نئی فکر سے مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا راستہ دکھایا، جنھوں نے اپنے عمل سے اپنی فکر کو عام و مقبول بنایا۔ اپنی تحریروں سے، اپنے مضامین سے، اپنی نظموں سے، اپنی تقریروں سے، اپنی تصانیف سے مسلمان کے اندر ایک نئی روشنی پیدا کی۔ ان کے تنِ مردہ میں ایک نئی روح پھونکی۔ تصنیف کی ایک عظیم روایت قائم کی جو آج بھی زندہ ہے۔ اپنی تصانیف کو اردو زبان میں لکھ کر خود اردو زبان میں نئی قوت و توانائی پیدا کی۔ سر سید احمد خان کی طرح علامہ شبلی نعمانی کا نقطۂ نظر بھی یہی تھا کہ اردو برِ عظیم کی وہ واحد زبان ہے جس کے ذریعے مسلمانوں میں یک جہتی و وحدت پیدا کی جا سکتی ہے۔

شبلی نعمانی نے اس دور میں وہ کام کیا جو ان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا۔ انھوں نے قدیم علوم سے مسلمانوں کی دوبارہ دلچسپی پیدا کی۔ مسلمانوں کی تاریخ کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ لکھا تاکہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اس تاریخ کو دوبارہ دلچسپی سے پڑھ سکیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی تاکہ اس کو تحریک اور ایک ادارے کی شکل دی جا سکے۔ شبلی کا قائم کیا ہوا دار المصنفین آج بھی یہی خدمت انجام دے رہا ہے۔ شبلی کی فکر اور ان کی تحریروں سے مغرب کی اندھی پیروی نئی نسلوں کے لیے قابلِ قبول نہیں رہی۔ شبلی نعمانی نے سر سید تحریک کو اپنے ردِ عمل سے ایک نئی وسعت دے کر مسلمانوں کی رفتارِ ترقی کو تیز اور نئی فکر کو مسلمانوں کی اجتماعی فکر میں شامل کر دیا۔ فکر کا یہ وہی راستہ ہے جسے نئی نسل کے مفکروں نے قبول کیا۔ ۱۹۱۴ء میں شبلی نعمانی کی وفات کے وقت علامہ اقبال کی عمر ۳۷ سال تھی۔ شبلی نعمانی کی فکر اور روایتِ تصنیف و تالیف آج بھی مسلمانوں کی فکر میں جاری و ساری ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی فکر برِ صغیر کی ملتِ اسلامیہ کے خون میں آج بھی گردش کر رہی ہے۔

(۱۹۸۵ء)

اکبر الہ آبادی

میں اس وقت اختصار کے ساتھ اکبر الہ آبادی کے تعلق سے صرف چند باتیں کہنا چاہتا ہوں تاکہ اکبر کا زاویۂ نظر آپ کے سامنے واضح ہو سکے۔

اکبر الہ آبادی کے بارے میں عام طور پر یہ کہا اور سمجھا جاتا ہے کہ وہ مزاح نگار ہیں۔ یہ بات اپنی جگہ درست ہے لیکن صرف ایک حد تک۔ مزاح دراصل اکبر کے لیے اپنی بات کو عوام و خواص تک پہنچانے کا ایک وسیلہ ہے تاکہ لوگ ان کی بات کو دلچسپی سے سن کر لطف اندوز ہوں اور اس کا اثر قبول کریں۔ اکبر کے مزاح میں ایک جہت، ایک زاویۂ نظر ہے جو ہمیں کسی دوسرے شاعر کے ہاں نظر نہیں آتا۔ اس جہت کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر میں انگریزوں کے غلبے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ وہ تہذیب جس نے ایک ہزار سال کے سفرِ حیات میں ایک صورت بنائی تھی وہ ٹوٹ رہی ہے اور اب وہ دن دور نہیں جب یہ تہذیب نئی مغربی تہذیب کے سامنے شکست کھا جائے گی اور اس شکست سے وہ المیہ پیدا ہوگا کہ مسلمان اپنے تہذیبی نظام سے ہٹ کر نہ صرف مغلوب ہو جائیں گے بلکہ اپنی حقیقی تخلیقی قوت بھی گنوا دیں گے۔ وہ فکری سطح پر مقلد اور پیروکار تو ہوں گے لیکن راہبر نہیں بن سکیں گے۔ جب انھوں نے اس بات کو محسوس کر کے تہذیبِ مغرب کی مخالفت کی تو انھیں رجعت پسند کہا گیا۔ دراصل سرسید اور اکبر ہماری قومی زندگی کے دو الگ الگ دھارے ہیں۔ سرسید مغربی تہذیب کے نمائندہ ہیں اور اکبر اپنی اس تہذیب کے ترجمان ہیں جو انگریزی اثرات کے ساتھ کمزور ہو کر بے معنویت کا شکار ہو رہی تھی۔ سرسید کا کام اپنے دور میں مشکل ہوتے ہوئے بھی آسان تھا اور اکبر کا کام آسان ہوتے ہوئے بھی مشکل تھا۔ اکبر نے اپنے دور میں جو کچھ کہا تھا آج وہ حقیقت بن کر

سامنے آگیا ہے۔ ہم تہذیب مغرب کے پرستار بن کر اب صرف اس راستے پر چل رہے ہیں جس راستے پر مغرب ہمیں چلا رہا ہے۔ اب علم وہ ہے جو مغرب سے آتا ہے۔ ایجادات و انکشافات وہ ہیں جو مغرب میں ہوتے ہیں۔ آج اپنے چاروں طرف نظر دوڑائیے تو آپ واضح طور پر دیکھیں گے کہ اب جو کچھ ہمارے گھروں میں، دفتروں میں، زمین و آسمان میں، ہر طرف نظر آتا ہے وہ صرف مغرب کی دین ہے اور وہیں سے آیا ہے۔ ہماری تخلیقی قوتیں اتنی کمزور ہوگئی ہیں کہ ہم اب کچھ کرنے کی شاید صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعے یہی بات بتائی تھی — اُس وقت وہ مبالغہ نظر آتی تھی اور آج وہ حقیقت بن کر ہمیں گلی کوچوں سے لے کر نہ صرف کالجوں، یونیورسٹیوں اور سارے نظامِ زندگی میں بلکہ ہماری روح کے نہاں خانوں میں بھی رواں دواں نظر آتی ہے۔ اس بات کو اکبر کی نظرِ دوررس نے دیکھ لیا تھا اور ایک پیغمبر کی طرح اپنی شاعری کے ذریعے ہم تک پہنچا بھی دیا تھا۔ ادب کا کام صرف دکھانا ہوتا ہے اور اکبر نے یہی ہمیں دکھا دیا۔ آج کے دور میں ادب نے اپنی اہمیت اس لیے گنوادی ہے کہ ہم ہر بات میں افادیت اور فائدے کو دیکھتے ہیں۔ اسی لیے کپڑوں پر استری کرنے والی مشین ہمارے لیے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ ہماری قمیض کی سلوٹیں دور کرکے ہمیں فوری فائدہ پہنچاتی ہے۔ بے چارہ ادب ظاہر ہے کہ یہ کام نہیں کرسکتا لیکن دراصل ادب ہماری روح کی سلوٹیں ضرور دور کرتا ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ روح ہمیں نظر نہیں آتی۔ جب روح نظر نہیں آتی تو اس کی سلوٹیں کہاں نظر آئیں گی؟ اکبر نے شاعری کے ذریعے اپنے دور میں ہماری روح کی سلوٹیں دور کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے انھیں مزاح نگار کہہ کر ذرا دیر کو ان کی شاعری سے لطف تو لیا لیکن بحیثیت مجموعی انھیں رد کردیا اور اسی رد کرنے کی وجہ سے سو سال کے عرصے میں ہماری پوری تہذیب تخلیقی سطح پر بانجھ ہو کر رہ گئی۔ اب ہماری تہذیب نہ مدبّر اور مفکر پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے، نہ علمی و ادبی سطح پر تخلیقی کارنامے انجام دینے کی اہلیت رکھتی ہے اور نہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں کچھ کر دکھانے کی قوت رکھتی ہے۔ اکبر الہ آبادی نے ہمیں یہی بتایا تھا لیکن ہم نے ان کی ہر بات ہنسی میں اُڑا دی تھی۔ اب بفضل تعالیٰ "انجن" ہماری راہنمائی کر رہا ہے اور ہم مغرب کی پٹری سے اُتری ہوئی ریل پر بیٹھے خوشی

سے پھولے جارہے ہیں :

حضرتِ خضر ٹکٹ مجھ کو دلا دیں اکبرؔ
رہنمائی کے لیے ہے مجھے انجن کافی

مال گاڑی پہ بھروسہ ہے جنھیں اے اکبرؔ
ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا

اکبرؔ کی شاعری اور ان کا تہذیبی زاویۂ نظر ہمیں آج بھی دعوتِ فکر دیتا ہے لیکن اب "یہ وہ منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا"۔ اس زاویے سے دیکھیے تو اکبرؔ کی آواز وہ آواز ہے جو نہ صرف پاکستان اور ہندوستان کو بلکہ سارے ایشیا کو زندہ رہنے اور خود کو از سرِ نو دریافت کرنے دعوت دیتی ہے۔ اکبرؔ جیسا شاعر ایشیا کی کسی بھی دوسری زبان میں مجھے نظر نہیں آتا جس نے مغربی تہذیب کے غلبے سے بچنے کے لیے اس دل چسپ اور دل کش انداز میں اپنی جڑوں سے پیوستہ رہنے کی تلقین کی ہو اور قوموں کی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ و باقی رکھنے کا گُر سکھایا ہو۔ اسی لیے میں اکبرؔ کو صرف مزاحیہ شاعر نہیں بلکہ جدید فلسفی شاعر سمجھتا ہوں۔ ایک ایسا فلسفی شاعر جس نے اس وقت ہمیں وہ بتایا جب ہم مجبور تو ضرور تھے لیکن پوری طرح بہرے نہیں ہوئے تھے۔ اکبرؔ الٰہ آبادی کی یاد منا کر الٰہ آباد والوں نے جہاں اپنی وطن دوستی کا ثبوت دیا ہے میرا خیال ہے کہ آج وہ موقع بھی فراہم کیا ہے کہ جہاں سے ہم اپنی جڑوں کی تلاش میں نکل کر خود کو اور اپنی تہذیب کو از سرِ نو دریافت کرنے کا عمل شروع کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں قلمی آم کا پیوند ہمیشہ دیسی پیڑ کی شاخ پر لگتا ہے جس کی جڑیں اپنی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ اکبرؔ الٰہ آبادی بار بار اور طرح طرح سے یہی کہتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے جنابِ سید پر طنز کیا تھا۔

ابتدا کی جنابِ سیّد نے — جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونی ورسٹی پہ ہوئی — قوم کا کام اب تمام ہوا

اکبرؔ الٰہ آبادی کے تعلق سے اور بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن آج کی شام میں آپ سے

یہی کہنا چاہتا ہوں اور صرف یہ سوال پوچھ کر آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ کیا اپنی جڑوں سے رشتہ کاٹ کر آپ اپنی تخلیقی قوتوں کو زندہ و قائم رکھ سکتے ہیں؟ کیا ہماری موجودہ تخلیقی صورت حال اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ ہم اپنی روایت سے کٹ کر تخلیقی سطح پر بالکل بانجھ ہو گئے ہیں اور کیا زندہ و تازہ تخلیقی قوتوں کے بغیر ہم زندگی میں کوئی کام انجام دے سکتے ہیں۔ اکبرؔ نے ہم سے یہی سوال پوچھا تھا اور یہی سوال ہماری تہذیب کے بجھتے ہوئے شمع خانے کے صدر دروازے پر جلی حروف میں آج بھی آویزاں ہے:

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

پہن لے سایہ مری جان اتار کر پشواز
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

۱۰؍ جنوری ۱۹۸۵ء

نیاز فتحپوری

آج سے سو سال پہلے ۱۸۸۴ء میں نئی گھاٹ کے مقام پر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا تاریخی نام ان کے والد صاحب نے لیاقت علی خان رکھا اور والدہ نے نیاز محمد خان رکھا۔ باپ کا رکھا ہوا تاریخی نام تو نہ چلا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لیاقت علی خان کے نام سے ہمیں ایک اور معتبر ہستی کو پہچاننا تھا جس کے یوم شہادت کو اہل پاکستان ۱۶ اکتوبر کو ہر سال مناتے ہیں، لیکن ماں کا رکھا ہوا نام ایسا چلا کہ آج بھی ہم نیاز صاحب کو اسی نام سے پہچانتے ہیں اور آج سو سال بعد ۱۹۸۴ء میں ان کی ولادت کا جشنِ صد سالہ منانے کے لیے ہم یہاں جمع ہوئے ہیں۔ نیاز فتحپوری ہماری تاریخ کا ایک بڑا نام ہے۔ اتنا بڑا کہ آج خود بڑائی کا قد، ہم نیاز فتحپوری کے قد سے ناپتے ہیں۔

فروری ۱۹۲۲ء میں نیاز فتحپوری صاحب نے یارانِ نجد کے ساتھ مل کر بھوپال سے 'نگار' جاری کیا اور اپنی وفات ۱۹۶۶ء تک وہ ۴۴ سال نگار کو مسلسل شائع کرتے رہے۔ رسالے شائع ہوتے ہیں اور بند ہو جاتے ہیں لیکن کم رسالے ایسے ہوتے ہیں جو مدیر کی ذات و شخصیت کا اس طور پر حصّہ بن جاتے ہیں کہ رسالے اور شخص کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں رہتا۔ نگار نیاز تھے اور نیاز کا نام نگار تھا۔ جیسے نیاز فتحپوری تھے ویسا نگار تھا۔ نگار کے پہلے شمارے کے اداریے میں نیاز فتحپوری نے لکھا کہ

"جس وقت ترتیبِ نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا تو ضروریاتِ زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلے ہی سانس

میں کر لیا کہ نگار کو خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گا۔"

اس جملے سے نیاز فتحپوری کے اندازِ فکر کے دو پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ "ضروریاتِ زمانہ" کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ دوسرے وہ نگار کو" خالص ادبی رسالہ" نہیں بنانا چاہتے تھے اور یہ دونوں وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے مل کر نگار کا مزاج ترکیب پاتا ہے۔ ہر وہ شخص جو ذہنی طور پر بیدار ہے، زندگی کے معاصر رجحانات سے اپنا رشتہ منقطع کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے نیاز صاحب نے نگار کو عہدِ حاضر کے تقاضوں کے مطابق جدید رجحانات کا رسالہ بنایا اور اسی لیے نگار ہمیشہ پسندیدہ رسالہ رہا۔

وہ لوگ جو زمانے کا شعور رکھتے ہیں اس بات کو جانتے ہیں کہ تبدیلی کا عمل ایک فطری عمل ہے لیکن اس کے باوجود اس فطری عمل کا اظہار غیر روایتی عمل ہے اور معاشرے کے لیے عام طور پر قابلِ قبول نہیں ہوتا۔ اسی لیے لکھنے اور سوچنے والے ذہن کو 'تبدیلی کے عمل کا شعور پیدا کرنے کے لیے' معاشرے سے جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ معاشرے کو اس کے خول سے باہر نکالنے کے لیے اپنے قلم سے بیداری کی جوت جگانی پڑتی ہے اور یہ کام جرأت و بیباکی کے ساتھ آزادیٔ اظہار سے کرنا پڑتا ہے۔ یہی کام ساری عمر نیاز فتحپوری نے کیا اور اسی وجہ سے نگار نے اپنے زمانے کی بھرپور ترجمانی کی۔ آج جب ہم ۱۹۲۲ء اور اس کے بعد کے معاشرے کے خدوخال کو دیکھتے ہیں تو ہمیں ایک ایسا معاشرہ نظر آتا ہے جو روایت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ جو کسی نئی بات کو سننے یا اس پر سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جو ہے ٹھیک ہے یہی اس کا عام رویہ ہے۔ نیاز فتحپوری نے اپنے قلم سے نہ صرف اس جمود کو توڑا بلکہ اس روایتی انداز پر بھرپور ضرب لگائی اور ایسے ایسے مسائل پر قلم اٹھایا جن پر لکھنا اس دور میں انتہائی مشکل کام تھا۔ ان بحثوں نے، جو نگار کے صفحات پر اٹھیں ٹھہرے ہوئے معاشرتی تالاب میں ایک تلاطم پیدا کر کے نئی نسل کے ذہنوں کو تبدیلی کی برکتوں کو قبول کرنے پر آمادہ کیا اور اس طرح زندگی میں تبدیلی کے عمل کو تیز تر کر کے اسے آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیا۔ اسی لیے

آزادیٔ اظہار اور جرأتِ فکر ہمیشہ نیاز فتحپوری اور نگار کی نمایاں خصوصیت رہی اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کی وجہ سے نیاز اور نگار ہماری جدید تہذیبی و ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں۔

نیاز فتحپوری نے "ملاحظات" میں ہمیشہ اس مسئلے پر اظہار خیال کیا جو اس زمانے میں اہمیت رکھتا تھا اور اگر صرف ملاحظات کا ترتیب سے مطالعہ کیا جائے تو ہم اس دور کے ذہنی دھاروں کی سن وار تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کو مسئلے کے نئے پہلو سے روشناس کرایا اور انھیں جذبات کے تلاطم میں راہِ اعتدال اختیار کرنے اور اعتدال کے اس مخصوص رُخ سے سوچنے کی طرف مائل کیا۔ انھوں نے ہمیشہ حق کی آواز بلند کی اور قلم کی آزادی اور اظہار کی جرأت کو کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ اظہار کی آزادی، فکر کی جرأت، ٹھنڈے دل سے جذباتی مسائل پر سوچنے اور لکھنے کی قوت کو ایسی اہمیت دی کہ آج بھی ہمیں ان خصوصیات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور آج بھی مولانا نیاز فتحپوری کی روحِ قلم ہمیں یہی راستہ دکھا رہی ہے۔ یہی وہ عظیم اور زندہ روایت ہے جس کے مولانا نیاز فتحپوری علم بردار تھے اور یہی وہ روایت ہے جس کی آج کے دانشوروں، اہلِ قلم اور ادیبوں کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وہ روایت ہے جس سے قلم معاشرے میں جادو جگاتا ہے اور زندگی کو پیچھے ڈھکیلنے کے بجائے آگے بلکہ بہت آگے بڑھاتا ہے۔ آیئے آج نیاز فتحپوری کا صدسالہ جشن مناتے ہوئے ہم اس بات کا عہد کریں کہ آزادیٔ اظہار اور جرأتِ فکر کو ہم کسی مصلحت کا شکار نہیں ہونے دیں گے کہ یہی حقیقی ادیب، اور حقیقی دانشور کا سرمایۂ نیاز ہے۔

۲۰ر ستمبر ۱۹۸۴ء

اشتیاق حسین قریشی بحیثیت مُورّخ

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی گوناگوں شخصیت کا ابدی پہلو یہ ہے کہ وہ بنیادی طور پر ایک مورّخ تھے۔ ایسے مورّخ کہ ان کا ثانی دُور دُور تک نظر نہیں آتا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی ہے کہ مورّخ تو اور بھی ہیں لیکن وہ تاریخی شعور جو مجھے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے ہاں نظر آتا ہے وہ اس طور پر ماضی قریب کے کسی مورّخ میں نظر نہیں آتا۔

تاریخ نویسی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ تاریخ جس میں کسی دَور کے نمایاں واقعات کو تسلسل کے ساتھ درج کر دیا جاتا ہے اور ان واقعات کا مجموعی بیان "تاریخ" کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر اسی قسم کی تاریخیں لکھی جاتی ہیں۔ دوسری قسم تاریخ کی یہ ہے کہ مورّخ تاریخی واقعات سے اس شعور اور روحِ زمانہ کو تلاش کرے جنھوں نے مل کر کسی دور کے مزاج کی تشکیل کی ہے اور اس کی فکر، اندازِ نظر اور رویوں کو وجود بخشا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی دوسری قسم کے مورّخ ہیں۔ انھوں نے بحیثیت مورّخ تاریخ کو کھنگالا اور مختلف واقعات کے اجزا سے کسی دور کی روح، اس کے مزاج اور اس کے اندازِ نظر کی تاریخ اس طور پر مرتب کی کہ تاریخی شعور اس دور کی زندگی کے آئینے میں نظر آنے لگا۔ اسی تاریخی شعور کی وجہ سے میں ڈاکٹر قریشی کو اس صدی کے عظیم مورخوں میں شمار کرتا ہوں۔ انھوں نے برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ مخصوص تاریخی شعور کے ساتھ اسی انداز سے لکھی ہے جس انداز سے اسپینگلر نے ڈکلائن اوف دی ویسٹ Decline of the West یا ٹوئن بی نے اے اسٹڈی اوف ہسٹری A Study of History لکھی ہے۔

ڈاکٹر قریشی تاریخ سے قومی شعور کو بیدار کرنے اور تاریخِ ماضی سے اس شعور کے دھارے کو تسلسل کے ساتھ دیکھنے اور دکھانے کا کام لیتے ہیں۔ ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوتا ہے اور اسی لیے ایک دور کا اندازِ فکر اس کے رویے اور زبان بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ۱۸۸۵ء میں جس طرح لوگ سوچتے، چیزوں کو دیکھتے اور انسانی رشتوں کے معنی سمجھتے تھے آج ۱۹۸۵ء میں لوگ اس سے مختلف انداز میں سوچتے اور دیکھتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ ایک حقیقی مورخ اسی کا جواب تاریخ سے تلاش کر کے سامنے لاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے میں تاریخی شعور کا نام دیتا ہوں اور اسی لیے، جیسا کہ ڈاکٹر قریشی نے ایک جگہ لکھا ہے "ہر عہد کی روح ایک مختلف زبان میں کلام کرتی ہے"۔ زمانے کی روح کے مختلف ہونے کی وجہ ہی سے ایک دور دوسرے دور سے مختلف ہوتا ہے اور حقیقی مورخ کا یہ بنیادی کام ہے کہ وہ اس روح کو سامنے لائے۔ آج ہونے والا واقعہ یا رجحان ماضی میں پیدا ہونے والے واقعے یا رجحان کا تسلسل ہوتا ہے جو مستقبل سے جا ملتا ہے۔ مورخ اسی تسلسل کو دریافت کرتا ہے اور فلسفی و مفکر بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس لیے مورّخ بھی ہیں اور مفکر و فلسفی بھی۔

مورّخ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ ماضی کو زمانۂ حال میں زندہ کر دے۔ نہ صرف زندہ کر دے بلکہ اسے ہمارے شعور کے ارتقا کا ایک حصّہ بھی بنا دے۔ کوئی خیال یا کوئی فکر اچانک آسمان سے نہیں اُترتے بلکہ وہ ایک پیڑ کی طرح دھیرے دھیرے پروان چڑھتے اور اپنی صورت بناتے ہیں اور پھر کہیں جا کر معاشرے کے ذہن کا حصّہ بنتے ہیں۔ تاریخ ماضی کے اسی ارتقاء کو زمانۂ حال میں سامنے لانے کا نام ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی تصانیف میں یہی اندازِ نظر اختیار کرتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص نظریۂ تاریخ ہے۔

اس بات کو میں ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ مسلمانوں نے برصغیر میں تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی۔ جب وہ یہاں آئے تو وہ اقلیت میں تھے۔ ایک طرف انھیں اپنی مدافعت کا مسئلہ درپیش تھا اور دوسری طرف انھیں اکثریت کے مذہب میں

جذب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ان دو سطحوں پر پوری احتیاط سے کام لے کر اپنی فکر اور اپنے نظام کو اس طور پر ڈھالا کہ وہ اکثریت کے غلبے سے محفوظ رہے۔ سولھویں صدی میں مسلمان تمام منظر پر نگاہ ڈالنے کے بعد مطمئن نظر آتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ اسلام کی قدروں کو عام طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ تلسی داس، کبیر داس، گرونانک، چتنیا اور نام دیو وغیرہ کی تحریکیں اس کا ثبوت ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے لکھا ہے کہ تاریخ میں ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک مذہب نے اس قدر مستعدی اور خلوص کے ساتھ دوسرے مذہب کی قدروں کو تسلیم کر لیا ہو جب کہ وہ مذہب زیادہ قدیم بھی ہو اور قیاسی فلسفے اور ترقی یافتہ مابعد الطبیعیاتی نظام بھی رکھتا ہو۔ اس سے پہلے ہندو مت نے بودھ مت اور جین مت کے خلاف بڑی کامیاب جنگ کی تھی اور بہت سی اجنبی قوموں کو اپنے سماجی نظام میں جذب کر لیا تھا۔ اس نے کبھی کسی اجنبی فلسفے کو اس طرح نہیں اپنایا تھا۔ اسی لیے سولھویں صدی میں مسلمانوں کے لیے یہ ایک نہایت خوش آیند بات تھی۔ لیکن یہاں ڈاکٹر قریشی یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ کبیر داس کی آواز میں کیا اسلام کی آواز بول رہی تھی یا یہ ہندو مت کی آواز تھی؟۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلام کی آواز تھی لیکن بنیادی طور پر یہ آواز ہندو مت کی آواز تھی جو اپنے سوفسطائی اور پنہاں انداز میں اپنا کام کر رہا تھا۔ یہ ہندو مت کا بنیادی تعقل ہے اسلام کا نہیں کہ ایک فلسفہ یا مذہب جو کچھ پیش کرنا چاہتا ہے وہ اس فلسفے یا مذہب کے عقیدے کی رسمی تکرار کے بغیر، صرف اعمال کو اس فلسفے یا مذہب کے سانچے میں ڈھال دینے سے ہو سکتا ہے۔ ہندو مت نے ہمیشہ یہی کیا ہے اور مختلف تصورات کے بُت بنا کر اپنے مندروں میں رکھ دیے ہیں۔ اگر ایک گروہ اپنے آپ کو دوسرے ہندوؤں سے مختلف سمجھتا ہے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ وقت گذرنے پر ہندو تصورات اور ہندو معیار آہستہ آہستہ چھن کر اس میں داخل ہونے لگتے ہیں اور آخر میں وہ اپنے ماحول کا ایک حصہ بن جاتا ہے اور دونوں میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ جاٹوں، راجپوتوں، باختر کے یونانیوں، گوجروں وغیرہ کے ساتھ یہی ہوا اور آج وہ ہندو مت کا ایک حصہ ہیں۔ اس دور میں

دراصل اسلامی قدروں کو قبول کرلینے میں ہندومت کا امتزاجی رجحان کام کر رہا تھا یہی صورت اُس وقت پیش آئی جب مغربی تہذیب اور عیسائیت نے اسی قسم کے مسائل پیش کیے تو ہندومت نے انھیں طریقوں سے ان کا جواب دیا۔ اس نے برہمو سماج جیسے فرقے کی بنا ڈالی۔ بھگتی کا وعظ کہنے والے اپنے اس اعلان کی تکرار سے کبھی نہیں تھکتے تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں کوئی فرق نہیں ہے اور یہ کہ تمام مذاہب ایک ہی ہیں۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کرلیا جائے تو تبدیلِ مذہب بے معنی ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ مختلف مذہبوں کے لوگوں کو مریدوں کے حلقے میں داخل کرنے کا رواج بھگتی کے بہت سے معلّموں کی خصوصیت تھی۔ یہ وہی صورت تھی جو صوفیائے کرام کرتے تھے۔ اس عمل سے ایک ایسا ماحول پیدا ہوا جس میں مذہبی مراسم اور برادری کے احساس کی قیمت اصل سے کم ہوگئی اور مذہب کی روحانی قدروں کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی۔ بہت سے ذہنوں میں یہ بات آنے لگی کہ مذہب کی ظاہری صورتیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اسی عمل کے ساتھ مسلمانوں میں مذہبی شعائر کی طرف رجحان کم ہونے لگا۔ یہیں سے وہ عمل شروع ہوتا ہے جس سے ہندومت نے باہر سے آنے والوں کو اپنے اندر جذب کرلیا۔ پہلے باہر سے آنے والے ہندومت کے چار ورنوں میں شامل ہوئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندو دنیا کا حصّہ بن گئے۔ پوری تاریخ کے دوران ہندومت کی یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے خلل انگیز تعلیمات کو، اپنی اجنبی نوعیت کے باوجود اپنے پیروؤں کے بعض طبقوں کے عقاید میں جگہ دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ ان برادریوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کی جائے جو ترکِ وطن کر کے برِعظیم میں آئی ہیں یا اس کے اندر خود بخود پیدا ہوئی ہیں۔ برِعظیم کی ملتِ اسلامیہ نے اس کو محسوس کر کے خود کو ہندومت میں جذب ہونے سے بچائے رکھا۔

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے جب مسلمان حکمران تھے۔ اب جب کہ ہندوستان کے مسلمان حکمران نہیں ہیں اور ہندومت کے رحم و کرم پر ہیں یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور وہاں اکثر طلبہ اپنی فراخ دلی کے اظہار کے لیے یا ملازمتوں کی خاطر مذہب کے خانے میں "انسانیت" کا لفظ لکھ رہے ہیں اور یہ ایک خطرناک رجحان ہے جس سے جذب ہونے کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔

یہی صورت پاکستان میں ہمارے سامنے ہے۔ ہم بھی مغرب کے سیلابِ فکر کے سامنے بے دست و پا ہو کر مغربی فکر میں جذب ہونے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تاریخ کو اسی انداز سے دیکھتے ہیں اور یہی ان کا مخصوص زاویۂ تاریخ ہے جس میں وہ منفرد و ممتاز ہیں۔

میں نے اس مضمون میں ڈاکٹر قریشی کی تاریخ نویسی کے بہت سے رُخوں میں سے صرف ایک رُخ کو پیش کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ جدید مورخوں کو اسی اندازِ نظر سے کام کرنا چاہیئے تاکہ جدید تاریخ نویسی کی حقیقی معنویت سامنے آسکے۔

(۲۲ جنوری ۱۹۸۵ء)

پاکستانی فکر کی اساس

ایسے لوگ جیسے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی تھے روز روز کہاں پیدا ہوتے ہیں؟ شاید میر تقی میر نے انہی کے لیے کہا تھا:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسلام کے شیدائی اور سچے مسلمان تھے۔ ملت مسلمہ کا درد ان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ ایسی دل سوزی اور ایسی دردمندی کم کم دیکھنے میں آتی ہے۔ مجسم علم، سراپا عمل۔ تحریر پر قدرت، تقریر پر قادر، مشفق بھی اور مخلص بھی۔ ۱۹۵۶ء میں جب ان سے ملا تھا تو یہی احساس ہوا تھا۔ اس وقت وہ مرکزی کابینہ میں وزیر تھے اور جب ہلال احمد زبیری صاحب کے ہمراہ اُن سے آخری ملاقات ہوئی تو وہ اسلام آباد جانے کی تیاری کر رہے تھے اور جب اسلام آباد سے واپس آئے تو اپنے پیروں پر نہیں دوسروں کے کاندھوں پر آئے۔ انسان جب آتا ہے تو دوسروں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے اور جب جاتا ہے تو دوسروں کے کاندھوں پر ہوتا ہے۔ یہی دُنیا کا دستور ہے اور یہی ریت ہے۔

اسی ہستی کی یاد میں جناب ہلال احمد زبیری صاحب نے محنت، محبت اور سلیقہ سے ایک یادگاری مجلد مرتب کیا ہے جس کے مطالعے سے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی شخصیت و فکر کے وہ تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں جس سے وہ عبارت تھے۔ اسی لیے یہ کتاب سب کو پڑھنی چاہیے تاکہ لوگ ایک سچے مسلمان، ایک اچھے انسان، ایک معتمد دوست، ایک شفیق اُستاد، ایک اچھے منتظم، ایک بلند پایہ مفکر اور ایک مستند مورخ کے کارناموں سے واقف و متعارف

ہو سکیں۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا اندازِ فکر ایک ایسے محبِ وطن پاکستانی کا تھا جو ایک طرف تحریکِ پاکستان کا سپاہی اور داعی تھا اور دوسری طرف فکر و نظر اور تہذیب و ثقافت کی سطح پر اُن عوامل کو فکرِ پاکستان میں شامل کرنا چاہتا تھا، جو پاکستان کی پہچان ہیں اور جن سے پاکستان صحیح معنی میں ایک ملک اور پاکستانی صحیح معنی میں ایک جہتی کے رشتے میں پیوست ایک متحد قوم بن سکتی ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ تین بنیادی باتوں پر زور دیتے تھے۔ پہلی بات یہ کہ وہ اسلام کو پاکستان کی بنیادی شناخت سمجھتے تھے جس سے یہ ملک وجود میں آیا تھا اور جس سے یہ ملک قائم و دائم رہے گا۔ ایک جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ:

"میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کے بغیر پاکستان ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میں اس کا قائل نہیں ہوں کہ پاکستان کی وحدت کا سبب صرف اسلام ہے۔ اس وحدت میں اور عناصر بھی شامل ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ اہمیت اسلام کو حاصل ہے۔ اگر اسلام نہ ہو تو پاکستان کے شیرازہ کو جمع رکھنا بہت دشوار ہو جائے۔" (ص ۲۰)

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے نزدیک اسلام زبانی جمع خرچ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ تو سراسر عمل کا نام ہے۔ ایسا عمل جس سے انسان کا کردار بنتا ہے۔ ایسا کردار جس سے اسلام انسان کی روح میں سرایت کرکے، معاشرے اور فرد کی شناخت بنتا ہے۔ اسی لیے جب وہ موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:

"ہماری ناکامیاں دراصل ہمارے کردار کی خامی کی وجہ سے ہیں۔ پاکستان میں آئین ناکام نہیں رہا ہے بلکہ آئین کو چلانے والے ناکام رہے ہیں۔ ہماری ناکام حکومتیں کرداری خامی کی سبب سے صحیح نہ چل سکیں۔ اگر ہمارا کردار درست ہوتا اور آئین ناقص بھی ہوتا تو بھی ہم کردار کے زور زور پر اسے کامیاب بنا سکتے تھے۔ اگر آئین اچھا بھی ہو اور کردار ناقص ہو تو آئین کبھی نہیں چل سکتا۔" (ص ۱۲۲)

ڈاکٹر قریشی خود غرضی کو پاکستان کی بدحالی کا سبب جانتے ہیں:

"ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں خود غرضی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنی چھوٹی سے چھوٹی غرض کو پورا کرنے کے لیے بڑے سے بڑے اصول کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔" (ص ۱۲۳)

"اسلام کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ رشوت لو، اسلام کی تعلیم تو یہ ہے کہ رشوت نہ لو۔ جس قوم کے دل سے خدا کا خوف چلا جاتا ہے تو اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ صرف اسی دنیا کو بنانا ہے اور دنیا بھی ایسی نہیں بنانی جس سے ساری قوم یا ملک کو فائدہ پہنچے بلکہ مقصود محض ذاتی منفعت ہوتا ہے اور فرد بھول جاتا ہے کہ اگر قوم تباہ ہو جائے گی تو خود فرد بھی کہاں رہے گا۔" (ص ۱۲۳)

ڈاکٹر قریشی کے نزدیک دوسری بات، جس سے پاکستان ایک ملک اور پاکستانی ایک متحد قوم بن سکتی ہے، یہ ہے کہ قوم کو تعلیم اپنی قومی زبان میں دینی چاہیئے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر اپنی زبان کو ترک کر دیا جائے یا پسِ پُشت ڈال دیا جائے تو تھوڑے عرصے کے بعد جذبات بدلتے نہیں بلکہ مسخ ہونے شروع ہو جاتے ہیں اس لیے کہ جذبات یا جتنے خیالات باریک ہوتے ہیں وہ ایک خاص طریقے سے نشوونما پاتے ہیں۔ ان کا ایک پس منظر ہوتا ہے۔ ان کے پیچھے تاریخی تجربات و حیات کی پوری کش مکش ہوتی ہے۔ اگر کسی اور جگہ سے زبان مستعار لی جائے تو نتیجہ اس کا یہی ہوگا کہ جذبات و خیالات بھی مستعار لینے پڑیں گے۔ جو چیز اس طرح سے مستعار لی جاتی ہے اس پر کبھی انسان کو نہ پورا قابو حاصل ہو سکتا ہے اور نہ مستعار لی ہوئی قوتوں میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ انسان کو صحیح راستے پر چلا سکے۔ یہی سبب ہے، جو قومیں اپنی زبان سے ناآشنا ہوتی ہیں وہ کبھی ایسا کارنامہ، علمی یا فطری یا ذہنی، پیش نہیں کر سکتیں جن پر انھیں فخر ہو۔ تمام ایسے ممالک میں جہاں اپنی زبان کو صحیح طور پر استعمال نہیں کیا جاتا خیالات کی ایسی پستی پائی جاتی ہے کہ دماغ بھی ترقی نہیں کرتے بلکہ ترقی بند ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے درختوں کی طرح ہوتے ہیں جنھیں نہ دھوپ

ملے نہ ہوا ملے، جو ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معیار تعلیم مسلسل گر رہا ہے کسی دوسری زبان میں رٹ کر امتحان پاس کرنے سے دماغ کی ترقی یا علم کا فروغ نہیں ہوتا بلکہ دماغ سکڑ کر، ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ طالب علم میں حصول علم کی لگن ہی پیدا نہیں ہوتی۔ صاحبانِ اقتدار اس بات کی کتنی ہی مخالفت کریں لیکن یہی اور یہی بات اپنی جگہ درست ہے۔ انگریزی ضرور پڑھیے اور خوب پڑھیے۔ اس پر پوری قدرت حاصل کیجیے میرا خیال ہے کہ ہر تعلیم یافتہ شخص کو بہت اچھی انگریزی آنی چاہیے لیکن اصل مسئلہ اچھی انگریزی آنے کا نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ تو ذریعۂ تعلیم کا ہے۔ ذریعۂ تعلیم اگر اپنی زبان میں ہو تو ذہن کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہو کر پستی سے رفعت کی طرف جانے لگتی ہیں۔ یہ بات جتنی جلد صاحبانِ اقتدار کی سمجھ میں آجائے اتنا ہی قوم کے لیے مفید ہے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں کہ:

"یورپ کے قرونِ وسطیٰ میں تھوڑی بہت علمی ترقی جو ہوئی ہے اس کی بنیاد تمام تر لاطینی پر قائم تھی لیکن کیا وہ علمی ترقی موجودہ علمی ترقی کا پاسنگ بھی تھی؟ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ ترقی کسی غیر زبان کے ذریعہ سے نہیں ہوئی بلکہ قومی زبانوں کے استعمال سے میسر آئی، چنانچہ انگریز جن کی تقلید کا بار ہم اپنے گلے میں اب تک ڈالے ہوئے ہیں، اس دن سے اپنی ترقی کی ابتداء شمار کرتے ہیں جب انجیل کا انگریزی میں ترجمہ ہوا اور لاطینی سے انھیں نجات ملی۔" (ص ۵۰)

"علم اسی حالت میں ترقی کر سکتا ہے اور عوام میں پھیل سکتا ہے جب انھیں ان کی زبان میں اسے سکھایا جائے۔ ایک طرف ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں سائنس کی تعلیم عام ہونی چاہیے اور عوام کو سائنس سے تعلق ہونا چاہیے اور دوسری طرف ہم عوام کے اور سائنس کے درمیان وہ دیواریں کھڑی کرتے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عوام کبھی سائنس سے روشناس نہ ہو سکیں گے۔" (ص ۵۳)

تیسری بات جس پر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم زور دیتے ہیں وہ اپنی میراث کا

احساس و شعور ہے۔ موجودہ صورت حال کو دیکھ کر وہ کہتے ہیں کہ:

"اب ہمیں کسی چیز پر اعتماد نہیں رہا۔ ہمارے دل میں اپنی کسی روایت سے وابستگی اور اپنی میراث کے کسی حصے سے لگاؤ کا شائبہ بھی باقی نہیں۔ ہمارے احساس کمتری کا اس سے زیادہ اور کیا مظاہرہ ہوگا کہ ہمارے مکانوں، محلوں، راستوں، اداروں، کارخانوں حتیٰ کہ روزمرہ کے استعمال کی اشیا تک کے نام غیر ملکی ہیں۔ ہماری قوم کے والدین کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ ان کے بچے ایک خارجی زبان کو بے تکلف بول سکیں اور اگر وہ اپنی مادری یا قومی زبان بولنے سے یکسر قاصر ہو جاتے ہیں تو یہ بات مزید اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر قریشی لکھتے ہیں کہ:

"جب میری نسل کا عنفوانِ شباب تھا تو ہمیں مسدس حالی کے بند، بانگ درا کی پوری پوری نظمیں، شکوہ اور جواب شکوہ کے جستہ جستہ حصے ازبر تھے۔ شعر کے سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت تھی۔ اپنے مسلمان ہونے پر فخر تھا۔ اپنے آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر تھا۔ اگر کوئی ہمارے ماضی کو برا کہتا تھا تو ہمارا دل دکھتا تھا اور اگر کوئی ہمارے معتقدات پر حملہ کرتا تھا تو ہم برافروختہ ہوتے تھے۔ یہی تو وہ جذبات تھے جو ہماری قوتِ عمل کو بیدار کرتے تھے۔ یہی وہ رجحانات تھے جو پختگی پا کر ایک سیلِ رواں بن گئے اور جنھوں نے ہندی اور برطانوی سامراجیت کو اپنے راستے سے یوں ہٹا دیا جیسے دریا کا دھارا خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی پوچھتے ہیں کہ:

"میں اپنی گم کردہ قوم سے نہایت ادب کے ساتھ سوال کرتا ہوں کہ پاکستان حاصل کرنے کا جذبہ ہمارے دل میں شیکسپیئر پڑھ کر پیدا ہوا یا

حالی کی مسدس کے دردسے ؟ ورڈسورتھ نے ہمارے دلوں میں ہیجان پیدا
کیا یا اقبال نے ؟'

اور پھر خود جواب دیتے ہیں کہ :

"اگر ہمارے دلوں میں اپنی ثقافت کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم
ہندوستان کی تہذیب میں جذب ہونے پر تیار ہوتے اور اپنی انفرادیت کو
قائم کرنے کے لیے ان سب مصائب کا مقابلہ نہ کرتے جو ہمیں پاکستان کے
حصول کی راہ میں پیش آئے ۔ ..... مقام عبرت ہے کہ وہ قوم جو اس
دعوے کے ساتھ اٹھی تھی کہ اسے اپنی ثقافت اتنی عزیز ہے کہ وہ اغیار
کے ساتھ شرکت کی زندگی کے لیے کسی قیمت پر آمادہ نہیں وہ اسی
ثقافت کو بے سوچے سمجھے مٹا رہی ہے ۔" (ص ۶۱-۶۲)

اسی انداز فکر سے ڈاکٹر قریشی کا تصورِ ثقافت پیدا ہوتا ہے ۔ وہ ان سب باتوں
کو بحیثیت مجموعی قوم کی شناخت سمجھتے ہیں ۔ ان تمام عناصر کو اس کی تہذیب و فکر کی روح
میں شامل کرکے قوم کی انفرادیت کی پہچان بناتے ہیں اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ :

"جس قوم کو اپنی کوئی چیز اچھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادا
پر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے ؟ قوم بے جان افراد کا مجموعہ نہیں
ہوتی ۔ وہ معتقدات ، تاریخ ، عصبیت ، ثقافت اور انفرادیت پر
اصرار سے وجود میں آتی ہے ۔ افراد اس وقت اپنی زندگی نثار کرتے
ہیں جب انھیں قوم کی حیات میں ان قدروں اور روایات کی بقا نظر
آئے ...... ورنہ آرام و آسائش ، اچھے کپڑوں ، لذیذ خوراک ،
نفیس ساز و سامان اور غیر ملکی آلات کی حفاظت کے لیے نقدِ حیات
کون گنواتا ہے ۔ اس قوم میں خواہش زیست کیا ہوگی جو اپنے وجود کا
جواز ثابت نہ کرسکے ؟ کسی قوم کا جوازِ وجود یہ یقین ہوتا ہے کہ اس کے زندہ
رہنے سے دنیا میں وہ خوبیاں زندہ ہیں جن کے نہ ہونے سے انسانیت

خسارہ میں رہے گی۔ نہیں تو محض ایک بے کار انبوہ کے ہونے نہ ہونے سے
کسی زبان کا کیا اندیشہ ہو سکتا ہے۔"

اسی بات کو وہ زندگی کے عام رویوں اور نظام اقدار میں دیکھتے ہیں تو انھیں بے حساب معاشرتی و اخلاقی کمزوریاں نظر آتی ہیں جنھوں نے قوم کو منتشر اور عدم اعتماد و بے یقینی کا شکار بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ:

"کیا آپ نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا کہ ثقافت کی کمزوری سے آپ کی قوم میں خود غرضی، سہل انگاری، فرض ناشناسی، اخلاقی کمزوری اور اخلاق کی پستی کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ وہ اپنی عزت کیا کرے گا جو اپنے اندر کوئی چیز قابلِ توقیر نہ پائے۔ جو اپنی عزت نہ کرے اور خود داری سے بیگانہ ہو، وہ اپنے کردار کو کیا بلند کرے گا۔"

اور ہماری بد قسمتی دیکھیے کہ

"کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ سب نتیجہ ہے ایک بے پناہ احساس کمتری کے سیلاب کا جس کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں۔ یہ وہ سل ہے جس نے اس قوم کے پھیپھڑوں کو چھلنی کر دیا۔"

یہی وجہ ہے کہ ہم اس وقت وحدت سے محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات واضح رہے وحدت و قومی یک جہتی از خود پیدا نہیں ہوتی اس کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ خصوصی حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر اس حکمت عملی اور منصوبہ بندی کو محلہ سے لے کر ضلع تک اور ضلع سے لے کر صوبے تک اور صوبے سے لے کر سارے ملک کے چپے چپے تک پھیلانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ چالیس سال سے ہم قومی وحدت و یک جہتی کے مسئلے کو التوا میں ڈال کر ایک ایسی "طفلانہ خوش فہمی" کا شکار ہیں کہ جس کے نتائج کھل کر اب ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ انتشار بڑھ رہا ہے۔ دشمنوں کے ہاتھ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ہماری بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ اگر مزید غفلت برتی گئی اور نئی حکمت عملی وضع نہ کی گئی اور صرف ایک ایک دن گذارنے پر اکتفا کیا گیا تو ڈاکٹر قریشی کہتے ہیں کہ "مزید غفلت

سے یہ خوف ہے کہ پانی سر سے نہ گذر جائے۔" (ص ۴۰)

تشویش ناک بات یہ ہے کہ اس عمل کی طرف جو قومی ترجیحات میں سب سے اول ہونا چاہیے، ہم کوئی توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ صرف وقتی اور لمحاتی بنیادوں پر ہم مسائل کو نمٹانے میں مصروف ہیں۔ قوم کی بے کرداری، بے ضمیری اور مقصد و منزل کے نہ ہونے نے ہر چیز کو مسخ کر دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ریل پٹری سے اُتر گئی ہے۔ پٹری سے اُترنے اور موجودہ صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ گذشتہ چالیس سال میں ناانصافیوں کی حکمت عملی نے، وحدت و یک جہتی کے عمل کو کم زور سے کم زور تر کیا ہے۔ مغربی پاکستان کو ون یونٹ بنا کر جس وحدت کا خواب ہم نے دیکھا تھا وہ ناانصافیوں کی حکمت عملی کو اپنانے سے پورا نہ ہوا۔ ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان بھی اسی وجہ سے ہم سے الگ ہوا۔ ناانصافی کی حکمت عملی سے تہذیبی، سیاسی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی ادارے بھی اس لیے ضعیف و خستہ ہو گئے۔ ناانصافی کی مثال اس گیند کی طرح ہے جسے جتنی قوت سے دیوار پر مارا جائے گا وہ اسی قوت سے واپس آئے گی۔ اسی وجہ سے سارا معاشرہ رقصِ بسمل کا تماشائی ہے اور خود کو بے یقینی کی کیفیت کے ساتھ غیر محفوظ محسوس کر رہا ہے۔ انصاف اور صرف انصاف، زندگی کی ہر سطح پر انصاف، قومی یک جہتی اور تہذیبی و سیاسی اداروں کی نشو و نما کے لیے ویسا ہی ضروری ہے جیسے سانس کی آمد و رفت انسانی زندگی کے لیے ضروری ہے۔ جو انصاف کو حکمت عملی بنائے گا۔ جو پورے اخلاص اور پوری دیانت کے ساتھ انصاف کو زندگی کی ہر سطح پر نافذ کرے گا وہی ایک، زندہ، توانا اور متحد معاشرے کو جنم دے سکے گا۔ یہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور یہی ہمارے ارباب حل و عقد کو بھی کرنا چاہیے۔ یہی ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کا نقطۂ نظر ہے۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔

(۲ر جنوری ۱۹۸۷ء)

تاریخی شعور اور ڈاکٹر قریشی

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صاحب کے بارے میں آپ پہلے سے بہت کچھ جانتے ہیں اور بہت کچھ اُن کے بارے میں آپ فاضل مقرروں کی زبانی سُن چکے ہیں۔ مجھے بھی اُن سے اُس وقت سے شرف نیازمندی حاصل تھا جب ۱۹۵۵ء میں انھوں نے میری پہلی کتاب کا مقدمہ لکھ کر مجھے ممنونِ کرم فرمایا تھا۔ میری یہ نیازمندی نہ صرف ڈاکٹر قریشی صاحب کی وفات تک قائم رہی بلکہ آج بھی میرے دل میں ان کی بڑی قدر و منزلت اس لیے موجود ہے کہ میں انھیں عہدِ حاضر کا ایک ایسا مسلم مورخ مانتا ہوں کہ ویسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ مورخ کے ساتھ مسلم کا لفظ میں نے عمداً اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ میں ڈاکٹر قریشی کے "ذہن" اور "تاریخی شعور" کو نمایاں کر سکوں۔ یہی وہ ذہن اور تاریخی شعور تھا جس نے برعظیم پاک و ہند میں مسلم عوام کا اجتماعی شعور بن کر پاکستان کو وجود بخشا تھا۔ وہ پاکستان جس میں برعظیم کے مسلمان، اسلام کی اقدار و روایات اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کے ساتھ، ایک نئی زندگی کا آغاز کر کے، اسلام کی عظمتِ رفتہ کی تجدید کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ہم نئے نئے تضادات کا شکار ہو کر اُس راستے پر چل پڑے کہ آج چالیس بعد ہم اسلام کی عظمتِ رفتہ کی تجدید کے بجائے عہدِ جاہلیت میں داخل ہو کر نہ صرف خون کی ہولی کھیلنے کا شغل کر رہے ہیں بلکہ اُس شاخ کو بھی ہنس ہنس کر کاٹ رہے ہیں جس پر ہم خود کھڑے ہیں۔ اب ہمیں بڑی باتیں پریشان نہیں کرتیں بلکہ ہم چھوٹی اور اسفل باتوں سے اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں دن رات شد و مد سے مصروف ہیں۔ ڈاکٹر قریشی نے مسلمانانِ پاک و ہند کے زوال کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب یہ ہے کہ وہ پست اخلاق کا شکار ہو کر نااہلیت، کوتاہ بینی

خود غرضی، غداری اور کوتاہ نظر حکمت عملی کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ یہی وہ صورت حال ہے جس سے ہر سطح کے اہل پاکستان آج بھی دوچار ہیں۔ ایک طرف ہندوستان ہے جو اپنی ڈھائی ہزار سالہ تاریخی روایت کے عین مطابق مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہے جس کے رقص بسمل کا تماشا ہم گذشتہ ۴۰ سال سے مسلسل دیکھ رہے ہیں اور دوسری طرف ہم ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی والے مسلم مورخ کے ذہن اور شعور سے دور ہو کر ۱۹۷۱ء میں ملک کا ایک حصہ گنوا چکے ہیں اور اب بھی تاریخ سے سبق سیکھے بغیر اسی راستے پر گامزن ہیں۔ ڈاکٹر قریشی کا زاویۂ نظر یہ ہے کہ "ہندو مت کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ دوسرے مذاہب سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے سب سے پہلے خلل انگیز تعلیمات کو ان کی اجنبی نوعیت کے باوجود اپنے بنیادی فلسفے میں نہیں بلکہ اپنے پیروؤں کے بعض طبقوں کے عقائد میں جگہ دی جائے اور اور اس کے ساتھ ان برادریوں کو اپنے اندر جذب کرنے کی سعی بھی کی جائے جو ترک وطن کے ذریعے برعظیم میں آئی ہیں۔" ہندوستان میں آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہندو قوم کے اسی مزاج کا لازمی نتیجہ ہے۔ پاکستان اسی ہندو ذہن سے بچنے اور اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وجود میں آیا تھا تاکہ برعظیم کی ملت اسلامیہ ہندو مت میں جذب ہونے کا مقابلہ کر کے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکے۔ ہندو ذہن اور ہندو مت کی اگر تاریخی قوت کا اندازہ کرنا ہے تو دیکھیے کہ باہر سے جتنی قومیں آئیں خواہ وہ باختر کے یونانی ہوں یا راجپوت جاٹ اور گُہنز ہوں یا وسطی ایشیا سے آنے والی دوسری قومیں ہوں وہ سب رفتہ رفتہ اسی عمل سے، جس سے آج ہندوستان کے مسلمان دوچار ہیں، ہندو مت میں جذب ہو گئیں۔ ہندو مت نے جب فاتح بن کر حکمرانی کا علم بلند کیا تو اسی کے ساتھ محکوم قوم کو جذب کرنے کا عمل بھی شروع ہو گیا۔ ہندوستان آج پاکستان کو اپنا سب سے بڑا دشمن اسی لیے گردانتا ہے کہ پاکستان کا وجود اس کے تاریخی منصوبوں کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ بن گیا ہے۔ اگر آج پاکستان کے صاحبانِ اختیار اور اربابِ سیاست اس بات کو سمجھ لیں اور تاریخ سے سبق سیکھ کر اپنی حکمت عملی وضع کریں تو ہم نہ صرف اپنی قوم کو نئی زندگی بخشیں گے بلکہ اسلامی اقدار کے تحفظ کے سلسلے میں اپنا وہ کردار بھی ادا کر سکیں گے

جس کے لیے ہم نے اس ملک عزیز کو وجود بخشا تھا اور اُسے تقدس کے ساتھ پاکستان کا نام دیا تھا۔

اس ہندو ذہن کو، جسے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تحریروں میں بار بار نمایاں کیا ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے، آپ دیکھنا چاہیں تو اس تاریخ میں دیکھیے جو The History and Culture of The Indian People کے نام سے گیارہ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور ان گیارہ جلدوں میں سے صرف دو جلدیں مسلمانوں کی حکومت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک جلد کا عنوان "دہلی سلطنت" ہے اور دوسری جلد کا عنوان "مغلیہ سلطنت" ہے۔ ان دونوں جلدوں میں بھی تاریخی مواد کو اس طور پر ترتیب دیا گیا ہے کہ ان سے دہلی سلطنت اور مغلیہ دور کی عظمت اور کارناموں کے بجائے اُن مختلف باج گذار ہندو ریاستوں کی داستان و تہذیب زیادہ نمایاں ہو کر اُبھرتی ہے جو اُس وقت ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ تاریخ، مسلمانوں کی تاریخ کو ہندو ریاستوں کی تاریخ میں، جذب کرنے کے اسی عمل کو آگے بڑھاتی ہے جس سے ہندو مت کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اسی تاریخی شعور کو برعظیم کی ملت اسلامیہ میں ابھارنے کی کوشش کرتے رہے اور یہی وہ تاریخی شعور ہے جس کی ہمیں نہ صرف آج بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی ہمیشہ ضرورت رہے گی۔ یہی وہ تاریخی شعور ہے جو ہمارا دفاع کر سکتا ہے اور ہمیں ہندو مت میں جذب ہونے سے بچا سکتا ہے لیکن خواتین و حضرات! میں بھی کس تاریخی شعور کی بات کر کے آپ کا وقت خراب کرنے میں لگ گیا۔ ہمارا تاریخی شعور تو ماشاءاللہ اس وقت نسلی، علاقائی اور لسانی بنیادوں پر اپنا الگ الگ وجود منوانے کے لیے ایک دوسرے کو قتل کر کے دن رات اسلام کی خدمت میں مصروف ہے۔ اس صورت حال سے بچنے کے لیے ہمیں دو بنیادی کام کرنے چاہئیں۔ ایک یہ کہ "اہلیت" اور صرف اہلیت کو حکمت عملی کے طور پر اختیار کرنا چاہیئے۔ دوسرے یہ کہ "عدل و انصاف

کو ــــ اور اس میں معاشی اور معاشرتی انصاف دونوں شامل ہیں ــــ زندگی کی ہر سطح پر اختیار و نافذ کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ حکمت عملی وضع کرنے سے پہلے درپیش مسائل کا تحقیقی سطح پر تجزیہ کرایا جائے اور اس کے نتائج پر حکمت عملی کی بنیاد رکھی جائے۔ ہمارے ہاں اب تک ایسا نہیں ہوا ہے حالانکہ عہدِ حاضر کے سارے تمدن اور زندہ قومیں یہی کرتی اور یہی کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس زاویۂ نظر کے حامل اور اسی تاریخی شعور کے علمبردار تھے۔

(۲۶ر اگست ۱۹۸۷ء)

اقبال اور تشکیلِ جدید

پاکستانیات کے مطالعہ کے لیے جامعہ کراچی میں ایک تعلیمی و تحقیقی ادارہ " مرکز مطالعۂ پاکستان" کے نام سے کام کر رہا ہے۔ اس مرکز کو انگریزی میں "پاکستان اسٹڈی سینٹر" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس مرکز کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ مختلف علوم کے اشتراک و امتزاج سے ان "مشترک ذہنی، فکری، تاریخی، تہذیبی اور لسانی عوامل کی تلاش و تحقیق" کرے جن سے "قومی یک جہتی کو فکری سطح پر فروغ حاصل ہو" تاکہ اس عمل سے ہم اپنی قومی شناخت کو دریافت اور اسے ٹھوس بنیادیں فراہم کر سکیں۔ یہ یقیناً بڑا کام ہے۔ اس کام کے لیے اہلِ تحقیق کو تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر معروضی انداز میں دادِ تحقیق دینے کی ضرورت ہے۔ تحقیق دراصل جھوٹ کو سچ سے، غلط کو صحیح سے، نادرست کو درست سے الگ کرنے کا نام ہے۔ وہ صاحبانِ تحقیق جو پہلے سے کلیے یا نظریات متعین کر کے تحقیق کرتے ہیں دراصل تحقیق کے راستے سے دور ہو جاتے ہیں۔ تحقیق تو، جیسا کہ میں نے عرض کیا، سچائی کی تلاش کا راستہ اور اس کی منزل ہے۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا نام تحقیق نہیں ہے۔ ہمارے ہاں تحقیق سے اکثر یہی کام لیا جا رہا ہے۔ ساری دُنیا کی جدید و قدیم جامعات اسی لیے فکر و علم کا مرکز رہی ہیں کہ وہاں آزادیِ اظہار اور آزادیِ فکر کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ اسی آزاد فضا میں علم کا سورج طلوع ہوتا ہے اور بصیرت کی روشنی انسانیت کے افق کو لالہ گوں کر دیتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آزادیِ فکر و اظہار مادر پدر آزاد نہیں ہوتی بلکہ مخصوص و شائستہ نظم و ضبط کی حامل ہوتی ہے۔ اس کی ایک دانشورانہ سطح ہوتی ہے اور اس سطح پر اختلاف رائے ذاتی اختلاف نہیں ہوتا بلکہ فکری اختلاف ہوتا ہے۔ اختلاف سے

فکر بڑھتی ہے، دانش روشن ہوتی ہے اور حکمت واضح ہو کر اپنے خد و خال نمایاں کرتی ہے۔ فکر و دانش کی سطح پر اختلاف سے معاشرہ متحرک رہتا ہے اور منجمد ہو کر گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے۔ ہمارے ہاں اختلاف کی نوعیت ذہنی و فکری سطح کے بجائے ذاتی نوعیت کی بن کر رہ گئی ہے اور ایسی نئی دشمنیوں کا پیش خیمہ بن گئی ہے جس کا تماشا ہم جامعات میں اکثر دیکھتے ہیں۔ نہ لوگوں میں تحمل ہے اور نہ اہلِ علم میں قوتِ برداشت ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اختلاف کیجیے۔ دلائل دیجیے۔ اپنی بات دوسروں تک پہنچائیے لیکن یہ سب کام خوش دلی اور تحمل سے کیجیے۔ تشدد آزادیِ اظہار اور آزادیِ فکر کا بدترین دشمن ہے۔ انفرادی یا اجتماعی سطح پر جہاں تشدد رونما ہوگا وہاں کوئی اچھی چیز پروان نہیں چڑھ سکتی اور فکر و دانش اسی طرح منہ لبسورتی رہے گی جس طرح ہمارے تعلیمی و تحقیقی اداروں میں دکھائی دیتی ہے۔ علم کا درخت وسیع مطالعے کی کھاد سے بڑھتا، پھیلتا اور سایہ دار ہوتا ہے جس کے نیچے علم کے پیاسے طلبہ دم لیتے اور اپنی پیاس بجھاتے ہیں۔ ایک بڑا اُستاد ایک ایسے ہی چھتنار درخت کی حیثیت رکھتا ہے اور عجز و انکسار اس کی شناخت ہوتے ہیں۔ یہ قانونِ قدرت ہے کہ درخت پر جتنے زیادہ پھل ہوتے ہیں اس کی شاخیں اتنی ہی نیچے کی طرف جھکتی ہیں۔ یہی ایک اچھے اور بڑے اُستاد کی پہچان ہے۔ جیسے عجز و انکسار اور دلیل و تحمل صاحبِ علم کی پہچان ہیں اسی طرح علمی مباحثے، مذاکرے، سیمی نار، سمپوزیم اور ورکشاپ تعلیمی اداروں کی پہچان ہیں۔ ان سے اداروں کی زندگی میں تازہ خون دوڑنے لگتا ہے اور جذبۂ مسابقت پیدا ہو کر کام کرنے کا حوصلہ بیدار ہوتا ہے۔ اسی لیے میری ہمیشہ یہ کوشش رہتی ہے کہ جامعۂ کراچی کے اساتذہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں ملک و بیرونِ ملک مذاکروں اور سیمیناروں میں شریک ہوں اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ پاکستان کی ہر جامعہ سے زیادہ ہماری جامعہ کے اساتذہ مذاکروں اور سیمیناروں میں شرکت کے لیے گئے ہیں۔ اسی طرح میری یہ کوشش بھی رہتی ہے کہ ہمارے مختلف شعبے، ادارے اور مرکز کم از کم سال میں ایک مرتبہ قومی سطح کا سیمینار منعقد کریں اور میرے لیے یہ اطمینان کا باعث ہے کہ گزشتہ تین چار

سال کے عرصے میں ہماری جامعہ میں بیس سے زیادہ تعداد میں قومی و بین الاقوامی سطح کے سیمینار اور ورکشاپ منعقد ہوئے ہیں۔ "مرکز مطالعۂ پاکستان" بھی گذشتہ دو سال سے قومی سطح کا سیمینار منعقد کر رہا ہے۔ پچھلے سال "پاکستانی معاشرہ اور ادب" کے موضوع پر دو روزہ سیمی نار منعقد ہوا تھا جس میں پاکستان کے صاحبانِ علم و ادب نے اپنے فکر انگیز مقالات پیش کیے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ سب مقالات سلیقے سے کتابی صورت میں مرتب ہو کر آج شائع بھی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھیں گے تو اس لیے خوش ہوں گے کہ اس میں جتنے مقالات شامل ہیں وہ سب نہ صرف معیاری ہیں بلکہ غور و فکر اور وسیع مطالعے کے بعد لکھے گئے ہیں۔ ان مقالات میں جو تنوع ہے وہ کسی ایک کتاب میں مشکل سے ملے گا۔ اس سال جس سہ روزہ سیمی نار کا اہتمام کیا گیا ہے اس کا موضوع "اقبال: فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید" ہے۔ اس سیمی نار میں پڑھے جانے والے سب مقالے بھی انشاء اللہ اسی سال کتابی صورت میں شائع کر دیے جائیں گے۔

پاکستان کے حوالے سے یہ موضوع غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا ہے اور ہمارے ملک کی غالب اکثریت اسلام کو اپنی معاشرتی و باطنی زندگی میں نافذ کرنے کی خواہش مند ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس نفاذ کے لیے فکر اسلامی کی تشکیل جدید اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اقبال اس کے داعی بھی ہیں اور مبلغ بھی۔ وہ آج اسلامی ممالک میں اسی لیے اسلامی نشاۃ الثانیہ کی علامت بن گئے ہیں۔ ایران میں انقلاب کے بعد جتنا کام اقبال پر ہوا ہے اتنا کام پاکستان کو چھوڑ کر کسی اور مسلم ملک میں نہیں ہوا۔ ایران کے علی شریعتی اور حسین نصر نے بھی فکرِ اقبال سے اپنی فکر و بصیرت کا چراغ روشن کیا ہے۔ جن موضوعات اور سوالات کو اقبال نے آج سے پچاس ساٹھ سال پہلے اٹھایا تھا وہ آج مسلم امّہ کے لیے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فکرِ اقبال آج ساری مسلم دنیا میں روشنی کا ایک منبع بن چکی ہے۔ اقبال نے "دی ری کنسٹرکشن اوف ریلیجیس تھوٹ اِن اسلام" میں اپنے خیالات کو اس طور پر پیش کیا تھا کہ مسلمانوں کی فکر دورِ جدید کے مسائل اور عہدِ حاضر کے افکار کے دائرے

میں داخل ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں اقبال پر بہت کام ہوا ہے اور سینکڑوں چھوٹی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں لیکن اگر ادبیاتِ اقبال کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں سے بیشتر کتابوں کی حیثیت دراصل توضیحی نوعیت کی ہے اور انھیں ہم زیادہ سے زیادہ تفہیم اقبال کے سلسلے میں "حواشی" کا نام دے سکتے ہیں۔ ان حواشی سے خیالاتِ اقبال کی تشہیر تو ہو جاتی ہے لیکن اس سے فکرِ اقبال کی روایت آگے نہیں بڑھتی۔ "فکر" تو، جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں، تنقید سے قدم قدم آگے بڑھتی ہے لیکن حیرت کی بات ہے کہ اقبال پر تنقید کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ اقبال نے، نیک ارادوں اور خلوصِ دل کے ساتھ، عہدِ حاضر اور اسلام کے حوالے سے، ان بنیادی امور پر غور کیا تھا جن سے کسی قوم کی زندگی، اس کے ارتقا اور عروج و زوال کی داستان مرتب ہوتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم فکرِ اقبال کا تنقیدی جائزہ لیتے، اس سے آنکھیں چار کر کے اس طور پر چھان بین کرتے کہ فکرِ اقبال کی روایت وہاں سے آگے بڑھ سکتی جہاں خود اقبال نے اسے چھوڑا تھا۔ لیکن ہمارے مزار پرست ذہن نے جھوٹے احترام کا ایک ایسا مصنوعی ہالہ اس عظیم ہستی کے اردگرد بنا دیا کہ اب اقبال سے بات کرتے ہوئے بھی اس لیے ڈر لگتا ہے کہ کہیں مزارِ اقبال کے مجاور اسے اقبال دشمنی کا نام نہ دے دیں، حالاں کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو اسی اندازِ نظر سے ہم اقبال اور فکرِ اقبال کو صحیح معنی میں آگے بڑھا سکتے تھے۔ روایتِ فکر تو کھلی، آزاد فضا میں، تنقیدی سطح پر آگے بڑھ سکتی ہے ورنہ بصورتِ دیگر تو صرف حکم دیا جا سکتا ہے جس کی تعمیل ضروری ہے۔ اقبال نے جیسا کہ میں نے عرض کیا، بڑے درد و کرب کے ساتھ ان بنیادی مسائل پر غور کیا تھا جن کا تعلق دنیائے اسلام کی زندگی و موت اور مستقبل سے تھا۔ اقبال کو ہم اسی طریقے سے حیاتِ نو دے سکتے ہیں جس طرح انھوں نے اپنے اسلاف کے افکار و خیالات کا تنقیدی محاکمہ کیا تھا۔ صرف پھولوں کی چادر چڑھانے یا مزارِ اقبال پر قوالی کرانے سے ہم اقبال کو زندہ نہیں رکھ سکتے۔ اقبال نے زندگی کے مسائل کے بطن کی گہرائیوں میں اُتر کر سوچا سمجھا تھا اور کربِ تخلیق سے گذر کر نئی فکر اور نئی مسلم تہذیب

کی جہت مقرر کر کے ہمیں ایک راستہ دکھایا تھا جس پر چلنا اور اسے صاف و کشادہ کرنا ہمارا فرض تھا، لیکن حسن اتفاق دیکھیے کہ ان کے اسی پہلو پر بہت کم کام اور بہت کم غور و فکر ہوا ہے۔

اقبال کے ۶ خطبات ۱۹۳۰ء میں شائع ہو چکے تھے اور ۱۹۳۴ء میں ایک خطبے کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئے۔ پہلے چار خطبے علم اور مذہبی مشاہدات، مذہبی مشاہدات کا فلسفیانہ معیار، ذاتِ الٰہیہ کا تصوّر اور حقیقتِ دعا، اور خودی، جبر و قدر، حیات بعد الموت پر دیے گئے ہیں۔ ان خطبوں میں اقبال نے قدیم تصوّرات کو عہدِ حاضر کے تعلق سے دیکھا اور سمجھا ہے۔ ان چاروں خطبات میں آپ کو عہدِ حاضر کی روح اور اس کے تقاضوں کا سراغ ملے گا۔ پانچویں خطبے میں اسلامی کلچر کی روح کو تلاش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ چھٹے خطبے میں اجتہاد کو موضوعِ سخن بنایا ہے اور آخری خطبے میں اس بات پر بحث کی گئی ہے کہ کیا مذہب کا امکان ہے؟۔ یہی وہ مسائل ہیں جو آج نہ صرف ہماری بلکہ ساری مُسلم اُمّہ کی تہذیبی و سیاسی ضرورت ہیں۔

آج کا کلیدی خطبہ جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اقبال اور "عصرِ جدید میں اسلامی ریاست کا تصور" کے موضوع پر دیا ہے اور یہی وہ موضوع ہے جس پر ہمیں ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہی غور کرنا چاہیے تھا تاکہ ہم جدید اسلامی ریاست کو قائم کر کے اس کے سیاسی و تہذیبی ارتقا کے لیے راہ ہموار کر سکتے۔ اقبال نے تحریک پاکستان کو فکری و جذباتی بنیادیں فراہم کی تھیں لیکن پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہمیں تعمیرِ مملکت کے لیے فکرِ اقبال کو نئے سرے سے تلاش کرنے کی ضرورت تھی مگر چوں کہ ایسا نہیں ہوا اس لیے ہم آج تک منزل سے دور کھڑے ہیں اور حیرتی بن کر کبھی مغرب کی طرف آنکھیں میچ کر بے شعوری کے ساتھ چلنے لگتے ہیں اور کبھی نئے سرے سے اپنی منزل کے تعین کی غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اِس وقت دُنیا میں جن نظریات کا چرچا ہے وہ سب بیسویں صدی میں استعمال کی بھٹی سے گذر کر فرسودہ ہو گئے ہیں اور تیزی سے ہو رہے ہیں۔ دنیا اب ان سے آگے نکل چکی ہے۔ یہ صورتِ حال وقت کے ساتھ ساتھ اور نمایاں ہو گی۔ اس لیے ضرورت

اس بات کی ہے کہ آنے والے زمانے کے لیے ہم مسائل پر از سر نو غور کریں، نئے سوالات اٹھائیں اور ان کے جوابات تلاش کریں۔ اجتہاد کا مسئلہ بھی اسی لیے غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس سیمی نار سے جو باتیں سامنے آئیں گی وہ نہ صرف فکر و نظر کے نئے راستے ہمارے سامنے کھولیں گی بلکہ پاکستان میں فکری روایت کو بھی مستحکم کریں گی۔

یہاں تک پہنچا تو یاد آیا کہ مجھے مقالہ نہیں بلکہ صرف خطبۂ صدارت پیش کرنا تھا اس لیے خطبۂ صدارت کے آداب کے پیش نظر میں اپنی بات، نیک تمناؤں کے ساتھ، اس پیش گوئی پر ختم کرتا ہوں کہ اس موضوع کے بحر منجمد کا ساحل بہت دور ہے اور ہماری کشتی بادبانی بھی ہے اور چھوٹی بھی۔

(۲ر اپریل ۱۹۸۷ء)

مسجدِ قرطبہ

اقبالؔ ایک عظیم شاعر ہیں اور "مسجدِ قرطبہ" اس عظیم شاعر کی ایک عظیم تخلیق ہے۔ جیسے عمارتوں میں تاج محل حُسن و جمال کا شاہکار اور فنِ تعمیر کا کامل نمونہ ہے اسی طرح "مسجدِ قرطبہ" شاعری کا تاج محل ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ کے فکر و فن اس طور پر گھُل مل کر ایک اکائی بن گئے ہیں کہ یہ نظم شاعری کا معجزہ بن گئی ہے۔ اس میں اقبالؔ کی تخلیقی قوتیں اور ان کی فکر کے سارے بنیادی پہلو موجود ہیں۔ اس نظم میں اقبالؔ کا فن ایسی بلندیوں سے ہم کنار ہے کہ خود کسی عظیم شاعر کی تخلیقی زندگی میں ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے۔

"مسجدِ قرطبہ" آٹھ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر بند میں آٹھ شعر ہیں۔ ہیئت کے اعتبار سے ہر بند غزل کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ ہر بند کا پہلا شعر مطلع ہے اور باقی چھ شعر غزل کی طرح ہم قافیہ ہیں لیکن آٹھواں شعر اسی بحر میں ہونے کے باوجود ردیف و قافیہ کے اعتبار سے الگ ہوجاتا ہے۔ یہ شعر ایک طرف فکری و تخلیقی سطح پر پہلے بند سے پوری طرح وابستہ ہے اور دوسری طرف اپنے اگلے بند کے موضوعِ فکر کی طرف اشارہ کرکے اس سے وابستہ ہوجاتا ہے اور اس طرح نظم کے ارتقاء میں مدد دیتا ہے۔ جیسے ہر بند کا ہر شعر ایک دوسرے سے پیوستہ ہے، اسی طرح اس نظم کا ہر بند اپنی جگہ حسین و موثر بھی ہے اور ساتھ ساتھ پوری نظم سے ہم آہنگ بھی۔ تاج محل کے مینار الگ الگ ہیں لیکن مینار الگ الگ بھی اور مل کر بھی پوری عمارت کے توازن و آہنگ میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہی کاملیت اقبالؔ کی نظم "مسجدِ قرطبہ" میں نظر آتی ہے۔ اس نظم میں اقبالؔ نے ایسی نغمہ ریز بحر

استعمال کی ہے کہ معلوم ہوتا ہے یہ بحر اسی نظم کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس بحر کو قدیم و جدید شعراء نے اکثر استعمال کیا ہے لیکن جب ہم اسے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں دیکھتے ہیں تو ذہن فوراً "مسجدِ قرطبہ" کی طرف جاتا ہے۔ اس نظم کے زبان و بیان، اس کی بندش و تراکیب، اس کی نغمگی اور کیف اس کی فکر کا مثبت رویہ ہمیں ایک طلسم میں لے جاتا ہے۔ یہ نظم ان ساری خصوصیات کا مُرکّب ہے۔

مسجدِ قرطبہ مسلمانوں کے عروج و زوال کی علامت ہے۔ اس مسجد کی تعمیر آج سے بارہ سو سال پہلے عبدالرحمٰن الداخل نے شروع کی اور اس کی تکمیل اس کے جانشین ہشام نے ۹۶ء میں کی۔ یہ مسجد چودہ سو سترہ عظیم الشان ستونوں پر قائم ہے جن پر بے شمار حسین و جمیل نقوش کندہ ہیں۔ رقبے کے اعتبار سے یہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ برصغیر کی طرح اسپین میں بھی مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد ڈالی اور سات سو سال تک یورپ کو درسِ تہذیب دے کر جدید علوم و فنون کا راستہ دکھایا اور پھر جب وہاں کے حکمران عیش پرستی میں مبتلا ہوئے، ناانصافیوں نے معاشرے کو اندر سے کھانا شروع کیا۔ خود غرضیوں اور نفسا نفسی نے فرد کو معاشرے سے کاٹ ڈالا، عظیم مقاصد نابود ہو گئے اور مسلمان انھیں بھلا کر متحد نہ رہے اور الگ الگ فرقوں اور قبیلوں میں بٹ گئے تو اسپین کی یہ عظیم مسلم سلطنت نیست و نابود ہو گئی اور پھر یہ ہوا کہ ان کی مسجدیں بے اذان رہ گئیں اور سرزمینِ اندلس پر نام کو بھی مسلمان نہ رہا۔ یہ ایک ایسی عبرتناک کہانی ہے جس سے ہمیں سبق لینا چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ جو قوم علاقہ پرستی کا شکار ہو جاتی ہے، عظیم مقاصد کو چھوڑ کر خود غرضی اور دولت بٹورنے پر لگ جاتی ہے، اس کے حکمران اور راہنما بے مقصد اور ہوس و جاہ پرست ہو جاتے ہیں، اس کا اقتدار بھی اسپین کی طرح ختم ہو جاتا ہے اور اس کی نسلیں دوسروں کی غلام بن کر رہ جاتی ہیں۔ اقبال جب قرطبہ جاتے ہیں تو اسپین کے مسلمانوں کا ماضی و حال ایک لمحے کے لیے ان کے سامنے آجاتا ہے اور اقبال کے لیے ایک روحانی واردات بن جاتا ہے اور مسجدِ قرطبہ ماضی کی عظمتوں اور حال کی ویرانیوں کو بیک وقت جمع کر کے مسلمانوں کی عظمت اور اُن کے زوال کی علامت بن جاتی ہے۔ اقبال اس نظم

میں مسلمانوں کے زوال کی تاریخ بیان نہیں کرتے بلکہ وہ مسلمانوں کے ماضی، ان کے حال اور مستقبل کو بیک نظر نظم میں نمایاں کرتے ہیں۔ اقبالؔ دوسری اقوامِ عالم کی طرح مسلمانوں کے عروج وزوال کو سلسلۂ روز وشب سے پیدا ہونے والے تغیّرات و انقلابات کا سبب بتاتے ہیں۔ نظم کا پہلا بند تغیّر و انقلاب کے اسی نغمے سے شروع ہوتا ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات
سلسلۂ روز و شب تارِ حریرِ دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات
سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات

لیکن وہ قومیں اور وہ افراد جو "کم عیار" ہیں موت ان کا مقدر ہے۔ یہاں اقبالؔ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ تمام معجزہ ہائے ہنر فانی اور کارِ جہاں بے ثبات ہے۔ اس بند میں فنا اور بے ثباتی کا احساس شدت کے ساتھ ہمارے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جب یہ شعر آتا ہے:

اوّل و آخر فنا، باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

تو یہ تاثر اور گہرا ہو جاتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرے بند کا پہلا شعر اس عالمِ مایوسی میں ایک روشنی کی کرن لے کر سامنے آتا ہے:

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام[۴]

اس کے بعد یہ کہہ کر اقبالؔ ہمیں راستہ دکھاتے ہیں:

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات، موت ہے اس پر حرام

اس بند میں اقبال عشق کی عظمت کا نغمہ چھیڑتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ عشق ایسا سیل ہے جو دوسرے سَیل کو روک لیتا ہے۔ عشق دمِ جبرئیل ہے، عشق دلِ مصطفیٰ ہے، عشق خدا کا رسول ہے اور عشق ہی خدا کا کلام ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نغمہ پھوٹتا ہے۔ اسی عشق سے زندگی کا نور اور زندگی کی گرمی پیدا ہوتی ہے۔ عشق کا مثبت اور گہرا تاثر دے کر تیسرے بند میں وہ براہِ راست مسجدِ قرطبہ سے مخاطب ہوتے ہیں:

اے حرمِ قرطبہ عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خود مسجدِ قرطبہ اس عشق کی علامت ہے جس کا ذکر بند میں آیا ہے۔ اسی عشق سے انسان میں وہ تخلیقی قوتیں بیدار ہوتی ہیں جن سے معجزۂ فن نمود پاتا ہے اور اسی عشق سے مسجد قرطبہ سراپا دوام ہے۔ مسجد قرطبہ اس عشق کا اظہار ہے جو سینۂ آدم میں موجزن ہے۔ اصل چیز تو انسان ہے، ایسا انسان جس کے اندر عشق کی آگ روشن ہو، جس کے مقاصد اس کی زندگی میں آتشِ عشق کو فروزاں کر رہے ہوں، جس کا سوز و گداز زندگی کو بدل کر نیا رنگ روپ دے رہا ہو۔ یہ وہی مردِ مسلمان ہے جس کی اذانوں سے سِرِّ کلیم فاش ہوتا ہے اور جس نے عہدِ قدیم میں ساری دنیا کو ایک ایسا پیغام دیا کہ جس سے دنیا کے اندھیرے دُور ہو گئے۔ مسجد قرطبہ سنگ و خشت سے بنی ہے لیکن آج وہ اس کے جذبۂ عشق کی علامت بن کر خود بندۂ مومن کا راز آشکار کر رہی ہے۔ مردِ مسلمان کے عشق کی تپش اور سوز و گداز سے اس کی روح وجود میں آئی ہے۔ یہی وہ عشق ہے جس سے بندۂ مومن کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جو غالب و کار آفریں بھی ہے اور کارکشا و کارساز بھی ہے۔ یہاں اقبال مردِ مومن کے عمل و کردار کی وضاحت کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ مردِ مومن بندۂ مولا صفات ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے۔ اس کا دل بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی اُمیدیں اور خواہشات قلیل ہوتی

ہیں لیکن اس کے مقاصد جلیل ہوتے ہیں۔ اس کی ادا دلفریب اور اس کی نگاہ دلنواز ہوتی ہے۔ گفتگو کے وقت وہ نرم ہوتا ہے لیکن جستجو کے وقت وہ سرگرم ہوتا ہے۔ وہ بزم اور رزم دونوں جگہ پاک دل و پاک باز ہوتا ہے۔ اس کا یقین حق کی سچائی کی آواز ہوتا ہے۔ چوں کہ مسجدِ قرطبہ کو ایسے ہی مردانِ مومن نے وجود بخشا ہے اسی لیے مسجدِ قرطبہ ایک طرف کعبۂ اربابِ فن بن گئی ہے اور دوسری طرف دین اسلام کی سطوت کا نشان بن گئی ہے۔ اسی کے ساتھ اقبال کا تخیل ماضی میں جا پہنچتا ہے۔ اُس ماضی میں جب عربی شہ سوار سرزمین اندلس میں داخل ہوئے تھے اور اپنے عشق اور جلیل مقاصد کے ساتھ اس سرزمین کو فتح کیا تھا، اپنی نگاہ سے مشرق و مغرب کی تربیت کی تھی، یورپ کے اندھیروں کو دُور کیا تھا، اسے عقل کا راستہ دکھایا تھا اور اس سرزمین پہ ایسے ابدی نقوش ثبت کیے تھے کہ آج بھی اندلسیوں کی روشن جبینیں اور آنکھیں ان عرب شہ سواروں کی یاد تازہ کر رہی ہیں۔ اس خیال سے اقبال کا لہجہ گداز ہو جاتا ہے۔ اب وہ دیکھتے ہیں کہ صدیوں سے قرطبہ کی فضا بے اذان ہے۔ یہاں اقبال کے قلب میں یہ خواہش موجزن ہوتی ہے کہ آخر عشقِ بلاخیز کا وہ قافلہ اب کہاں ہے جس نے اندلس کی سرزمین پر چراغِ حرم روشن کیا تھا۔ یہاں تغیّر و انقلاب کا تصوّر دوبارہ سامنے آتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ جرمنی کے مارٹن لُوتھر نے اصلاحِ دین کی شورش برپا کر کے نقشِ کہن سب مٹا دیے تھے۔ انقلابِ فرانس نے مغرب کی دنیا کو دگرگوں کر دیا تھا۔ رومیوں نے تجدید کے ذریعے اپنی مُردہ قوم کو پھر سے جوان بنا دیا تھا۔ اگر یہی عمل مسلمانوں میں جاری ہو تو وہ بھی دوبارہ اپنے زوال کو عروج سے بدل سکتے ہیں۔ یہ دیکھ کر جب وہ دنیائے اسلام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی انھیں وہی اضطراب نظر آتا ہے جو ترقی سے پہلے مغربی اقوام میں نظر آیا تھا۔ اس اضطراب کو دیکھ کر شاعر میں امید و رجا کی لہر دوڑ جاتی ہے اور وہ کہہ اُٹھتے ہیں:

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اب عالمِ نو اُن کی نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے اور وہ اس کی سحر کو بے حجاب دیکھنے لگتے ہیں اور پھر وہ ترقی کا حقیقی راز ان دو شعروں میں بیان کر دیتے ہیں:

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
روحِ اُمم کی حیات کش مکشِ انقلاب
صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

اقبال کے نزدیک ترقی کا راز یہ ہے کہ قومیں اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہیں۔ ہر وقت اپنے اعمال کا حساب کرتی رہیں اور بدلتے ہوئے زمانے کے مطابق اپنے عمل کو ڈھالتی رہیں۔ مسلمان بھی اسی عمل سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ وہ آج جو کچھ ہیں، اپنی حالت کا جائزہ لیں، اپنے اندر تبدیلی پیدا کریں۔ تجدید سے اپنے افکار کو بدلیں اور ان افکار کے مطابق اپنے اعمال کو ڈھالیں۔ یہی ترقی کا راستہ ہے اور اسی سے نیا خون قوم کی رگوں میں گردش کرتا ہے۔ مُفکر کا، دانشور کا یہی کام ہے کہ وہ قوم کے لیے غور و فکر کا مسالا فراہم کرے اور اسے راستہ دکھائے۔

اقبال نے اس نظم میں بھی یہی پیغام دیا ہے اور ایک ایسے ملک کو وجود بخشا ہے جو اسلام کا قلعہ بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن جب اقبال نے اپنا کام ختم کیا، مُلک بن گیا اور آتشِ عشق کے فروزاں ہونے کا وقت آیا تو اس قوم نے خود غرضیوں، ہوس پرستیوں، حرص و جاہ کی خواہشوں، دولت بٹورنے کی اندھی آرزوؤں کی مٹی سے اِس آتشِ عشق کو بجھانے کا کام شروع کر دیا۔ اس طرح ہر نئی صبح نئے مسائل لے کر آئی اور یہ مُلکِ عزیز ہماری بداعمالیوں کی تاریکیوں سے ذلیل و رسوا ہو گیا۔ روحِ اقبال جس نے نئی سحر کو دیکھا تھا اور اس بات کی منتظر تھی کہ ؏

دیکھیے اس بحر کی تہہ سے اُچھلتا ہے کیا

مضطرب و بے قرار ہو گئی۔ آئیے ہم سب غور کریں کہ صبح سے شام تک ہم جو کچھ کرتے ہیں اس سے مُلک و قوم کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کیا ہم صرف اپنی ذات کی بھلی

پھر کر اپنی قوم کی حفاظت کر سکتے ہیں ؟ کیا ہمارا یہ عمل عشق کی اُس آگ کو ، جسے فروزاں کرنے کے لیے اسے وجود میں لایا گیا تھا، بجھا نہیں دے گا ؟ اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ ہمیں یہی راستہ دکھاتی ہے :

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں، اپنے عمل کا حساب
نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام، خونِ جگر کے بغیر

(۱۹۷۷ء)

اقبال کا پیغامِ عمل

اقبال ہمارے بڑے شاعر ہیں' ایسے بڑے شاعر کہ کوئی دوسرا شاعر ان کے رنگ' ان کی فکر اور ان کے مزاج کا نظر نہیں آتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانانِ برصغیر جس ابتلا میں مبتلا ہوئے' یوں معلوم ہوتا تھا کہ ملت کی کشتی اب کبھی اُبھر نہ سکے گی۔ سر سید احمد خاں نے تہذیب کی اس گرتی دیوار کو سہارا دیا اور اسے دوبارہ کھڑا کر دیا۔ حالی نے عظمتِ رفتہ کے نغمے الاپے اور مسدسِ حالی سے ملتِ اسلامیہ کے خون کو نہ صرف گرما دیا بلکہ اس میں اپنے ماضی کا شعور بھی پیدا کر دیا۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی منفرد شاعری سے اپنی اقدار' اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کی اہمیت کا شعور بیدار کیا اور حالی کی طرح ان کے اشعار بھی ملتِ اسلامیہ کی زبان پر رواں ہو کر اس کے احساس اور اس کے جذبات کا حصہ بن گئے۔ یہ کام اس طور پر اس سے پہلے شاعری نے انجام نہیں دیا تھا۔ اس پس منظر میں اقبال کی صدا بلند ہوئی۔ اقبال نے نہ صرف اپنے دور کے جذبات و احساسات' افکار و خیالات' رجحانات و میلانات کو اپنی شاعری میں سمویا بلکہ روحِ عصر کو سمیٹ کر اسے ایک جہت' ایک سمت بھی دے دی۔ انھوں نے شاعری سے بیک وقت دو کام لیے۔ ایک یہ کہ اپنے معاشرے کے انسان کو اپنی تہذیب' اپنے مذہب' اپنے عقائد' اپنے اقدار کا شعور دیا اور اس پر واضح کیا کہ یہ وہ عقائد و اقدار ہیں جن سے وہ دوبارہ عظمتِ رفتہ کو حاصل کر سکتا ہے۔ جب فکر جذبہ بن کر انسان کی رگوں میں تیرنے لگتی ہے تو اس سے پیدا ہونے والی حرارت حرکت و عمل کی طرف لے جاتی ہے۔ اقبال نے اپنی شاعری سے ایک طرف شعور کو ابھارا'

اسے راستہ دکھایا، اس کی منزل کا تعین کیا اور پھر اسے نغمہ بنا کر ایک زندہ جذبے میں تبدیل کر دیا اور اسی جذبہ نے معاشرے کو عمل کا راستہ دکھا دیا :

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

صداقت کا شعور اور اس پر ایمان وہ انسانی صفات ہیں جو زندگی کا رُخ بدل دیتی ہیں ۔ جو انسان کا خواب بن کر تعبیر کے لیے اسے بے چین کر دیتی ہیں ۔ شاعر خواب دیکھتا اور پھر اس خواب کو سارے معاشرے کو دکھاتا ہے ۔ یہ خواب زندگی میں عمل کا پیغام بن جاتا ہے جس کا حصول مقصدِ حیات بن جاتا ہے ۔ اقبال نے اپنی شاعری سے یہی کام کیا اور اس خوب صورتی اور ایسے سلیقے سے کیا کہ ملتِ اسلامیہ کے تنِ مردہ میں جان پڑ گئی اور وہ قوتِ عمل کا پیکر بن کر باشعور بن گئی ۔ اقبال نے کہا :

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

اقبال کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے اسلامی فکر کو نغمہ بنا کر قلبِ انسانی میں ایک ایسی حرارت پیدا کر دی کہ انسان قوتِ عمل کا پیکر بن گیا ۔ یہی وہ شاعری ہے جسے قرآن پسند کرتا ہے ۔ یہ وہ شاعری نہیں جو انسان کے دل کو مُردہ اور اس کو افسردہ کر دے ۔ وہ فکر ، وہ فلسفہ ، وہ ادب اور وہ شاعری جو صرف یہ کام کرتے ہیں انسانی فکر کو پست کر دیتے ہیں ۔ اقبال نے اپنی شاعری سے انسان کے حوصلے بڑھائے اور اسے پیغامِ عمل دیا تاکہ وہ اِس منزل تک پہنچ سکے جس کا تعین اُنھوں نے فکری سطح پر کیا تھا ۔ اسی لیے اقبال کی شاعری نغمہ بھی ہے اور فکر و عمل کا فلسفہ بھی ۔ اقبال کی شاعری کے سلسلے میں ایک بات یہ اور کہتا چلوں کہ ان کا محبوب انسانِ کامل ہے ۔ انسانِ کامل

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قدر ہے اور یہ وہ ذات ہے جو پیکرِ فکر بھی ہے اور پیکرِ عمل بھی۔ اقبالؔ کی شاعری جو پیغامِ عمل اور پیغامِ فکر دیتی ہے وہ اسی عظیم ہستی کا آدرش ہے اور اسی طرح انسان کے دل و دماغ پر اثر کرتی ہے جس طرح اس بندۂ مولا صفات کا پیغام حرکت و عمل کا پیغام ہے۔ اقبالؔ کی شاعری اسی لیے توانائی، قوت اور حرکت و عمل کی شاعری ہے اور اسی لیے اقبالؔ بحیثیت شاعر عظیم ہے۔

(۸ر نومبر ۱۹۸۸ء)

جوش ملیح آبادی

آج حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی وفات کو چھ سال ہو چکے ہیں اور وہ دارالحکومت پاکستان میں اپنی آخری آرام گاہ میں خوابیدہ ہیں اور تاابد خوابیدہ رہیں گے لیکن اُن کی شاعری کی گونج سارے برصغیر کے گوشے گوشے میں آج بھی اسی طرح سُنائی دے رہی ہے۔ انسان فانی ہے لیکن اس کے کارنامے لافانی ہیں۔ حضرت جوشؔ نے جنگِ آزادی کے دوران جس طرح برصغیر کے معاشرے کو شعور کی روشنی سے بیدار کیا اور جس طرح ہمارے دلوں کی ترجمانی کی وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی تاریخ کا حصہ ہے اور جب بھی شعورِ آزادی بیدار کرنے کا ذکر آئے گا جوشؔ کا نام سرفہرست ہوگا۔ وہ ایک بے باک انسان تھے۔ جو اُن کے دل میں ہوتا وہی اُن کی زبان پر ہوتا، اسی لیے معاشرہ اور اس کے زود رنج افراد ان سے ناراض ہو جاتے۔ وہ آزادی اور انقلاب کے شاعر تھے اور آزادی اور انقلاب کا شاعر منافق نہیں ہوتا۔ حضرت جوشؔ بھی منافق نہیں تھے اور اسی لیے وہ عظیم تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے ناراض ہونے والوں کی نسل صاف ہوتی جائے گی حضرت جوشؔ کی شاعری کی دھوپ تاریخ کے در و بام پر پھیلتی چلی جائے گی۔ ان کے مزاج میں دو دھارے ساتھ ساتھ بہتے تھے۔ ایک جاگیردارانہ نظام کی روایت اور دوسرے انسان اور آدمیت کی حکمرانی کی روایت۔ معمولاتِ زندگی میں وہ جاگیردارانہ نظام کے حامل تھے لیکن ذہنی طور پر وہ فرد کی آزادی کے علمبردار تھے اور ایک ایسے معاشرے کے خواہاں تھے جو جبر و استحصال اور ناانصافیوں سے پاک ہو۔ جہاں فرد کو اظہار کی پوری آزادی ہو اور جہاں انسانیت کا احترام کیا جاتا ہو۔ جب وہ اپنے خاندان پر فخر کرتے تھے تو جاگیردارانہ نظام کی روایت ان کے شانوں پر کھڑی ہو کر پکارنے لگتی تھی۔ جوشؔ نے لکھا ہے کہ "میری دادی کہتی تھیں بیٹا تیرے پردادا کی

سواری جب نکلتی تھی تو اس کے آگے آگے نقیب بولا کرتے تھے۔ "ہٹو بچو، سواری آرہی ہے نواب فقیر محمد خان بہادر کی"۔ اُن کے دادا محمد احمد خان احمد بھی نواب تھے اور ان کے والد بشیر احمد خان بشیر بھی نواب تھے اور ان کے پردادا حسام الدولہ تہور جنگ فقیر محمد خان گویا بھی نواب تھے۔ خاندان کی یہ روایت معمول کے مطابق جوش صاحب کے خون میں شامل تھی اور اس لیے شامل تھی کہ انھوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی اور اسی ماحول سے بغاوت کر کے اپنی شاعری کا سورج طلوع کیا تھا اور مظلوم انسان کی آواز کو سارے برصغیر کے دور دراز گوشوں تک پہنچایا تھا۔ مخصوص ماحول میں پرورش پاکر اس سے بغاوت کرنا اور عوام کی حمایت میں اپنی تخلیقی قوتوں کو استعمال کرنا ایک ایسا مشکل عمل ہے جس کو وہی صاحبانِ دل سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے فرہاد کی طرح پہاڑ کھود کر جوئے شیر رواں کی ہے۔ ۱۹۰۷ء میں جب جوش صاحب کی عمر صرف ۹ سال تھی انھوں نے جو پہلا شعر لکھا تھا اس سے بھی میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے۔ وہ شعر آپ بھی سن لیجیے:

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے
یہ میرا فنِ خاندانی ہے

اور پھر جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی تو ۱۹۳۹ء میں ان کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" نے سارے برصغیر میں جذبۂ آزادی کی وہ آگ لگائی کہ یہ نظم آج بھی جنگِ آزادی کی تاریخ کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ خاندانی روایت پر فخر اور جذبۂ آزادی کا اظہار یہی وہ دو متضاد دھارے ہیں جن سے جوش کی شخصیت عبارت ہے۔ جوش کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کے لیے اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے۔ خاندانی روایت نے اُن کی شخصیت میں جرأت و بے باکی پیدا کی اور پیدائشی و ذہنی قوتوں نے اُن میں دینِ بزرگاں پر ضرب لگانے کا حوصلہ پیدا کیا۔ جوش صاحب نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"میں اپنی قوم کا ایک معتوب، مبغوض اور مغضوب انسان ہوں اور اس بنا پر مغضوب ہوں کہ میری قوم کے نزدیک مجھ میں یہ بدترین عیب پایا جاتا ہے کہ میں اقوال و اساطیر، روایات و ملفوظات، کلیات و مسلمات اور ایقان و

اعتقاد کو محکم دلائل کی کسوٹی پر کسے بغیر قبول نہیں کرتا ۔ تشکک کو عرفان و حقائق کی کنجی سمجھتا، تقلید پر اجتہاد کو فوقیت دیتا، بے سمجھے بوجھے ایمان پر سمجھے بوجھے کفر کو ترجیح دیتا ہوں اور کلمۂ حق کے اظہار و اعلان میں اس بلا کا جری ہوا ہوں کہ دُنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے دبکنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

(افکار جوش نمبر ص ۱۶)

شاعرانہ زندگی میں فکری و تخلیقی سطح پر یہی اندازِ نظران کی کامیابی کا راز تھا اور ذاتی زندگی میں یہی اندازِ نظران کی ناکامیوں کا سبب تھا۔ ۱۹۳۴ء میں اسی وجہ سے وہ حیدر آباد دکن سے نکالے گئے۔ اسی وجہ سے وہ ترقی اردو بورڈ کراچی سے الگ ہوئے اور اسی وجہ سے وہ اسلام آباد میں دُکھ بھوگتے رہے اور آج حضرت جوش اپنی آخری آرام گاہ میں لیٹے ہوئے اس طبقاتی شہر کی تہذیبی و تخلیقی زندگی کو اُجالا بخش رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب ہم اپنی معاشرتی تبدیلیوں کے عبوری دور سے گذر کر اور نسلی، لسانی اور صوبائی تعصبات سے بلند اُٹھ کر فی الحقیقت روحِ پاکستان کو جنم دیں گے تو سرزمینِ اسلام آباد اس عظیم شاعر کی روح کو دوبارہ دریافت کرے گی، اور اُس کے کلام کو اپنے سینے سے لگا کر اُسے وہ اہمیت دے گی جس کا بہمہ وجوہ وہ مستحق ہے۔ حضرت جوش شاعرِ انقلاب بھی ہیں اور شاعرِ آزادی بھی، وہ شاعرِ انسانیت بھی ہیں اور شاعرِ رومان بھی اور انھوں نے جس طور پر لفظوں کو رنگ و لذت بخشا ہے اور جس سلیقے سے انھیں تخلیقی سطح پر برتا ہے اس دور کا کوئی دوسرا شاعر اس مرتبے کو نہیں پہنچتا ـــ فراق گورکھپوری نے کہا تھا کہ میں جہاں احساس و جذبے کے اظہار کے لیے لفظ ڈھونڈتا رہ جاتا ہوں جوش انھیں آسانی سے شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں۔

حضرت جوش کو پہلی بار میں نے اُس وقت دیکھا جب وہ کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لیے میرٹھ آئے تھے۔ یہ ۱۹۴۴ء کی بات ہے اور میں اس وقت انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ہمارے کالج میں بھی ایک بڑا مشاعرہ ہوا جس میں متعدد مشہور شاعروں کے علاوہ مجاز اور جوش بھی موجود تھے لیکن ان سے ملاقات اس وقت ہوئی جب وہ پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ ہر ہفتے محفلِ مشاعرہ ہوتی۔ کبھی میرے گھر پر اور کبھی مبین الحق صدیقی کے گھر پر جس میں

کراچی کے نامور شعراء شریک ہوتے اور دوپہر کو کھانے کے بعد یہ محفل برخاست ہوتی۔ اُن کے ہاں اکثر جانا ہوتا۔ ایک دن میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی مرحوم اُن کے ہاں بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس لگی۔ ملازم ریفریجریٹر سے ایک بوتل اور گلاس نکال لایا۔ جوشؔ صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے "جالبی صاحب! اَرم کی بوتل میں پانی"۔ غالباً اَرم کی بوتل کا خیال انھیں مولانا قدوسی کی سفید داڑھی دیکھ کر آیا تھا۔ اتنے میں مولانا پانی پی چکے تو جوشؔ صاحب بولے :

مولوی نے اپنا دامن سی لیا
آگ کی بوتل سے پانی پی لیا

ایک اور واقعہ یاد آیا۔ ۱۹۵۹ء میں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوشؔ صاحب، پیر حسام الدین راشدی ایک ساتھ گئے اور میں، مولانا قدوسی اور مبین الحق صدیقی، جو بعد میں مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر بنے، دوسری گاڑی میں گئے۔ جوشؔ صاحب سفارت خانے میں ہم سے پہلے پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آ گئے۔ ہم دیر سے پہنچے تھے۔ محفل برخاست ہو چکی تھی۔ ایک صاحب نے بتایا کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلا گئے ہیں۔ رات کے دس بجے تھے۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ دیکھ کر بولے "اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی"۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب جوشؔ صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے "بول اک تارے جھن جھن جھن" نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انھیں مشاعرے میں سب کے بعد پڑھوایا گیا تھا چند مفاد پرست حاسد ان کے خلاف اخبار "ڈان" میں خط شائع کرا رہے تھے اور ہر قسم کی مہمل باتیں لکھوا رہے تھے۔ میں نے کہا جوشؔ صاحب نظم تو بہت اچھی تھی۔ اس نظم میں تصورِ انسان الوہیت کے اس درجے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ و نسل اور قوم و ملت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ کہنے لگے "میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے لیکن اندازِ بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ مابعد الطبعیاتی موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اُتر جائے۔ اس کے قافیے، اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ بحر جو میں نے استعمال کی ہے، وہ ساری نظم کو موسیقی کر رہی ہے۔" میں نے کہا "جوش صاحب! یہ نظم پھر سُن لی جائے۔" یہ سُن کر

انھوں نے آواز دی " ذرا بیگ بھیج دو "۔ جواب میں اندر سے آواز آئی " ابھی تو چیخ کر آئے ہو۔ اب پھر شروع کر دیا " یہ اُن کی بیگم تھیں۔ راز دارانہ انداز میں جوشؔ صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر آہستہ سے بولے " مادرِ مہربان ہیں۔ انھیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے۔"

جوشؔ صاحب باغ و بہار انسان تھے۔ محفل میں بیٹھتے تو ایسے کہ سب کی توجہ کا مرکز بن جاتے اور محفل کو ایسے سجاتے کہ سب عالمِ محویت میں آجاتے۔

ساری عمر یونہی بسر کی۔ از سرتا پا شاعر تھے۔ یہی اُن کی زندگی تھی اور یہی اُن کا اوڑھنا بچھونا۔ روشن دماغ بھی تھے اور وسیع القلب بھی۔ کینہ پروری سے دور اور سچائی کے اظہار میں بے باک۔ ادیب و شاعر کی ضروریاتِ زندگی تو عام آدمی کی سی ہوتی ہیں لیکن وہ عام آدمی سے اپنے رویّے اور طرزِ عمل میں مختلف ہوتا ہے اور اسی وجہ سے باسی معاشرہ اس سے متصادم ہو جاتا ہے۔ جوشؔ صاحب کے ساتھ بھی یہی ہوا اور شاید جب تک یہ نظام موجود ہے ہم ادیب و شاعر کو مفلس و مفلوک الحال دیکھ کر اسی طرح مسرور و شادماں رہیں گے۔ نئی نسل کے نام ان کا پیغام یہ تھا۔ آپ بھی سُن لیجیے :

نوخواستہ شاعرو ٹھٹھر جاؤ گے　　تقلید یونہی رہی تو پچھتاؤ گے
جب تک مجھے گم نہیں کرو گے بچو　　کہتا ہوں کہ اپنے کو نہیں پاؤ گے

۱۹۲۰ء میں جب جوشؔ ملیح آبادی کا پہلا مجموعہ "روحِ ادب" کے نام سے شائع ہوا تو اکبر الٰہ آبادی نے لکھا کہ "آپ نے چشم بد دور عمدہ طرزِ بیان پایا ہے۔ باسی سوسائٹی میں رہ کر ایسے خیالاتِ عالی حیرت افزا ہیں۔"

آج جوشؔ کو ہم نے صرف لفظوں کی گھن گرج کا شاعر سمجھ لیا ہے حالانکہ ان کی شاعری میں وہ تنوّع اور وہ رنگارنگی ہے کہ اس صدی کے چند شاعر ہی اُن کے مرتبے کو پہنچتے ہیں۔

نگار خانۂ گیتی مرے کلام کا صید　　طلسم خانۂ گردوں مرے سخن کا شکار

(۲۲ر فروری ۱۹۸۸ء)

جوش کی وفات پر

آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ کسی عزیز ہستی کی موت پر ہونے والے تعزیتی جلسے میں کچھ کہنا اور وہ بھی اتنی جلدی کہ اس عزیز کی وفات کو مشکل سے دو دن ہوئے ہوں اور ابھی آنسو بھی خشک نہ ہوئے ہوں، یقیناً ایک انتہائی دشوار کام ہے۔ میں کیا کہوں یا مجھے کیا کہنا چاہیئے یہ مجھے خود بھی معلوم نہیں ہے البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جب گیارہ بجے کی خبروں میں جوش صاحب کی وفات (۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء) کی خبر سنی تو یوں محسوس ہوا جیسے مجھ پر اچانک بجلی گر پڑی ہے۔ مرنا برحق ہے لیکن دلبندوں اور پیاروں کا مرنا ایک ایسا سانحہ ہے جسے یاد کرنے والے ساری عمر آنسوؤں کے ساتھ یاد کرتے رہتے ہیں اور یہ وہ زخم ہے جو ہمیشہ رِستا رہتا ہے۔ جوش صاحب ہزاروں، لاکھوں انسانوں کے دوست تھے۔ میرے بھی بزرگ دوست تھے۔ یادوں کی ایک پوری برات ہے جو ذہن کے دریچوں سے جھانک رہی ہے لیکن ان یادوں کو دہرانے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ اس وقت ان کو بیان کرنے کی مجھ میں تاب ہے۔ میں تو اس وقت صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ جوش صاحب آج ہم میں نہیں ہیں۔ ان کے نہ ہونے سے دنیائے ادب کی ساری محفل سونی، ویران اور اُداس ہے۔ یہ تو وہ موقع ہے کہ ہم صرف آنسوؤں سے اس عظیم انسان کو خراجِ عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔ جوش صاحب کی موت ایک قومی سانحہ ہے۔

اس کے بعد بھی اگر مجھے کچھ کہنا پڑے تو میں یہ کہوں گا کہ حضرت جوش ہمارے دور کے وہ عظیم شاعر تھے جنھوں نے اپنی شاعری سے اُردو زبان کو نئی بلندیاں عطا کیں اور جنھوں نے پنے دور کی روح کا اظہار اپنی شاعری میں اس طور پر کیا کہ ان کی شاعری سارے برِعظیم پاک وہند اروح کی ترجمان بن گئی۔ بے باک مصلحت سے بے گانے اور آزاد خیالی۔ جوش ساری عمر زمانے

سے لڑتے رہے۔ زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ ستیز ان کا فلسفۂ حیات تھا۔ اسی لیے مصلحت پسند منافقین انھیں طرح طرح سے تکلیف و آزمائش میں مبتلا کرتے رہے۔ جوؔش صاحب کی جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو ہتھیار ڈال کر صلح کرلیتا اور اُن جیسا بن کر چین کی بانسری بجاتا لیکن جوؔش ان ساری طاغوتی قوتوں سے تن تنہا ٹکراتے رہے اور ان کے دئے ہوئے زخموں کو خندہ پیشانی سے سہتے رہے۔ جوؔش صاحب کھلے دل و دماغ کے آدمی تھے۔ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا اور ان کی اخلاقیات منافقت سے اور ان کی زندگی قول و فعل کے تضاد سے پاک تھی۔ جوؔش صاحب ایک عہد آفریں شخصیت تھے۔ ایک ایسی شخصیت جو زندگی ہی میں افسانہ بن گئی تھی اور جن کی شہرت برِ عظیم کے حدود سے نکل کر دُنیا کے دور دراز گوشوں تک پہنچ گئی تھی۔ وہ جدید دور کے وہ شاعر تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ایسے عظیم انسان اور عظیم شاعر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

جوؔش صاحب انسان اور انسانیت کے شاعر تھے اور اسی لیے وہ تعصبات سے پاک تھے۔ ان کی شاعری اسی لیے کسی ایک طبقے، ایک علاقے یا ایک فرقے کو متاثر نہیں کرتی بلکہ ساری انسانیت کے دلوں پر حکمرانی کرتی ہے۔ جوؔش کی شاعری نے برِ عظیم کی جنگِ آزادی میں وہ عظیم کردار ادا کیا کہ شاید ہی برِ عظیم پاک و ہند کی کسی بھی زبان کے کسی اور شاعر کے بارے میں یہ بات کہی جاسکے۔ جوؔش آزادی کے رجز خوان تھے۔ انقلاب کی وہ دو دھاری تلوار تھے جس نے استعمار و آمریت کے خلاف مقدس جہاد کر کے اُسے لہولہان کر دیا۔ ان سے بڑا انقلابی شاعر اردو زبان نے پیدا نہیں کیا۔ فراؔق گورکھپوری نے کہا تھا کہ حضرت جوؔش نازک و لطیف ترین احساسات اور نامعلوم و مبہم جذبوں کو اس طرح آسانی اور خوب صورتی سے بیان کے رشتے میں پرو دیتے ہیں کہ جہاں عجز کلام سے دوسروں کی سانس پھولنے لگتی ہے۔ جوؔش وہ شاعر ہیں جن کی شاعری نے کئی نسلوں کی آبیاری کی ہے اور اقبال کے علاوہ اس صدی کے کتنے شاعر ایسے ہیں جو اس دائرے میں آتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے جوؔش کے پہلے مجموعۂ کلام کے بارے میں، جس میں بقولِ جوؔش "نو برس کی عمر سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کا کلام" شامل تھا، کہا تھا کہ "اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ ہے اس پر ایک ازلی پر تو پڑ رہا ہے

کاش کسی وقت میں، آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔"

جوش ساری زندگی ایسے آدمی کی تلاش کرتے رہے تا جن کے سر میں مغز ہو اور مغز میں تابندگی،

اور

جن کی فکرِ تازہ میں، ہو اجتہادی بانکپن   جن کی عقلوں پر نہ ہو بارِ روایاتِ کہن

جن کے سینے میں ہوں روشن حبِ ملّت کے چراغ   دل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں دماغ

الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا

آدمی دے آدمی دے آدمی دے اے خدا

اسی آدمی کی تلاش کرتے کرتے جوش صاحب اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ آئیے ہم سب بھی روایتِ جوش کی پیروی میں اس آدمی کی تخلیق و پیدائش کے لیے سعی و کوشش کریں جس کی آرزو لے کر جوش صاحب اب ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔ جوش صاحب نے کہا تھا،

مذاقِ بندگیِ عصرِ نو کی تجھ کو قسم

نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

جوش کو یاد کرنے اور خراجِ عقیدت پیش کرنے کا ایک مثبت طریقہ یہ ہے کہ ہم عقل کی سطح پر اجتہاد کو اور جذبہ کی سطح پر حب الوطنی کو اختیار کریں اور اوہام پرستی اور بے جان فرسودہ اقدار سے دامن بچا کر آگے بڑھتی ہوئی زندگی سے آنکھیں ملانے کا شعور پیدا کریں۔ اسی میں ہمارے مستقبل کا راز پوشیدہ ہے اور یہی بات ساری عمر جوش صاحب ہم سے کہتے رہے ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے اور فردوس بریں میں مقامات بلند عطا فرمائے۔

(۲۴ر فروری ۱۹۸۲ء)

جوش کے لطیفے

کسی قوم کی تخلیقی بیماری کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اس کے ہاں لطیفوں کی پیدائش کا سلسلہ بند ہو جائے۔ لطیفے کسی قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کی تاریخ کے قدموں کے نشان ہیں جن سے ہم اس قوم کی پسند و ناپسند، اس کے رویوں، مزاج اور اندازِ نظر کا پتہ چلا سکتے ہیں۔ ایک طرف وہ لطیفے ہیں جو مجموعی طور پر سارے معاشرے کے مزاج پر روشنی ڈالتے ہیں اور جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کدھر جا رہا ہے۔ دوسری طرف وہ لطیفے ہیں جو کسی فرد کی ذات سے مختص ہیں اور خود اس شخصیت کی تاریخ بن جاتے ہیں۔ مولانا حالی نے پہلی بار "یادگارِ غالب" میں غالب کے لطیفوں کو یکجا کر کے انھیں غالب کی شخصیت کا جزو بنا دیا۔ آج ہم ان لطیفوں کے ذریعے غالب کی شخصیت کا اندازہ کرتے ہیں۔ اگر یہ لطیفے نہ ہوتے تو اندازہ کیجیے کہ غالب کی شخصیت آج کس قدر مختلف ہوتی؛ لطیفے جذبات، احساسات اور خیالات کا برجستہ اور برمحل اظہار ہوتے ہیں جس میں شخصیت بغیر کسی تصنع یا بناوٹ کے کھل کر سامنے آتی ہے۔

جوش صاحب باغ و بہار آدمی ہیں۔ اُن کے پاس بیٹھیے تو اُٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اُن کی ظرافت، اُن کی ذہانت و طبّاعی کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہاں جو چند لطیفے ــــ اور اس لفظ کو میں وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں، میں نے پیش کئے ہیں اُن سے جوش صاحب کی شخصیت اور مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱)

۱۹۴۴ء کی بات ہے۔ گرمیوں کے دن تھے۔ میں اس زمانے میں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتا

تھا کہ میرٹھ میں کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس مشاعرے میں ہندوستان کے سارے معروف و مشہور شعراء جمع ہوئے تھے۔ بڑا سا پنڈال بنایا گیا تھا۔ دور دور سے لوگ مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ برسوں بعد جوش و جگر ایک ساتھ مشاعرے میں شریک ہو رہے تھے۔ اس بات کی بھی بڑی دُھوم تھی۔

مشاعرہ شروع ہوا، اور تقریباً رات کے ڈیڑھ بجے جوش صاحب کی باری آئی۔ جوش صاحب اس رات مشاعرہ کی فضا اور ماحول سے اس درجہ مطمئن تھے کہ ان کا جی چاہتا تھا کہ بس سناتے رہیں۔ اُنھوں نے رباعیاں سُنانی شروع کیں اور سُناتے رہے۔ جب وہ اُٹھنے کا ارادہ کرتے، لوگ فرمائشیں شروع کر دیتے۔ اور جوش صاحب پھر سُنانا شروع کر دیتے۔ جوش صاحب ایک رباعی سُناتے، ایک پان کھاتے پھر پیک کرتے اور پھر ایک رباعی سُناتے۔ یہ سلسلہ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے سے جاری تھا۔

جب بہت دیر ہوگئی، اور جوش صاحب تھک گئے تو انھوں نے اعلان کیا۔

"بس بھئی بس، اب تھک گئے ہیں۔"

یہ سُن کر پیچھے سے ایک شخص کھڑا ہوا ــــ بنیان کندھے پر، جسم ننگا ــــ اور اُس نے زور سے چلّا کر کہا!

"ایک اور ہوگی پہلوان! ٹھوک کے۔"

(۲)

میں اور مولانا اعجاز الحق قدوسی جوش صاحب کے ہاں بیٹھے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ قدوسی صاحب کو پیاس محسوس ہوئی۔ نوکر ریفریجریٹر سے ایک بوتل اور گلاس نکال لایا۔ یہ شراب کی بوتل تھی جو عام طور پر خالی ہونے کے بعد جگ کے بجائے کام میں لائی جاتی ہے۔

جوش صاحب میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"جالبی صاحب! رَم کی بوتل میں پانی؟"

مولانا قدوسی دوسرا گلاس پی رہے تھے۔ غالباً رَم کی بوتل میں پانی کا خیال انھیں مولانا

قدسی کی سفید داڑھی دیکھ کر آیا۔

اتنے میں مولانا پانی پی چکے تو جوؔش صاحب بولے: ؎

مولوی نے اپنا دامن سی لیا
آگ کی بوتل سے پانی پی لیا

اور پھر اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے مولانا پر فقرے چُست کرنا شروع کر دیئے۔ مولانا اُن کے تیس سال پُرانے دوست ہیں۔ مولانا کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں ؎

رندوں کو نہ دیکھ چشمِ کم سے
قُدسی ہے یہ قومِ نامسلماں

(۳)

آزاد انصاری مرحوم سے آخر آخر میں جوؔش صاحب کی بیگم ناراض ہوگئی تھیں۔ وہ آتے تو وہ نہ پان بھیجتیں اور نہ خاطر تواضع کرتیں۔ اس واقعے کے پیچھے ایک اور کہانی ہے جو پھر کبھی سناؤں گا۔

جب شام ہونے لگی اور دونوں وقت ملنے لگے تو جوؔش صاحب کا وقتِ مے نوشی آ پہونچا۔ جنھوں نے جوؔش صاحب کو شراب پیتے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ وہ سورج غروب ہونے کے فوراً بعد پینا شروع کرتے ہیں۔ بیگم اندر سے ہر آدھ گھنٹے کے بعد ایک پیگ بنا کر بھیجتی رہتی ہیں۔ گھڑی سامنے میز پر رکھ دی جاتی ہے، وہ ہر پانچ منٹ کے بعد ایک گھونٹ پیتے ہیں اور اسی طرح چھ گھونٹوں میں ایک پیگ پیتے ہیں۔ جب دو گھنٹے ہوجاتے ہیں اور چار پیگ ختم ہوجاتے ہیں تو وہ کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔ صبح نورِ ظہور کے تڑکے اٹھتے ہیں۔ ٹہلنے جاتے ہیں۔ آکر بچوں کے ساتھ ورزش کرتے ہیں اور پھر اپنا کام شروع کر دیتے ہیں۔ اِدھر آٹھ بجے اُدھر شعر و شاعری اور دوسرے تخلیقی کام ختم ہوئے۔ ان کی زندگی بہت باقاعدہ ہے۔

یہ ایک ایسی ہی شام کا ذکر ہے۔ آزاد انصاری بھی موجود تھے، آزاد انصاری کی موجودگی

سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا اور بہت تقاضوں کے بعد بغیر تیار کئے شراب کی بوتل بھیج دی۔ اب جوش صاحب اس انتظار میں بیٹھے ہیں کہ سوڈا آئے تو کام شروع ہو۔ مگر سوڈا ہے کہ نہ اب آتا ہے نہ جب۔ اگر کچھ بولتے ہیں تو بیگم خفا ہو جاتی ہیں۔ بیگم سے ہر شریف آدمی کی طرح جوش بھی بہت دبتے ہیں۔ کئی دفعہ تقاضا کیا۔ مگر وہ سنی ان سنی کر دیتیں۔ آخر جب بہت دیر ہو گئی تو جوش صاحب نے بیگم کو آواز دی۔

"اللہ کی بندی، ذرا یہاں تو آؤ۔"

یہ سن کر جب وہ آئیں تو جوش صاحب گفتگو کے سے انداز میں بولے: ؎

کشتیِ مے کو حکمِ روانی بھی بھیج دو
جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

شاعر کی بیوی۔ عمر بھر کا ساتھ۔ خاندانی عورت۔ شعر سنتے ہی ہنس پڑیں اور رام ہو گئیں۔

(۴)

ابھی پچھلے دنوں ایرانی سفارت خانے سے دعوت نامہ آیا۔ جوش صاحب، پیر حسام الدین راشدی اور دوسرے لوگوں کے ساتھ گئے اور میں، مولانا اعجاز الحق قدوسی مبین الحق صدیقی کے ساتھ۔ وہ سفارت خانے میں ہم سے پہلے پہنچے اور ہمارے پہنچنے سے پہلے واپس آ گئے۔ ہم جب پہنچے تو محفل برخاست ہو چکی تھی۔ اطلاع ملی کہ وہ مجھے اور مبین الحق صدیقی کو گھر بلا گئے ہیں۔

رات کے دس بجے تھے۔ میں اور مبین الحق صدیقی اُن کے گھر پہنچے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر بولے "اچھا ہوا آپ لوگ آ گئے۔ مجھے سخت وحشت ہو رہی تھی۔"

یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب جوش صاحب نے ریڈیو کے مشاعرے سے "بول اک تارے جھن جھن جھن" نظم پڑھی تھی اور اس بات پر کہ انھیں مشاعرے میں سب کے بعد پڑھوایا گیا تھا چند حاسدوں نے ان کے خلاف اخبار "ڈان" میں خط شائع کرنے شروع کر دیئے تھے۔

میں نے کہا " جوشؔ صاحب وہ نظم تو بہت اچھی تھی مجھے تو یوں محسوس ہوا کہ اس نظم میں تصوّرِ انسان الوہیت کے درجے پر پہنچ گیا ہے جہاں رنگ نسل اور قوم و ملت کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔"

بولے " میں نے اسی موضوع پر لکھی ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ بعد الطبعیاتی موضوع سہل ہو کر ہر خاص و عام کے ذہن میں اتر جائے اور ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو۔ اس کے قافیے، اس کے الفاظ اور ساتھ ساتھ بحر جو میں نے استعمال کی ہے وہ ساری نظم کو موسیقی کا اثر عطا کر رہی ہے۔

میں نے کہا " جوشؔ صاحب! یہ نظم ذرا پھر سُن لی جائے۔"

آواز دی " ذرا بیگ بھیج دو۔"

اس کے جواب میں اندر سے آواز آئی " ابھی تو چیخ کر آئے ہو" اب پھر شروع کر دیا۔"

یہ اُن کی بیگم تھیں۔

راز دارانہ انداز میں آہستہ سے بولے " مادرِ مہربان ہیں۔ انھیں ہر دم ہماری صحت کا خیال رہتا ہے۔"

(۵)

" ترقی اردو بورڈ " کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ بورڈ کا دفتر ابھی قائم ہی ہوا تھا۔ میٹنگ میں جوشؔ صاحب سے ان کی دفتری ضروریات دریافت کی گئیں۔ انھوں نے بتایا کہ " ایک چپراسی، ایک بابو اور ایک مہتر"

پیر حسام الدین راشدی بولے " جوشؔ صاحب! مہتر کیا کریں گے مہترانی لے لیجیے۔"

جوشؔ صاحب نے فوراً جواب دیا " ہاں مہترانی بجوانی۔"

(۶)

تین چار سال پہلے کی بات ہے۔ مولانا عبدالحامد بدایونیؒ نے جوشؔ صاحب کو مدعو کیا۔ اُس زمانے میں جوشؔ صاحب کے ایک مرثیے کی بڑی دھوم تھی۔ یہ محفل صرف اسی لیے منعقد کی گئی تھی کہ جوشؔ صاحب مرثیہ سنائیں گے۔

مَیں بھی مدعو تھا۔

مرثیہ شروع ہوا اور ختم ہو گیا۔ چائے چلی اور ختم ہو گئی۔ لیکن پان کا دُور دور پتہ نہیں۔ حاضرین بے چین تھے اور میزبان بالکل غافل۔ طرفہ تماشہ یہ کہ میزبان خود مسلسل پان کھائے جا رہے تھے۔ میں نے مولانا اعجاز الحق قدوسی۔ سے کہا کہ جوشؔ صاحب کے اس مرثیے کے ایک مصرعے کو اگر یوں کر دیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ؎

پان کھانا اور ہے اس کا کھلانا اور ہے!

جوشؔ صاحب برابر میں بیٹھے تھے۔ مصرع سُن لیا۔ فوراً بولے۔

مالِ مُلّا کس نہ دید

(۷)

جوشؔ صاحب بہت بھلکّڑ ہیں۔ ذرا سی دیر میں بات بھول جاتے ہیں اور تو اور اپنے اشعار تک بھول جاتے ہیں۔ اکثر میں نے اُن کا شعر پڑھا، کہنے لگے:

"جمیل صاحب! یاد نہیں ہے کہ میرا ہے۔ ویسے معلوم میرا ہی ہوتا ہے۔"

ایک دفعہ ایسا ہوا کہ کوئی سفارش میں پکڑ لایا۔ جب میرے پاس آئے تو کہنے لگے کہ "بھئی اتنا تو یاد ہے کہ سفارش کرنی ہے اور ان صاحب کی کرنی ہے لیکن یہ بھول گیا ہوں کہ کیا سفارش کرنی ہے۔" ویسے یہ جملہ کہتے وقت وہ مجسم سفارش بنے ہوئے تھے۔

مرزا عالم گیر قدر بھی اُن کے ساتھ تھے۔ کہنے لگے۔ "میاں! ایسا پہلی بار ہی نہیں ہوا۔ ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے کہ ایک صاحب پکڑ کر لے گئے۔ وہاں جو کچھ کہا وہ سب

کچھ ان صاحب کے خلاف تھا۔ جن کی سفارش مقصود تھی: "شاعر آدمی ہیں، ہر ردیف، ہر انداز اور ہر ادا سے شاعری ٹپکتی ہے۔"

جو جوش صاحب سے ملتا ہے ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ میرے گھر آئے۔ لوگوں نے فرمائشیں شروع کیں۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ "چناجور گرم" سنائیے۔

کہنے لگے: "کاپی نہیں لایا۔"

اصرار کیا گیا کہ "کچھ اشعار تو زبانی یاد ہوں گے؟"

کہا: "کہاں یاد ہیں۔ یادداشت اتنی خراب ہو گئی ہے کہ: ؎

ہم نے اپنی سی کہیں بھول نہ دیکھی نہ سُنی
ہاتھ اٹھایا تھا دعا کو کہ دعا بھول گئے"

(۸)

حکومت کی طرف سے، ابھی دو سال ہوئے، یہ اعلان ہوا کہ حکومت معذور ادیبوں کی امداد کرے گی۔ یہ خبر سُن کر جوش صاحب بولے:

"جمیل صاحب! ادب تو خود سب سے بڑی معذوری ہے۔"

(۹)

پیر حسام الدین راشدی جوش صاحب کے بہت دوست اور بڑے قدر دان ہیں۔

ایک دفعہ جوش صاحب نے پیر صاحب سے کسی کام کے لیے کہا۔

پیر صاحب مصروف آدمی۔ بھول گئے۔

یاددہانی کے طور پر جوش صاحب نے کاغذ کے ایک پرزے پر صرف یہ لکھ کر بھیجا ؎

حسام الدین بھی شمشیر نکلے
مرے حق میں بُتِ بے پیر نکلے

جواب میں پیر صاحب خود پہنچ گئے۔

(۱۰)

جس زمانے میں "پاکستان رائٹرز گلڈ" وجود میں آیا ہی تھا کہ میرے سپرد یہ کام کیا گیا کہ میں جوشؔ صاحب کو گلڈ کا ممبر بنانے کے لیے اُن کے پاس جاؤں۔ "گلڈ" کے کارکنان کا یہ خیال تھا کہ جوشؔ صاحب میرے کہنے سے ممبر ضرور بن جائیں گے۔

میں گیا۔ وہ گھر پر موجود نہیں تھے۔ میں ایک پرچہ لکھ کر فارم اور خط چھوڑ آیا۔ یہ دونوں چیزیں انگریزی میں تھیں، جب وہ گھر واپس آئے تو یہ چیزیں نظر سے گذریں۔ اردو کے ادیبوں کی انگریزی زبان میں کارگذاری دیکھ کر چراغ پا ہو گئے۔ فارم پر یہ لکھ کر واپس کر دیا۔

"انگریزی میں انجمن کا نام چھاپ کر بڑا ہی فخر محسوس فرمایا گیا ہوگا۔

زندہ باد انجمن مصنفینِ پاکستان!

پائندہ باد اردو زبان!!

رخشندہ باد جماعتِ دارایانِ لسان!!!"

اور اس کے نیچے یہ لکھا تھا:

'حضرۃ جمیل'

ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں
کیوں ہمیں بناتے ہیں آپ ہم عناں اپنا

جوشؔ مرحوم

یہ سارا غصّہ اس بات پر تھا کہ یہ سب کچھ انگریزی میں کیوں ہے۔ اس بات کا یہ نتیجہ ہوا کہ جوشؔ صاحب آج تک "پاکستان رائٹرز گلڈ" کے رکن نہ بننے تھے نہ بنے۔

لوگ ہزار طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر بات صرف یہ ہے۔

(۱۱)

جوشؔ صاحب کو پابندئ وقت کا بہت خیال رہتا ہے۔ ایک دفعہ میرا مبین الحق

صدیقی، مولانا قدوسی، جوشؔ صاحب اور بعض دوسرے احباب کا حیدر آباد جانے کا پروگرام تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ صبح آٹھ بجے چلیں گے تاکہ ٹھنڈے وقت حیدر آباد پہونچ جائیں لیکن سب کو جمع ہوتے ہوتے نو بج گئے۔ اور جب جوشؔ صاحب کے ہاں پہنچے تو دس بجے تھے۔ دو گھنٹے کا انتظار جوشؔ صاحب کے بس کا کہاں تھا۔ جیسے ہی ہم پہنچے تو بچے نے ایک پرچہ لاکر دیا جس پر لکھا تھا:

"میں نے آج لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کیا، اور اس قدر عجلت کے ساتھ طیاری کی کہ ٹھیک سوا آٹھ بجے ملبوس ہوکر بیٹھ گیا تاکہ آپ کو ایک دقیقہ بھی انتظار کی زحمت نہ گوارا کرنا پڑے۔

لیکن آپ نہ آنا تھے نہ آئے اور جب شدید انتظار کرتے کرتے میں خود اپنی نگاہوں میں احمق معلوم ہونے لگا تو میں نے "الّا اللہ" کا نعرہ لگایا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ تاکہ آپ کو نصیحت حاصل ہو، اور آپ آئندہ کسی اللہ کے بندے کو کربِ انتظار میں مبتلا فرما کر اسے اپنے کو احمق سمجھنے پر مجبور نہ کریں۔"

مرحوم جوشؔ ۹ ۱/۴

یہ خط پڑھ کر اس تاخیر سے مجھے بہت شرمندگی ہوئی۔ اور میں سوچنے لگا کہ واقعی بہت بُرا ہوا۔ سارا پروگرام کرکرا ہو گیا۔ میں نے قدوسی صاحب سے کہا کہ "اب کیا ہو۔ جوشؔ صاحب کو کہاں تلاش کیا جائے؟ ان کے بغیر میں تو نہیں جاؤں گا۔"

اسی ادھیڑ بُن میں آدھ گھنٹہ گذر گیا۔

ابھی ہم لوگ صلاح و مشورہ کر ہی رہے تھے کہ موصوف گھر کے اندر

سے برآمد ہوئے اور کہنے لگے :

"کہیئے کیسی زحمت ہوئی ؟"

اور یہ کہہ کر ہنستے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئے۔

میں نے کہا ؂

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں "آب" جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

(۱۹۶۶ء)

فیض احمد فیضؔ

میں جذباتِ غم سے اتنا بوجھل ہوں کہ میرے لیے اس وقت شاید یہ ممکن نہیں ہے کہ میں فیضؔ صاحب کے بارے میں کچھ زیادہ عرض کرسکوں۔ لاہور میں ۲۰ر نومبر کو منگل کے دن دوپہر کے وقت فیضؔ صاحب وفات پاگئے۔ یہ ایک ایسا سانحہ ہے جس کا غم ہماری نسل کو ہمیشہ اسی طرح یاد بن کر ستاتا رہے گا جس طرح خود فیضؔ صاحب کے اہلِ خاندان کو۔ میرؔ نے شاید یہ شعر اسی موقع کے لیے کہا تھا: ؎

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشمِ گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

جانے والے چلے جاتے ہیں اور پھر لوٹ کر نہیں آتے لیکن ان کی یادیں اور ان کے کام ہمیشہ زندہ و باقی رہتے ہیں۔ فیضؔ صاحب ایک بڑے شاعر اور ایک بڑے انسان تھے جو برسوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں۔ جب میں انٹر کا طالب علم تھا تو اس وقت بھی فیضؔ صاحب میرے محبوب شاعر تھے اور آج، جب طالب علمی کے زمانے کو کئی جُگ بیت گئے، فیضؔ صاحب میرے محبوب شاعر ہیں۔ اتنے عرصے کسی شاعر کا محبوب رہنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ شاعر تو عمر کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ آج جو محبوب ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ کل بھی محبوب رہے لیکن بڑے شاعر جب ایک دفعہ محبوب ہوجاتے ہیں تو وہ ہمیشہ محبوب رہتے ہیں۔ فیضؔ صاحب ایک ایسے ہی بڑے شاعر تھے۔

فیضؔ صاحب کا اور میرا کم و بیش چالیس سال کا تعلق تھا۔ میں نے لکھنا شروع کیا تو اپنا پہلا مضمون فیضؔ احمد فیضؔ کی شاعری پر لکھا جو ۱۹۴۸ء میں صمد شاہین و ممتاز شیریں کے نیا دور

میں شائع ہوا۔ اس وقت تک فیض صاحب کا ایک ہی مجموعہ "نقشِ فریادی" شائع ہوا تھا۔ ان کا باقی کلام سب میرے زمانۂ شعور میں شائع ہوا اور جب بھی شائع ہوا میں نے شوق سے پڑھا اور لطف اندوز ہوا۔ پچھلے دنوں ان کا تازہ کلام ایک صاحب نے لاہور سے بھیجا۔ پڑھا تو محسوس ہوا کہ فیض صاحب بحیثیت شاعر آج بھی تازہ دم ہیں۔ ان کی تخلیقی قوت اب بھی شعلوں کا صور پھونک رہی ہے۔ ابھی چند ماہ قبل فیض صاحب میرے گھر تشریف لائے تھے۔ محفل سماع تھی۔ رات گئے تک بیٹھے رہے اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ اسی دھیمے انداز میں باتیں کرتے رہے۔ ڈاکٹروں کے مشورے پر سگریٹ چھوڑ چکے تھے۔ لیکن بظاہر صحت اچھی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی وہ اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔

فیض صاحب جیسے شریف النفس انسان میں نے کم دیکھے ہیں۔ نہ شکوہ نہ شکایت، نہ دشمنی، نہ انتقام، سب کو گلے لگانے کے جذبے سے سرشار اور اپنی ذات میں گم۔ اگر انسان دنیا کو لاانتہا کائنات کے تعلق سے دیکھے تو وہ وسیع المشرب ہو جائے۔ تنگ نظری سے دور اور تنگ دلی سے پاک۔ فیض صاحب ایک ایسے ہی وسیع القلب عظیم انسان تھے۔ ایسے انسان جن سے انسانیت کا بھرم قائم ہوتا ہے۔

اتنے مشہور کہ کم لوگوں کو زندگی میں اتنی شہرت میسر آتی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ پچھلے دنوں چینی ادیبوں کا وفد کراچی آیا تو بطور تعارف انھیں بتایا گیا کہ اس جلسے میں ملک کے نامور ادیب و شاعر موجود ہیں۔ یہ سن کر وفد کے سربراہ نے مجھ سے پوچھا کہ کیا اس میں فیض بھی موجود ہیں۔ وہ صرف فیض صاحب ہی کو جانتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ اردو زبان کے عظیم شاعر ہیں۔ عظیم ہیں وہ لوگ جو عظمتوں کے اس رتبے کو پہنچتے ہیں۔ فیض صاحب اردو کے وہ واحد شاعر تھے جو صحیح معنی میں بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ جن سے پاکستان کی قومی زبان کا رتبہ بڑھا اور جن سے عظمتوں کے نئے پیمانے بنے۔ آج فیض احمد فیض ہم میں نہیں ہیں اور آج ان کے بغیر ہم اس لیے تنہا رہ گئے ہیں کہ اب ان کی جگہ لینے والا بھی کوئی دوسرا نہیں ہے۔ انھوں نے اردو شاعری کو ایک ایسا لہجہ ایک ایسا آہنگ دیا جس میں اردو شاعری کی روایت بھی بول رہی تھی اور عہد حاضر کی روح

بھی۔ یہی لہجہ ان کی پہچان تھا جس میں عوام کا جذبۂ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی۔ جس میں دکھی انسانیت کا نوحہ بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا نغمہ بھی۔ فیضؔ احمد فیض اسی نئے شعور کے نمائندہ شاعر تھے۔ وہ شعور جس سے زندہ قومیں اپنی فکر کے تار و پود بُنتی ہیں۔ فیضؔ صاحب اسی لیے آج بھی عظیم ہیں اور کل بھی عظیم رہیں گے۔ انھوں نے اردو شاعری پر لازوال نقوش ثبت کیے ہیں۔ ان کا دل عشق کی آگ سے روشن تھا۔ اور یہی روشنی ان کی شاعری کی روشنی تھی۔ ان کی وفات سے شاعری کی لَو بجھ گئی ہے لیکن شعور کی وہ روشنی جو انھوں نے عوام اور معاشرے کے دلوں میں پیدا کی ہے وہ ہمیشہ ساری دکھی اور غریب انسانیت کو منزل کا راستہ دکھاتی رہے گی۔ فیضؔ صاحب کا پیغام آفاقی تھا۔ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ آج آفاقی شاعری کا یہ دیوتا ہم سے مُنھ موڑ کر چلا گیا ہے لیکن اس دیوتا کا پیغام آنے والی نسلوں کو اپنی شاعری کی تخلیقی عظمتوں سے ہمیشہ گرویدہ بنائے رکھے گا۔ فیضؔ کی وفات سے اردو شاعری کا وہ عظیم دور، جو اقبالؔ سے شروع ہوا تھا اب جوشؔ ملیح آبادی کے بعد فیضؔ احمد فیضؔ پر ختم ہو گیا۔ اب ہم سدا اس باب کو پڑھتے رہیں گے اور فیضؔ کی ذہنی، فکری، تخلیقی اور سماجی صلاحیتوں کی تقریظ لکھتے رہیں گے اور انھیں برسوں ــــ برسوں یاد کرتے رہیں گے۔ آج بھی اور آنے والے زمانے میں بھی :

یوں میرؔ تو غم اپنا برسوں کہا کریں گے
اب رات کم ہے سوئے، بس ہو چکی کہانی

فیضؔ صاحب کی زندگی کی کہانی بس ضرور ہو چکی ہے لیکن آنے والے دور کا داستان گو اس کہانی کو ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔

(۲۳ر نومبر ۱۹۸۴ء)

فیض احمد فیضؔ

۲۰؍ نومبر ۱۹۸۴ء کو، منگل کے دن، دوپہر کے وقت، لاہور میں فیض احمد فیضؔ وفات پا گئے۔ یہ خبر شعلے کی طرح اٹھی اور سارے پاکستان میں اور پاکستان سے باہر ساری دُنیا میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ انتقال کے وقت فیضؔ صاحب اُردو زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے اور اب ان کے بعد ان کے قد اور ان کی شہرت کا کوئی دوسرا ادیب و شاعر دور دور نظر نہیں آتا۔ فیضؔ کی وفات اسی لیے ایک سانحہ بھی ہے اور المیہ بھی۔

فیض احمد فیضؔ نہ صرف ایک بڑے شاعر اور دانشور تھے بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے۔ دھیمے مزاج کے فراخ دل انسان۔ بہت سے شاعر عمر کے آخری حصے میں شہرت کی معراج کو پہنچتے ہیں۔ فیضؔ ابتدائی دور سے مشہور ہوئے اور ان کی شہرت، طلوعِ آفتاب کی طرح مسلسل بڑھتی رہی اور جب وفات پائی تو ان کی شہرت نصف النہار پر تھی اور وہ لاکھوں، کروڑوں انسانوں کے محبوب شاعر تھے۔ وہ شاعر جوان کے دلوں کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کے بے نام جذبوں اور گونگے احساسات کو زبان دے کر نیا شعور اور نئی آگہی دیتا ہے۔ فیضؔ کی شاعری میں عوام کا جذبۂ کرب بھی شامل تھا اور ان کی قوت بھی۔ اس میں دکھی انسانیت کا نوحہ بھی موجود تھا اور آنے والے دور کا نغمہ بھی۔

بڑے شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اپنے دور میں بڑے ہوتے ہیں لیکن جب وہ دور ختم ہوتا ہے اور رجحانات بدلتے ہیں تو ان کی شہرت کا سورج بھی دونوں وقت ملتے ہی غروب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دور کے ساتھ جیتے ہیں اور اپنے دور کے ساتھ

ہی مر جاتے ہیں۔ دوسری قسم کے بڑے شاعر وہ ہیں جو اپنے دور کی ترجمانی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے دور کو آنے والے دور سے ملا بھی دیتے ہیں۔ فیض احمد فیضؔ دوسری قسم کے بڑے شاعر تھے۔ وہ آج کے بھی شاعر تھے اور کل کے بھی۔ یہی ان کی عظمت ہے۔

فیضؔ کی شاعری کا اپنا مخصوص آہنگ اور اپنا مخصوص لب ولہجہ تھا۔ اس لہجے میں اردو شاعری کی روایت کا حسین ماضی بھی شامل تھا اور زمانۂ حال کا شعور بھی۔ فیضؔ نے روایتِ ماضی کو حال میں جذب کر کے اسے مستقبل سے ملا دیا۔ اسی لیے فیضؔ کی شاعری اپنے زمانے کی دھڑکنوں کو آنے والے زمانوں کی دھڑکنوں سے ملا کر اس نئی شاعری کی تخلیق کرتی ہے جو ان کی پہچان ہے۔ زمانوں کا یہ خوب صورت امتزاج کبھی کبھار وجود میں آتا ہے۔ فیضؔ اسی نئے امتزاج کے نمائندہ تھے۔

فیضؔ جبر و استحصال کے دشمن تھے۔ عدل و انصاف کے داعی تھے۔ عوام کو انسانی قوتوں کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔ وہ عوام جن سے قوموں کی کھیتیاں سرسبز و شاداب ہو جاتی ہیں، صنعت و حرفت پھلنے پھولنے لگتی ہیں اور زندگی کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ ان کی شاعری عوام کی اسی قوت کی ترجمان ہے۔ وہ قوت جو مستقبل کی حقیقی قوت ہے۔ جو قوموں کو بلند و بالا اور انھیں سرخرو کرتی ہے۔ فیضؔ کی وفات سے شاعری کی لَو بجھ گئی ہے لیکن شعور کی وہ روشنی جو انھوں نے عوام اور معاشرے کے دلوں میں پیدا کی ہے، ساری دکھی انسانیت کو ہمیشہ منزل کا راستہ دکھاتی رہے گی۔

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

فیضؔ صاحب اسی لیے ساری عمر مجھے عزیز و محبوب رہے۔ چند ماہ پہلے میرے گھر آئے اور رات گئے تک بیٹھے رہے۔ اپنا نیا کلام سنایا اور پھر فرمائش پر پرانا کلام بھی سنایا۔ ان کی پرانی شاعری سے تازگی کی وہی خوشبو آرہی تھی جو نئے کلام سے آرہی تھی۔ ان کی تخلیقی توانائی آج بھی اسی طرح تازہ و زندہ تھی۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ فیضؔ صاحب کے پڑھنے کا انداز اچھا نہیں تھا لیکن مجھے ان کا کلام، خود ان کی زبان سے سُن کر، ہمیشہ اچھا لگا۔ اس موقع پر شعر کی معنویت

اور لہجے کے پرت اس طرح کھلتے محسوس ہوتے تھے جیسے نسیم سحری سے بند کلیاں غنچے اور غنچے پھول بن جاتے ہیں۔

فیض کی وفات کے ساتھ اردو شاعری کا ایک عظیم دور ختم ہوگیا۔ یہ ایک ایسا عظیم دور تھا جس پر ہر زبان اور اس کی تاریخ فخر کرسکتی ہے۔ یہ افتخار بیسویں صدی کی بہت کم زبانوں کو حاصل ہے۔ اس دور نے اُردو زبان کو دُنیا کی جدید زبانوں میں بلند درجہ دیا اور اس عظیم دور کی تاریخ میں فیض کا کلام ممتاز و نمایاں ہے۔

فیض کی شاعری نئی نسل کے شاعروں کو ایک سبق بھی دیتی ہے اور وہ سبق یہ ہے کہ وہ شاعر جو اپنی روایت سے کٹ کر دوسری زبانوں کی شاعری کی پیروی کرتے ہیں اپنی تاریخ کے تخلیقی سوتوں سے کٹ کر بے جان اور بے اثر ہوجاتے ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کا رشتہ اُس زبان کی تہذیبی روح اور تخلیقی روایت سے ہمیشہ گہرا اور استوار رہے جس زبان میں وہ شاعری کررہے ہیں اور اس زبان کی روایت کی تخلیقی قوت ان کی شاعری کا اصل جوہر ہو۔ فیض نے اپنی شاعری میں یہی کام کیا اور روحِ عصر کو اردو شاعری کی تہذیبی روح اور روایتی اصناف میں سمو دیا۔ اسی لیے وہ آج عظیم شاعروں کی صف میں کھڑے ہیں۔

اب فیض ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کی کہانی بس ہوچکی ہے لیکن آنے والے دور کا داستان گو اس کہانی کو نئے نئے انداز سے ہمیشہ بیان کرتا رہے گا۔ مصحفی کا ایک شعر ہے:

جن کی باتوں سے کبھی ہوتی تھی کچھ تسکینِ دل
رہ گئے تنہا ہم اور وہ آشنا جاتے رہے

(۱۱ر دسمبر ۱۹۸۴ء)

فراق گورکھپوری

شاعروں اور ادیبوں کی وہ نسل جس نے میری ذہنی پرورش کی تھی تیزی سے رخصت ہو رہی ہے۔ ۲۲ر فروری ۱۹۸۲ء کو حضرت جوش ملیح آبادی ہم سے رخصت ہو گئے۔ ابھی یہ زخم تازہ تھا کہ ۳ر مارچ ۱۹۸۲ء کو حضرت فراق کی سناؤنی آ گئی۔ ایک قافلہ ہے جو چلا جاتا ہے۔ ایسا قافلہ جس کا ہر فرد میر کارواں ہے:

قافلہ قافلہ جاتے ہیں چلے کیا کیا لوگ
میرؔ غفلت زدہ حیران سے کیا بیٹھے ہو

جب جوش کا انتقال ہوا تو فراق صاحب اسپتال میں تھے۔ خبر سُنی تو آواز رندھ گئی اور کہا۔ "آج جوش کے مرنے کے بعد میں ماتم کرنے کو رہ گیا ہوں۔ یہ خبر میری زندگی کا سب سے بڑا صدمہ ہے"۔ چند ہفتے قبل جب فراق صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آج کے دور میں سب سے بڑا شاعر کون ہے تو انھوں نے جواب دیا۔۔۔ "جوش اور صرف جوش" اس جُملے سے جہاں جوش کی شاعرانہ عظمت پر روشنی پڑتی ہے وہاں اُس شریفانہ فراخ دلی کا بھی پتا چلتا ہے جو اس نسل کے مزاج کا ایک حصہ تھی۔ ایک بار جوش ملیح آبادی اپنے ہم عصروں کی طباعی و ذہانت کا ذکر کر رہے تھے۔ جب فراق صاحب کا ذکر آیا تو جوش نے کہا کہ "فراق نہ تلوار ہے نہ خنجر نہ چھری۔ یہ شخص فقط دھار ہی دھار ہے"۔ غور کیجیے کہ کیا ہماری نسل کے شعرا و ادبا بھی ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہیں؟ یہ لوگ رشک کے پرستار تھے اور ہم حسد کے مریض ہیں۔ جیسے جوش اس دور میں نظم کے سب سے بڑے شاعر تھے اسی طرح فراق صاحب اس دور میں غزل کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ جوش کی طرح فراق نے بھی اپنی زندگی میں ایک کلاسیک

کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ گزشتہ چالیس برس میں ایسا کون سا قابلِ ذکر شاعر ہے جس نے فراق کا اثر قبول نہیں کیا۔ فراق کی ذہانت و طباعی نے، ان کے انداز نظر نے، ان کی صاف ستھری فکر نے، ان کے زبان و بیان نے اردو شاعری کے رنگ و آہنگ کو ایسا نکھار دیا کہ جدید دور کی روح فراق کی غزل میں دھڑکنے لگی۔ فراق نے اردو غزل کی روایت کو ایک نیا رُخ دیا اور اسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ اگر اس صدی کی اردو شاعری کا احاطہ کیا جائے تو اس میں اکبر الہ آبادی اور اقبال کے علاوہ جن شاعروں کی آوازیں نمایاں ہیں ان میں بھی جوش اور فراق کی آوازیں سب سے الگ سب سے نمایاں اور منفرد ہیں۔ فراق نے نثر اور نظم دونوں سطحوں پر اہم کام انجام دیئے۔ ایک طرف انھوں نے اردو شاعری کی روایت کو نیا رُخ دیا اور دوسری طرف تاثراتی تنقید کے بہترین نمونوں سے اردو تنقید کو ایک نیا رُخ دیا۔ فراق ایک آزاد خیال مفکر تھے۔ انسان ان کی فکر کا مرکز و محور تھا اور احساسِ جمال کا تجربہ ان کی شاعری کا شعور تھا۔ فراق صاحب نے کہیں کہا تھا کہ "شاعری محض شاعری کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے لیے وجدان کی ایک ریاضت ہے۔ بلند شاعری ایک ایسا جمالیاتی شعور پیدا کرتی ہے جو قومی زندگی کو بیک وقت گہرا اور اونچا بنا دیتی ہے۔ اور توانا و طاقتور بھی اور اسی شعور سے بار وحانی عالم سے عمل کے سرچشمے پھوٹتے ہیں۔ بڑی شاعری میں گہری سے گہری بات معصومیت کا روپ دھار لیتی ہے"۔ فراق صاحب کی شاعری نے اُردو شاعری کو یہی رُخ دیا جو نیا بھی تھا اور خوب صورت بھی۔

کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے\
بلائیں یہ بھی محبّت کے سر گئی ہوں گی

یہ عظیم شعر جس عظیم شاعر نے کہا تھا آج وہ دنیا سے اٹھ گیا ہے اور ہم لوگ اسی عظیم ہستی کو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فراق اُردو ادب کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق ایک سچے، بے باک اور شاعری کی نئی روایت کا ایک عظیم نام ہے۔ فراق اُردو تنقید کا بھی ایک عظیم نام ہے۔ اس دور میں جب ہندوستان میں اردو کس مپرسی کے عالم میں سسک رہی تھی فراق وہ عظیم نام ہے جس نے اس زبان کے حُسن و جمال کے گیت گائے

اور کہا :

"کسی زبان کو مٹانا قتل اور خون سے بھی زیادہ سنگین جُرم ہے۔ اُردو کا مٹانا تو قتلِ عام سے بھی میں زیادہ سنگین جرم سمجھتا ہوں۔ یہ تو ماضی حال اور آیندہ کی نسلوں کے قتل کے برابر جُرم ہے۔ جن کٹر ہندی پرستوں نے حکومت اور تعلیمی اور دیگر افسروں کی مدد سے اردو کو قریب قریب مٹا ڈالا ہے ان کی اس کارروائی کے متعلق میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کی یہ حرکت اس سے کم مکروہ حرکت نہیں ہے جو ہٹلر نے یہودیوں کی پوری قوم کو ذبح کر کے کی تھی۔ آج مجھے ہر ہندی تحریر اردو کے خون سے رنگی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہماری حکومت نے بھی مجرمانہ تساہلی اور چشم پوشی سے اس معاملہ میں کام لیا ہے اور حکومت کے کئی با اقتدار وزیروں اور عہدہ داروں نے اردو کے قاتلوں کو بڑھاوا دیا ہے۔ میں پھر بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اردو مٹائی نہیں جا سکے گی۔ اس وقت مٹائی تو اردو جا رہی ہے لیکن مٹ رہی ہے ہندی اور اس صدی کے ختم ہوتے ہوتے وہ ہندی سارے ہندوستان سے مٹ جائے گی اور کم سے کم اُتر پردیش سے مٹ جائے گی جس کی بنیاد اب سے سو برس پہلے رکھی گئی تھی۔ کھڑی بولی کو بد صورت بنا کر اردو ہندی میں نہایت پھوہڑ اور بد صورت اور قابلِ نفرت تصنیف بازی متھیلی شرن گپت، پنت، نرالا، پرشاد اور مہادیوی نے کی۔ یہ جناتی ہندی نہ عوام کے گلے سے نیچے اُتر سکتی ہے اور نہ خواص کے۔ یہ صرف کتابوں میں دفن رہے گی۔ اسے تو ہم چلتا پھرتا مردہ بھی نہیں کہہ سکتے بلکہ ایک دفن شدہ سڑی ہوئی لاش کہہ سکتے ہیں۔ اردو کے دشمن اچھی طرح اپنے دل میں جانتے ہیں کہ اردو ہندوستان کی سب سے بڑی زبان ہے اور سب سے زیادہ خوب صورت اور لطیف بھی۔ اردو دشمنوں کو حقیقتاً اپنے گنوارپن پر غصہ آتا ہے۔ اردو کو مٹا کے کثافت لطافت کو کبھی معاف نہیں کرتی۔"

یہ فراق کے الفاظ تھے۔ اس دور میں جب چاروں طرف سے اردو کے خلاف آوازیں اُٹھ رہی تھیں، فراق صاحب نے اردو والوں میں ایک نئی روح پھونکی اور ان کی حق پرست آواز، دوسری آوازوں کے ساتھ مل کر اردو زبان کو زندہ و سلامت، بچا کر ۱۹۸۲ء تک لے آئی، اور آج اردو دوبارہ اپنی حیاتِ نو کے لیے پورے اعتماد کے ساتھ مستقبل پر نظر جمائے ہوئے ہے۔

فراق اس دور کی روح کی آواز تھے۔ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ وہ مجسم ذہانت و ظرافت تھے اور اپنی خوش دلانہ میٹھی باتوں سے وہ سُننے والوں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑتے تھے کہ خود فراق صاحب ان کی ذات و شخصیت کا حصّہ بن جاتے تھے۔ جن لوگوں نے فراق صاحب کو دیکھا ہے، ان کی گفتگو سے لُطف اندوز ہوئے ہیں، ان کی صحبتوں میں بیٹھے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ فراق صاحب سے ملنا ایک یادگار واقعہ ہوتا تھا۔

فراق صاحب نے کہا تھا:

آنے والی نسلیں تم پر رشک کریں گی ہم عصرو
جب یہ دھیان آئے گا اُن کو، تم نے فراق کو دیکھا تھا

اور خواتین و حضرات! میں نے بھی فراق کو دیکھا تھا۔ اس زندہ فراق کو جو آج ہم میں نہیں ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

(۴ر مارچ ۱۹۸۲ء)

غلام عبّاس

۱۹۸۲ء کا یہ سال ادیبوں اور دانشوروں پر سخت اور بھاری گزرا۔ جوشؔ ملیح آبادی گئے اور اپنے ساتھ اردو شاعری کی ایک روایت لے گئے۔ فراقؔ گورکھپوری گئے اور اپنے ساتھ اُردو غزل اور دانشورانہ تنقید کی ایک روایت لے گئے۔ پیر حسام الدین راشدی گئے اور اپنے ساتھ تاریخ سندھ کی روایت لے گئے۔ خدیجہ مستور گئیں اور اپنے ساتھ اردو افسانے اور ناول کی ایک روایت لے گئیں اور دوسری نومبر کی درمیانی شب کو اردو کے منفرد افسانہ نگار غلام عباس بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے اور اپنے ساتھ اردو افسانے کی کلاسیکل روایت لے گئے۔ ان کے چلے جانے کے بظاہر کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ اچھے اور صحت مند تھے۔ یکم نومبر کو دن میں گیارہ بجے کے قریب مجھ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کہنے لگے جمیل صاحب مجھے دو دن اور دے دیجیے "نوجوان افسانہ نگار کے نام خط" کے چند صفحے رہ گئے ہیں۔ بس جمعرات کو لے لیجیے۔ رات کو ایک بجے کمانڈر انور کا فون آیا۔ بتایا کہ عباس صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ ارے یہ کیسے ہو سکتا ہے مگر یہ تو ہو چکا تھا اور جب میں جمعرات کو ان کے سوم میں شریک ہوا تو مجھے یاد آیا کہ یہی وہ دن اور وقت تھا جب مجھے عباس صاحب سے ملنا تھا۔ مگر وہ تو جا چکے تھے۔ وہاں جا چکے تھے جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا:

رہنے کی کوئی جاگہ شاید نہ تھی انھوں کی
جو یاں سے اُٹھ گئے ہیں وے پھر کبھو نہ آئے — میرؔ

غلام عباس صاحب ایک شریف النفس، کم گو اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ لکھنا پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اور خاموشی سے آہستہ آہستہ کام میں لگے رہنا ان کی زندگی کا ہنر تھا۔ نہ

گروہ بندی سے دل چسپی، نہ تعلقاتِ عامہ سے سروکار۔ بس اپنے کام سے کام۔ یہی ان کی زندگی تھی اور اسی بے نیازی کی وجہ سے عباس صاحب نے اردو زبان کو ایسی عظیم کہانیاں دیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ آنندی، کتبہ، جواری، اوورکوٹ، سایہ، کن رس، حمام میں، اُس کی بیوی، بردہ فروش وغیرہ وہ کہانیاں ہیں جو گزشتہ کل کی طرح آج بھی اور آج کی طرح آنے والے کل میں بھی دل چسپی کے ساتھ پڑھی جاتی رہیں گی۔ سچائی امر ہے اور سچائی کا اظہار خود تحریر کو بھی امر بنا دیتا ہے۔ غلام عباس صاحب نے زندگی کے سمندر سے سچائیوں کے ایسے ہی موتی چُن کر انھیں خوب صورت ہار کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ وہ بھی اسی لیے امر ہیں۔

غلام عباس صاحب سے میری ملاقات کی عمر تقریباً تیس سال ہے۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے اور یہ کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ لندن سے نئے نئے واپس آئے تھے اور پہلی ملاقات ہی میں ہم ایک دوسرے کے دوست بن گئے تھے۔ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان تعلقات و دوستی میں کوئی نشیب آیا اور نہ کوئی ایسی بات ہوئی کہ دلوں کی کلی مرجھا جائے۔ بہت سے واقعات ہیں جو میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔ یادوں کی ایک برات ہے جو میرے ذہن کے دریچوں پر دستک دے رہی ہے لیکن ان کے بیان کا نہ یہ موقع ہے اور نہ محل۔ اس وقت تو ہم غلام عباس صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کرنے جمع ہوئے ہیں۔ ہمارے دل ان کی جدائی سے بھاری ہیں۔ ہماری آنکھیں ان کی وفات سے پُرنم ہیں اور ہمارا وجود ان کی موت پر نوحہ کناں ہے۔ میں تو اپنے بچپن سے عباس صاحب کو جانتا تھا جب وہ بچوں کے رسالے پھول لاہور کے ایڈیٹر تھے۔ میں پانچویں جماعت کا طالب علم تھا اور رسالہ پھول کا خریدار تھا۔ کچھ عرصے بعد نے دیکھا کہ غلام عباس صاحب کا نام اب بحیثیت ایڈیٹر رسالے پر آنا بند ہو گیا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کے نام کو رسالہ پر نہ دیکھ کر مجھے انتہائی ملال ہوا تھا اور میں نے رسالہ پھول کو ایک خط بھی لکھا تھا۔ یہ بات تو بعد میں معلوم ہوئی کہ وہ پھول رسالے سے الگ ہو کر اسی زمانے میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہو گئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں اسکول کی لائبریری سے لے کر میں نے "الحمرا کے

افسانے" پڑھے تھے اور یہ دل میں اُتر نے والی ایسی خوب صورت کہانیاں تھیں کہ ان کے مُجرّد حسین نقوش آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ "مجسمہ" ۱۹۳۴ء میں "کاروان" لاہور میں شائع ہوا تھا۔ اس سے پہلے بچوں کے لیے ان کی کئی کتابیں جاپانی اور دوسری کہانیاں، چاند کی بیٹی، ثریا کی گڑیا، برف کی بیٹی، الحمرا کے افسانے وغیرہ شائع ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۹ء میں انھوں نے اپنا زندۂ جاوید افسانہ "آنندی" لکھا۔ اسی نام سے ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں مکتبۂ جدید لاہور سے شائع ہوا اور پھر ۱۹۶۰ء میں ان کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "جاڑے کی چاندنی" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں جزیرۂ سخنوران دہلی سے شائع ہو چکا تھا۔ کن رس کے نام سے ان کا ایک اور مجموعہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا تھا۔ غلام عباس صاحب نے جو کچھ لکھا وہ منتخب ہے۔ غلام عباس صاحب کو صحیح معنی میں خراج عقیدت پیش کرنے کا اب واحد طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کی ساری کتابوں کو مرتب کر کے شائع کریں تاکہ اب جب عباس صاحب ہم میں نہیں ہیں ہم اور آنے والی نسلیں ان کی کتابوں کے مطالعے سے انھیں یاد کر سکیں اور تاریخِ ادب میں ان کے صحیح مقام کا تعین کر سکیں۔

غلام عباس صاحب ہمارے وہ افسانہ نگار تھے جو اپنی زندگی میں کلاسیک کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ وہ دھیمے مزاج کے انسان تھے اور یہی دھیماپن ان کی کہانیوں کا مزاج ہے۔ غلام عباس نے مسائلی افسانے نہیں لکھے بلکہ ان انسانوں کی کہانیاں لکھی ہیں جو آفاقی اور ابدی ہیں اور اسی لیے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دل چسپی نہیں کھوتے بلکہ اسی طرح تازہ و زندہ رہتے ہیں جس طرح وہ اس وقت تھے جب لکھے گئے تھے۔ ان کے افسانوں کا "خاتمہ" بھی ہوتا ہے اور نقطۂ عروج بھی اور ایسا گہرا تاثر چھوڑتا ہے کہ پڑھنے والا حیرت و استعجاب کے ساتھ ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ ان کی اپنی زندگی کا افسانہ بھی پہلی اور دوسری نومبر کی درمیانی شب کو ایک ایسے ہی نقطۂ عروج پر ختم ہوا۔ وہ خوش و خرم اپنی بیوی سے باتیں کر رہے تھے کہ آناً فاناً میں وہ ہو گیا جس کی اُمید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ غلام عباس اس دُنیا سے جا چکے تھے اور یہاں پہنچ کر ان کے

ایک افسانے "دو تماشے" کے یہ آخری جملے یاد آرہے ہیں۔

"ابے مرزا صاحب" میرے منھ سے بے اختیار نکلا "آپ رو رہے تھے ؟

"نہیں تو" مرزا نے بھرائی ہوئی آواز میں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ "آنکھوں کو ذرا سگریٹ کا دھواں لگ گیا تھا...... ارے بھئی میں یہ سوچ رہا ہوں کہ سرکار ایسے دردناک فلم دکھانے کی اجازت کیوں دیتی ہے۔"

اور شاید اس وقت میری آنکھوں کو بھی سگریٹ کا دھواں لگ گیا ہے۔

(۶ر نومبر ۱۹۸۲ء)

رئیس احمد جعفری کی خدمات

سید رئیس احمد جعفری نے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو وفات پائی۔ اس طرح آج ان کی وفات کو سولہ سال سے ایک دن اوپر ہو گیا ہے اور مرنے کے سولہ سال بعد تک کسی لکھنے والے کا اس طرح زندہ و باقی رہنا کہ آنے والی نسلیں اس کا نام احترام سے لے کر اس کی تحریروں سے استفادہ کریں اس بات کا اشارہ ہے کہ رئیس احمد جعفری کی تحریروں کا ایک حصہ یقیناً ایسا ہے جو وقت کی حدود سے گزر گیا ہے یا گزر رہا ہے۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے انسان تھے۔ کم گو اور کم آمیز۔ اچھے علمی و مذہبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ریاض خیر آبادی کے نواسے تھے۔ ایسے زود نویس کہ مطبوعہ صفحات کتب کی تعداد کے اعتبار سے شاید ہی ہم دوسرا نام لے سکیں۔ جو کام کیا جلدی کیا اور جم کر کیا۔ سیدھے سادے۔ نہ ٹیم ٹام، نہ دکھاوا، نہ شہرت سے مغرور ہوئے اور نہ دولت سے مرعوب ہوئے۔ میں نے ہمیشہ انھیں شیروانی میں ملبوس پایا۔ یاد نہیں کہ شیروانی کے سارے بٹن کبھی بند کیے ہوں۔ حسرت موہانی کے معتقد، مولانا محمد علی جوہر کے عاشق۔ خود دار بھی اور خدا ترس بھی۔ کھلا کر خوش ہونے والے اور دوست احباب کی خدمت کر کے شکر بھیجنے والے خادم اسلام اور خادم قوم۔ ان موضوعات پر جب بھی لکھا دل نکال کر رکھ دیا۔ ساری عمر لکھتے رہے۔ نہ جلسے نہ جلوس۔ نہ کسی پلیٹ فارم سے وابستہ۔ جو کچھ کمایا لکھ کر کمایا۔ دولت بھی اور شہرت بھی۔ یہی لکھنے والے کی منزل ہے۔ جس نے ایثار کیا وہ منزل تک پہنچا۔ جو انجمن بازی میں اُلجھا رہا۔ کہیں کا نہ رہا۔ کام کرنے والے مر کر بھی جیتے ہیں اور کام نہ کرنے والے جیتے ہوئے بھی مر جاتے ہیں۔ ہار جیت، کامیابی ناکامی کا پتا اُس وقت چلتا ہے جب پیروں تلے سے زمین

نکل چکتی ہے۔ اس لیے نئی نسل کے لکھنے والوں کو عبرت پکڑنی چاہیے اور یاد رکھنا چاہیے کہ کام ہی زندگی ہے اور کام ہی کامیابی ہے۔ اصل زندگی ایثار سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ ایثار جو کسی مقصد کے لیے کیا جائے اور وہ کامیابی جو اس مقصد کو حاصل کرنے سے حاصل کی جائے اور لکھنے والا کہہ سکے ؎

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

سید رئیس احمد جعفری کی زندگی سے یہی پیغام حیات ملتا ہے۔

رئیس احمد جعفری صاحب کے بارے میں ایک بات میں اختصار کے ساتھ اور کہنا چاہتا ہوں۔ رئیس احمد جعفری ایک اچھے ادیب لیکن مثالی صحافی تھے۔ ادیب صرف اپنے موضوعات پر سوچتا اور لکھتا ہے۔ وہ زندگی کی تخلیقی توانائیوں کو زندگی کے تعلق اور حوالے سے لفظوں میں اُتارتا اور برتتا ہے اور اس طرح خود زندگی کی تشکیلِ نو میں ہاتھ بٹا کر زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ نہ صرف زندگی کی بلکہ اس زبان کی بھی جس میں وہ لکھ رہا ہے تخلیقی قوتوں کو دریافت کرتا اور اُبھارتا ہے۔ یہ ایک مثالی ادیب کا دائرۂ عمل ہے۔ مثالی صحافی بھی زندگی کے دائرے میں کام کرتا ہے لیکن اس میں ایسی غیر معمولی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ہر اُس موضوع پر کم وقت میں لکھنے کی قوت رکھتا ہے جو اسے دیا جائے اور پڑھنے والا جب اس تحریر کو پڑھے تو مطمئن ہو جائے۔ مثالی صحافی کے ہاں اسی لیے موضوعات کا تنوع ہوتا ہے' پھیلاؤ ہوتا ہے۔ میں جب رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں تو اس کے ثبوت میں مَیں ان کی تحریروں کے تنوّع اور پھیلاؤ کو پیش کرتا ہوں اور یہ وہ تحریریں ہیں جو بہت کم وقت میں لکھی گئی ہیں۔ وہ ناول نگار بھی تھے اور مترجم بھی۔ سوانح نگار بھی تھے اور مورخ بھی۔ مذہبی موضوعات پر بھی لکھتے تھے اور سیاسی موضوعات پر بھی۔ غرض کہ شاید ہی کوئی موضوع ایسا ہو جس پر انھوں نے نہ لکھا ہو یا نہ لکھ سکتے ہوں۔ اخبار کا اداریہ ہو یا کالم، کسی اہم خبر کا مسئلہ ہو یا کسی تازہ و گرم موضوع پر قلم اٹھانے کی بات ہو' رئیس احمد جعفری کا قلم ہمیشہ زندہ و تازہ رہا۔ انھوں نے ایک طرف اقبال پر لکھا؛ اقبال، اقبال اپنے آئینے میں' اقبال اور عشقِ رسولؐ اور دوسری طرف سفرنامہ ابنِ بطوطہ، طلسم ہوشربا اور

فسانۂ آزاد کی تلخیص کی اور انھیں مرتب کیا۔ ایک طرف اسلام منزل بہ منزل کے عنوان سے کتاب لکھی تو دوسری طرف افاداتِ محمد علی، سیرت محمد علی، مطائبات محمد علی، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد اور حیاتِ قائد اعظم لکھی۔ ایک طرف اگر انھوں نے مستند عربی کتابوں کے ترجمے کیے تو دوسری طرف پچاس سے زیادہ ناول لکھے۔ ایک طرف کامریڈ کا انتخاب مرتب کیا تو دوسری طرف RARE DOCUMENTS کے نام سے نایاب سیاسی و تہذیبی اہمیت کی دستاویزوں کو مرتب کیا۔ یہ تھا وہ تنوّع اور پھیلاؤ جس کے باعث میں رئیس احمد جعفری صاحب کو مثالی صحافی کہتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کا وہ اصل مقام ہے جہاں وہ منفرد ہیں اور کوئی دوسرا لکھنے والا ان کو نہیں پہنچتا۔

(۲۸ر اکتوبر ۱۹۸۴ء)

امداد صابری: تاریخِ صحافت

جناب امداد صابری[1] اردو زبان کے نامور مصنف ہیں۔ جنھوں نے ایسے مصنف اردو زبان کو ایسی بیش بہا کتابیں دی ہیں کہ ان کا نام و کام صدیوں زندہ و باقی رہے گا۔ ان کے موضوعات کے تین دائرے ہیں۔ صحافت، تصوّف اور تذکرہ نویسی۔ صحافت ان تینوں دائروں میں سب سے بڑا اور سب سے وسیع دائرہ ہے اور اس دائرے میں ان کا سارا بنیادی اور اہم کام آجاتا ہے۔ ان کی مشہورِ زمانہ تصنیف "تاریخِ صحافتِ اردو" کی اب تک ۵ ضخیم جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کام مولانا امداد صابری صاحب نے ایک خاص منصوبے کے مطابق کیا ہے۔ پہلی جلد میں ۱۸۲۳ء سے ۱۸۵۷ء تک کی تاریخِ صحافت بیان کی ہے، دوسری جلد میں ۱۸۵۸ء سے ۱۸۷۵ء تک، تیسری جلد میں ۱۸۷۶ء سے ۱۹۰۰ء تک، چوتھی جلد میں ۱۹۰۱ء – ۱۹۱۰ء تک اور پانچویں جلد میں ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کی تاریخ صحافت بیان کی ہے۔ تاریخ بیان کرتے ہوئے جہاں مولانا امداد صابری صاحب نے مخصوص رجحانات کو حالات وغیرہ کو بیان کیا ہے، وہاں وہ نادر واقعات، ادبی، علمی، تعلیمی و ثقافتی واقعات بھی نقل کر دیے ہیں جن سے تاریخیں مرتب ہوتی ہیں۔ انھیں کے ساتھ ساتھ اخبارات و رسائل کے ایڈیٹروں کے مستند حالات بھی درج کر دیے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اخبارات اور ان کے مدیروں کے بارے میں جو سوانحی حالات اور دوسری متعلقہ معلومات اس

---

[1] ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۸ء مطابق ۳۰ صفر المظفر ۱۴۰۹ھ بروز پنج شنبہ مولانا امداد صابری دہلی میں وفات پا گئے۔

کتاب میں شامل ہیں وہ اس طور پر کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتیں۔ تاریخ صحافت کی یہ پانچوں جلدیں معلومات کا ایک بحرِ ذخار ہیں جن کے مطالعے سے ادب، سیاست اخبار اور عام مورخ کو وہ مواد مل سکتا ہے جو اب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ان پانچ مطبوعہ جلدوں کے مطالعے سے ہم انیسویں صدی کے وسط سے لے کر ۱۹۳۰ء تک کی سیاسی و تہذیبی تاریخ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے حالات، عوامل اور جد و جہد کی تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا کام تھا جسے مولانا امداد صابری ہی کر سکتے تھے۔ یہ بات کہ مولانا امداد صابری صاحب ہی یہ کام کر سکتے تھے میں نے اس لیے کہی کہ مولانا کے پاس اتنا بڑا ذاتی کتب خانہ ہے جس میں انیسویں صدی کے وسط سے لے کر آج تک کے اخباروں کے بیشتر فائل موجود ہیں اور ساتھ ساتھ ان کے پاس وہ اخلاص اور وہ لگن بھی موجود ہے جو فرہاد کو جوئے شیر لانے پر آمادہ کرتی ہے۔

ان پانچوں جلدوں کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ کام کر کے مولانا امداد صابری نے ہمارے آج کے مادہ پرست اور زر پرور معاشرے میں عشقِ صادق کی ایک لازوال مثال قائم کی ہے اور اردو زبان کو قیمتی، سدا چمکنے والے اصلی موتیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ "تاریخ صحافت اردو" ہر قسم کی معلومات کا ایسا خزینہ ہے کہ ہم اسے ایک طرح سے قاموسِ صحافت کہہ سکتے ہیں۔ ان جلدوں کے مطالعے سے ان تبدیلیوں کا بھی واضح طور پر احساس ہوتا ہے جو ہندوستان میں بسنے والی قوموں کے باطن میں آئیں اور برِ عظیم پاک و ہند کے نقشے کو تبدیل کر گئیں۔ ان جلدوں میں تاریخ کا دریا ہماری نظروں کے سامنے رواں دواں ہو جاتا ہے اور ہم تاریخ کے ساتھ خود بھی سفر کرنے لگتے ہیں اور جو کچھ گذشتہ ڈیڑھ صدی میں ہوا اس کی جیتی جاگتی متحرک تصویریں فلم کی طرح سامنے آ جاتی ہیں۔ اخبار واقعات کا روزنامچہ ہوتے ہیں اور واقعات کا اظہار زندگی کا اظہار ہے۔ اخبار نویس واقعات کو بیان کرتا ہے اور ان پر اپنے ردِعمل کا اظہار کرتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں ہونے والے واقعات کو ہم تک پہنچاتا ہے اور اس طرح ہماری معلومات اور شعور میں اضافہ کرتا ہے، ہمیں اپنے نقطۂ نظر سے قریب لاتا ہے اور ایک ہی بات کو بار بار کہہ کر ہمیں قبول کرنے پر آمادہ کرتا ہے اور اس طرح سیاسی جدوجہد

کو تیز کر کے زندگی کو آگے بڑھانے میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ ادیب یہ کام اس طور پر نہیں کرتا۔ وہ اپنے دور کی روح کا اظہار کر کے اسے آنے والے زمانوں کی روح سے پیوست کر دیتا ہے اور اس روح کا اظہار اس طور پر اور اس اندازِ بیان کے ساتھ کرتا ہے کہ روح کی آواز ہماری زبان بن جاتی ہے اور ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اسی لیے صبح کا اخبار سب کچھ کر کے شام کو باسی ہو جاتا ہے لیکن ادب اسی طرح تازہ رہتا ہے۔ مولانا امداد صابری نے "تاریخِ صحافتِ اردو" لکھ کر صحافت کی تاریخ کو ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے اور یہ اتنا بڑا کام ہے کہ مولانا امداد صابری کو جتنی داد دی جائے وہ کم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخ صحافت اردو کی چھٹی جلد بھی جلد منظرِ عام پر آ جائے گی جس میں ۱۹۳۱ء سے ۱۹۸۰ء تک کی تاریخ بھی اسی طرح بیان کی جائے گی۔

امداد صابری صاحب کی دوسری اہم تصنیف "گلدستۂ صحافت" ہے جس میں مولانا نے اُن گلدستوں کو مرکز مطالعہ بنایا ہے جو برعظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں تقریباً انیسویں صدی کے وسط سے شائع ہونا شروع ہوئے اور شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اب تو گلدستوں کا رواج باقی نہیں رہا لیکن اس زمانے میں جب شعر و شاعری کا چرچا عام تھا، طرحی و غیر طرحی مشاعرے مقبول تھے، چھاپے خانے عام ہو گئے تھے یہ گلدستے وہ کام کرتے تھے جو آج رسائل و جرائد اور اخبارات کرتے ہیں۔ مولانا کی تحقیق کے مطابق اردو کا سب سے پہلا گلدستہ "گلِ رعنا" کے نام سے مولوی کریم الدین نے دہلی سے جاری کیا۔ یہ وہی مولوی کریم الدین ہیں جن کا تذکرہ طبقاتِ شعرائے ہند ۱۸۴۸ء میں شائع ہوا اور آج بھی اردو زبان کے قابلِ ذکر تذکروں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا امداد صابری صاحب نے اس "گلدستۂ صحافت" میں ۱۰۶ گلدستوں کا تعارف کرایا ہے اور انتخاب کلام کے ساتھ مرتب اور لکھنے والوں کے بارے میں بھی ضروری معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے بھی اردو زبان و ادب کے بہت سے نامعلوم گوشے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس کی نوعیت بھی ایک طرح سے ادبی تذکرے کی ہے۔ یہ "گلدستۂ صحافت" کی جلد اول ہے۔ مولانا نے وعدہ کیا ہے کہ بقیہ گلدستوں کے شعرا اور اُن کا کلام وہ اگلی جلد

میں پیش کریں گے ۔ آئیے ہم سب دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مولانا امداد صابری صاحب کو صحت کے ساتھ اتنی عمر عطا فرمائیں کہ وہ سارے علمی و ادبی کام پورے کر سکیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ مولانا کے دو تذکرے "حجازِ مقدس کے اردو شعرا" اور "جنوبی افریقہ کے اردو شاعر" مشہور ہو چکے ہیں اور ان کے علاوہ روح صحافت، فرنگیوں کا جال، تذکرہ حضرت ضامن شہیدِ فرنگ، تذکرہ قاری عبداللہ مکی و قاری عبدالرحمٰن الہ آبادی، داستانِ شرف، تذکرۂ صولتہ النساء بیگم، دہلی کے قدیم مدارس و مدرس، شہیدانِ وطن، ضلع مراد آباد اور اردو کے اخبار نویس وغیرہ شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ میں مولانا کا ذاتی طور پر اس لیے بھی شکر گذار ہوں کہ اُن کی کتابوں سے میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے حتیٰ کہ میرے دادا جالب دہلوی صاحب مرحوم و مغفور کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں انھوں نے درج کی ہیں جن کا مجھے بھی علم نہیں تھا۔ خدا مولانا کو صحت و عمر دراز کے ساتھ خوش و خرم رکھے تاکہ وہ اسی طرح کام کرتے رہیں۔

مولانا نے تاریخِ صحافت اردو کی ۵ جلدیں اور گلدستۂ صحافت کی ایک جلد لکھ کر وہ کام کیا ہے جو فرد نہیں بلکہ ادارے کرتے ہیں۔

۱۰ر جولائی ۱۹۸۴ء

پیر حُسام الدّین راشدی

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ موت نے گھر دیکھ لیا ہے۔ جوشؔ گئے، فراقؔ گئے، احسان دانش گئے اور ابھی ان لوگوں کا غم تازہ تھا کہ ایک دن میں دو ہستیاں حضرت جعفر شاہ پھلواری اور پیر حُسام الدین راشدی بھی ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے:

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

یہ وہ لوگ تھے جو صدیوں میں کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں اور اپنی نظر کیمیا گر سے خاک کو سونا بنا دیتے ہیں۔ پیر حسام الدین راشدی جنھیں ہم سب پیر صاحب کے نام سے پکارتے تھے، کراچی شہر کی علمی زندگی کی آبرو تھے۔ ایک اچھے انسان، ایک متواضع مہمان نواز، کھلے دل کے بے باک دوست، صاحب علم اور صاحبِ نظر۔ کام میں ڈوب کر کام کرنے والے، گہرائی میں جاکر دادِ تحقیق دینے والے۔ ۱۹۵۲ء میں ان سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ میں اور شاہد احمد دہلوی مرحوم صبح کے وقت ان کے گھر گئے تھے۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں، جو زمین سے لے کر چھت تک کتابوں سے بھرا ہوا تھا، اپنی بڑی سی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دراز قامت، صحت مند گٹھا ہوا جسم، چمک دار گندمی رنگ، شگفتہ چہرہ، بڑے تپاک سے ملے۔ چائے پیش کی اور بہت دیر تک علم و ادب کی باتیں کرتے رہے اور پھر دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے میری آخری ملاقات ہوئی۔ وہ علاج کے لیے لندن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ دراز قامتی تو باقی تھی لیکن چہرے کی چمک غائب ہو چکی تھی۔ آواز بھاری اور بیٹھی ہوئی تھی لیکن مزاج کا مردانہ پن اسی طرح قائم تھا۔ کئی آپریشن ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود ان کی ہمت اسی طرح

باقی تھی اور زندہ رہنے کا حوصلہ اسی طرح زندہ تھا۔ پھر وہ چلے گئے اور مارچ میں جب واپس آئے تو حالت بہت بگڑ چکی تھی۔ سرطان جسم کے مختلف حصّوں میں پھیل چکا تھا اور وہ بہت تکلیف اٹھا رہے تھے۔ ملنے جلنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا۔ دو دن بعد دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں داخل کر دئے گئے جہاں یکم اپریل ۱۹۸۲ء کو وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔ وہ اس سے پہلے بھی کئی بار اسپتال میں داخل ہوئے تھے لیکن ہر بار صحیح وسالم گھر لوٹ آئے تھے۔ ابھی ۵ سال پہلے کی بات ہے۔ آپریشن کے بعد روس سے واپس آئے ہوئے انھیں خاصا وقت ہو چکا تھا اور اب وہ صحت مند تھے۔ میں نے انھیں ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ وہ آج شام کو دعوت میں ضرور تشریف لائیں۔ وہ جب بھی دعوت کرتے تو مجھے ضرور بلاتے اور میں جب بھی دعوت کرتا انھیں ضرور زحمت دیتا۔ جب قاصد خط لے کر گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ گھر والوں نے خط لے لیا۔ مغرب کے وقت میرے ہاں آئے۔ گھٹنے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا پیر صاحب خیر تو ہے۔ کہنے لگے میں اسپتال میں داخل تھا۔ آپریشن ہوا ہے۔ آپ کا خط آیا تو اسپتال سے چلا آیا۔ وہاں پڑے پڑے جی گھبرا گیا تھا۔ سوچا آپ سے اور دوسرے دوست احباب سے ملاقات ہو جائے گی اور گپ شپ سے دل بہل جائے گا۔ چہرہ پر وہی بشاشت تھی جو ہمیشہ ان کی پہچان رہی ہے۔ رات گئے تک بیٹھے رہے۔ کھانا کھایا اور پھر اسپتال واپس چلے گئے۔ اسپتال جانا، آپریشن کرانا ان کے لیے معمولی بات بن چکی تھی۔ میں نے ایسے موذی بیماری کے مریض کو اتنا جری، اتنا بہادر کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ موت سے بھی ہنستے کھیلتے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں پہلی بار ان پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ آٹھ سال تک نہایت احتیاط سے زندگی بسر کرتے رہے۔ سگریٹ بھی چھوڑ دی تھی لیکن جب میں دسمبر ۱۹۸۱ء میں ان سے ملا تو وہ پھر کثرت سے سگریٹ پی رہے تھے۔ شاید انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اب وہ اس منزل میں ہیں جہاں کثرت سے سگریٹ نوشی بھی ان کو مزید نقصان نہیں پہنچا سکے گی۔ ۱۹۵۸ء ان کی زندگی کا اہم موڑ تھا۔ اس کے بعد ہی ان کی تصنیف وتالیف کا اصل دور شروع ہوتا ہے۔ ان کی بیشتر

اور قابلِ ذکر تالیفات ۱۹۵۸ء کے بعد ہی مرتب و شائع ہوئیں۔

پیر حسام الدین راشدی بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے ہی سے ان کی نظر مختلف علوم و فنون پر تھی۔ پیر صاحب نے سندھ کی تاریخ و تہذیب کے ان بنیادی مآخذ کو مرتب و شائع کر کے سندھ کی علمی و تہذیبی زندگی کو حیاتِ نو بخشی۔ آج جو سندھ کی نئی نسل علمی و تحقیقی کام کر رہی ہے وہ پیر صاحب کی تالیفات ہی سے روشنی حاصل کر رہی ہے۔ پیر صاحب نے جدید تحقیق کی روایت کو اہلِ سندھ سے روشناس کرایا۔ ان کی یہ خدمت تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گی۔

پیر حسام الدین راشدی نے فارسی، سندھی اور اردو میں کم و بیش ۵۰ کتابیں تصنیف، تالیف اور مرتب کیں جن میں محمد اصلاح مرزا کا تذکرہ شعرائے کشمیر، میر علی شیر قانع ٹھٹھوی کے تذکرے تحفۃ الکرام، مقالات الشعرا، مکلی نامہ اور معیار سالکانِ طریقت بھی شامل ہیں اور خلیل ٹھٹھوی کا تذکرہ تکملہ مقالات الشعرا، میرک یوسف کی تاریخ مظہر شاہجہانی، میاں نور محمد کلہوڑہ کی تاریخ منشور الوصیت، سید عبدالقادر ٹھٹھوی کی حدیقۃ الاولیا اور میر محمد ٹھٹھوی کا ترخان نامہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ پیر صاحب کی تحقیق و ترتیب کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ جہاں صحتِ متن پر پوری توجہ دیتے تھے وہاں متعلقہ معلومات کو بھی ساتھ ہی یکجا کر دیتے تھے۔ یہ دوہری افادیت اُن کی ہر مُرتبہ کتاب میں ملے گی۔ وہ بہت محنتی، اَن تھک انسان تھے۔ اکثر وہ یہ کرتے کہ کتاب کو اس طرح مرتب کرتے کہ اس موضوع کو دورِ جدید تک مکمل کر دیتے مثلاً محمد اصلاح مرزا کے تذکرہ شعرائے کشمیر کو مرتب کیا تو اصل تذکرے میں ۳۰۵ شعرا کا تذکرہ و ترجمہ درج تھا۔ پیر صاحب نے نہایت محنت و کاوش سے ان فارسی شعرائے کشمیر کو مزید شامل کر دیا جو محمد اصلاح کے بعد کے دور سے تعلق رکھتے تھے اور اس طرح تقریباً ۳۱۲ نئے شعرا کا اسی انداز سے اور اضافہ کر دیا۔ پھر ہر شاعر کے بارے میں ضروری و مفید معلومات بھی شامل کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تذکرہ اب چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں اقبال تک کم و بیش سارے فارسی شعرائے کشمیر شامل ہو گئے ہیں۔ یہی

صورت مکلی نامہ کی ہے۔ مکلی نامہ کا اصل متن ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے اور حواشی اور اضافے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہیں۔ اپنے اس تحقیقی عمل سے انھوں نے نہ صرف قدیم کتابوں کو نئی زندگی دی بلکہ تحقیق کی صبر آزما روایت کو بھی قائم کر دیا۔ اردو زبان میں ان کی دو تصانیف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک "مرزا غازی خان اور اس کی بزمِ ادب" جسے انجمن ترقی اردو نے چند سال پہلے شائع کیا تھا اور دوسری "دو چراغِ محفل" جس میں اور مفید معلومات کے علاوہ غالب کے شاگرد ناطق مکرانی کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ نادر اور اچھوتی ہیں۔ ان کی مرتبہ کتابیں متعلقہ دور کی دوسری ساری کتابوں سے کم و بیش بے نیاز کر دیتی ہیں۔ پھر جن نادر مخطوطات، کتابوں، تحریروں اور دستاویزات تک ان کی رسائی تھی بہت کم اہلِ علم ان تک رسائی رکھتے تھے۔ وہ جو کچھ لکھتے اس دور کو ساتھ ہی سمیٹ لیتے۔ میں نے شاہد احمد دہلوی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں ساقی کراچی کا شاہد احمد دہلوی نمبر مرتب کیا تو پیر صاحب سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی ایک مضمون شاہد صاحب کے بارے میں لکھیں۔ انھوں نے مضمون لکھا اور اس میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے شاہد احمد دہلوی کی وفات تک کے دور کو سمیٹ کر دریا کو کوزہ میں بند کر دیا۔ اس مضمون کے آخر میں پیر صاحب نے لکھا:

"زندہ رہنے والے مرنے والے کو قبر میں اُتار کر جب تک پوری قبر نہ اٹ جائے اس وقت تک مختلف ٹولیوں میں بٹ کر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے۔ دُنیا اسی کا نام ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے نہیں گیا۔ دُنیا یوں ہی چلتی رہے گی۔ دُنیا کا کاروبار اور انسانوں کے مشاغل ویسے ہی جاری رہیں گے۔"

شاہد احمد دہلوی کی وفات کے ۱۵ سال بعد پیر سید حسام الدین راشدی بھی ہم سے رخصت ہو کر زیرِ زمین خاک میں آسودہ ہو گئے۔ لوگ چلے جاتے ہیں اور پھر جا کر واپس نہیں آتے شاید وہاں آرام بہت ہے۔

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

(۷ر اپریل ۱۹۸۲ء)

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

مولانا سعید احمد اکبر آبادی ۷۷ سال کی عمر میں، ۲۴ رمئی ۱۹۸۵ء کو، شام کے سوا چھ بجے کراچی میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ وہ سرطان کے موذی مرض میں مبتلا تھے اور کافی عرصے سے بیمار تھے۔ مرض کی نوعیت ان سے پوشیدہ رکھی گئی تھی۔ وفات سے آٹھ دس دن پہلے جب میں اور مشفق خواجہ صاحب ان کی عیادت کے لیے ان کی بیٹی اور ہم نام داماد اے ایم سعید صاحب کے گھر پہنچے تو صاحب خانہ نے ہمیں بتایا کہ ان کی بیماری کے بارے میں کوئی ذکر نہ کیا جائے۔ ہم خاصی دیر ان کے ساتھ رہے۔ اضمحلال ان کے چہرے سے عیاں تھا۔ جلد کھردری اور سیاہ ہو گئی تھی۔ وہ کچھ دیر بیٹھے اور پھر تکیے کے سہارے صوفے پر لیٹ گئے۔ بار بار آستین کو اوپر کر کے اپنے ہاتھوں کو کھجاتے رہے۔ اس عرصے میں علم و ادب کی باتیں ہوئیں۔ انھوں نے اپنے آئندہ کے منصوبوں کا ذکر کیا۔ شیخ الہند اکادمی کے مسائل اور منصوبوں کی وضاحت کی اور بتایا کہ وہ اب جلد از جلد ہندوستان واپس جا کر اپنے کاموں میں لگ جانا چاہتے ہیں۔ حضرت علیؓ کی حیات و سیرت کو مکمل کرنے کا بھی ذکر آیا۔ ان سے گفتگو کر کے محسوس ہوا کہ مولانا ذہنی طور پر اسی طرح مستعد ہیں جس طرح وہ بیماری سے پہلے تھے۔ اس سے پہلے بھی ان سے گذشتہ تین چار سال میں دو تین بار ملاقات ہو چکی تھی اور ہر بار مولانا کی خوش مزاجی، انداز تکلم اور وسعت علم سے میں متاثر ہوا تھا۔ وہ ایک اچھے روشن دماغ، فراخ دل اور وسیع النظر انسان تھے۔ ان کی تصانیف پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زندگی کو کنویں کے اندر سے نہیں بلکہ کائنات کی وسعتوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اسی لیے ان کی تحریریں آج کی نسل کو نہ صرف متاثر کرتی ہیں بلکہ ان کے دل کے نہاں

خانوں میں اتر جاتی ہیں۔ یہ بصیرت، بے نہایت وسیع و عریض زندگی کے حوالے سے، علم اور فکر کے گہرے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھار کوئی شاہ ولی اللہ، کوئی سر سید احمد خان، کوئی شبلی نعمانی، کوئی الطاف حسین حالی، کوئی ڈاکٹر محمد اقبال، کوئی سید سلیمان ندوی اس بصیرت کو الفاظ کا جامہ پہناتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مر کر بھی ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ انسان فانی ہے لیکن اس کے کارنامے، اس کی بصیرتیں یقیناً لافانی ہیں اور اسی لیے مولانا سعید احمد اکبر آبادی بھی اس دور کے حوالے سے یقیناً زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بہت لکھا اور اپنے خیالات کو تحریر و تقریر دونوں سطح پر معاشرے تک پہنچایا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں زبان بھی دی تھی اور قلم بھی۔ وہ عربی، فارسی پر بھی عبور رکھتے تھے اور اردو و انگریزی پر بھی۔ ان کے پاس علم بھی تھا اور اس کے اظہار کا وسیلہ بھی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے چوں کہ زندگی کو پورے پھیلاؤ کے ساتھ دیکھا تھا اس لیے ان کے مزاج میں ٹھہراؤ، اعتدال اور حلم اس درجہ تھا کہ مسائل کو سلجھانے اور حل کرنے کی غیر معمولی صلاحیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر ان میں انتظامی صلاحیت بھی اعلیٰ درجے کی تھی۔ انسانی رشتوں کی نزاکت و لطافت کا وہ پورا خیال رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ محفل آرا بھی تھے اور جانِ محفل بھی۔ اس دور میں ایسے اعتدال پسند، روشن دماغ اور ہر دل عزیز مولانا خال خال نظر آتے ہیں اور انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ اپنی تین ملاقاتوں میں میں نے محسوس کیا کہ مولانا سے ملنا زندگی کو سنوارنے اور ثوابِ دارین حاصل کرنے کا درجہ رکھتا ہے۔ اُن سے مل کر اور ان سے گفتگو کر کے انسان تازہ دم ہو جاتا تھا۔ فارسی و اردو اشعار سے اظہار میں تازگی پیدا کرتے تھے اور حاضر علم اور وسیع معلومات سے ملنے والے کے دماغ کو روشن کر دیتے تھے۔

مولانا ۱۹۰۸ء میں اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی کے مُرشد حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کی دعاؤں سے پیدا ہوئے۔ دارالعلوم دیوبند میں تعلیم پائی اور مولانا انور شاہ کشمیری، علامہ ابراہیم، علامہ شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مفتی عزیز الرحمن عثمانی، مفتی محمد شفیع اور محمد ادریس کاندھلوی سے علم کا نُور حاصل کیا۔ کچھ عرصہ ڈابھیل میں تدریس کا کام بھی کیا اور پھر جدید تعلیم کے لیے سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل ہو کر ایم اے پاس کیا اور پھر یہیں استاد مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۸ء میں

ندوۃ المصنفین قائم کیا اور ماہنامہ "برہان" جاری کیا اور وفات تک وہ اس کے مدیر اعلیٰ رہے ماہنامہ برہان نے علمی و مذہبی حلقوں میں جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو اس دور میں صرف " معارف اعظم گڑھ کو حاصل تھا۔ ۱۹۴۷ء تک وہ سینٹ اسٹیفن کالج سے وابستہ رہے اور پھر آزادی کے بعد جب مسلم دِلّی اجڑ گئی تو وہ پرنسپل کی حیثیت سے مدرسۂ عالیہ کلکتہ سے وابستہ ہو گئے اور اس ادارے کو دوبارہ قائم کر کے اور اس میں علم و زندگی کی نئی روح پھونک کر گیارہ سال بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ دینیات کے صدر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے علی گڑھ سے ریٹائر ہو کر وہ ہمدرد دہلی کے تحقیقی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ مسلم یونیورسٹی کے زمانے میں وہ ایک سال تک میکگل یونیورسٹی کناڈا سے بھی وابستہ رہے اور آخر میں دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے وابستہ ہو گئے۔ وفات تک اسی اکاڈمی سے ان کا تعلق رہا۔ وہ چاہتے تھے کہ علمائے ہند کی مستند علمی کتابوں کو از سرِ نو جدید انداز سے مرتب مدوّن کیا جائے۔ ان کا ارادہ تھا کہ اکابرِ دیوبند اور شاہ ولی اللہ کی بلند پایہ تصانیف اور خصوصاً حجۃ اللہ البالغۃ کو جدید فنِ تدوین کے مطابق مدون کیا جائے۔ یہ وہ کام ہیں جو یقیناً کیے جانے چاہئیں تاکہ مفید کتابیں دورِ جدید کے تقاضوں کے مطابق مرتب و مدون ہو کر سامنے آئیں اور مولانا کی روح بھی اس عملِ تدوین سے خوش ہو۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تصانیف میں مسلمانوں کا عروج و زوال، حضرت عثمان ذوالنورینؓ اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے ناقد، وحی الٰہی، فہمِ قرآن، خطباتِ اقبال پر ایک نظر، چار علمی مقالات، صدیقِ اکبر، نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت علمی و مذہبی سطح پر وہ کتابیں ہیں جو طویل عرصے تک دلچسپی سے پڑھی جائیں گی اور حوالے کی کتابوں کی حیثیت سے زندہ رہیں گی۔

مولانا نے اپنی کسی تقریر میں کہا تھا کہ آج کے مسلم معاشرے میں تین رجحانات پائے جاتے ہیں۔ قدامت پرستی کا رجحان، ترقی پسندی کا رجحان اور آزاد فکری کا رجحان۔ قدامت پرستی ہر مسئلے یا معاملے کو کسی خاص فقہی مسلک کی روشنی میں تلاش کرتی ہے۔ ترقی پسندی کی اصل قانون، قرآن و حدیث ہے اور فقہی مسالک کی حیثیت اس قانون کی تشریح و توضیح کی ہے۔

وہ بجائے خود قانون نہیں ہے۔ اس بنا پر کسی جدید مسئلے کا حل پہلے براہ راست قرآن و حدیث میں دیکھنا چاہیئے اور اس کے بعد فقہ سے وہی کام لینا چاہیے جو عدالت میں بحث کرتے وقت ایک وکیل نظائر سے لیتا ہے۔ آزاد فکری صرف قرآن کو ماخذ تسلیم کرتی ہے اور حدیث کو حجت نہیں مانتی۔ ان رجحانات پر روشنی ڈال کر مولانا نے فرمایا کہ ان کا تعلق اس رجحان سے ہے جو ترقی پسندی کے ذیل میں آتا ہے۔ مولانا کی فکر و تحریر کا بنیادی رجحان یہی ہے۔

اسی رجحان کی وجہ سے ان کی تحریروں میں روشنی نظر آتی ہے۔ وہ دوسرے مولانا حضرات کی طرح مسائل کو الجھا کر اسلام کو وجہ تفرقہ نہیں بناتے بلکہ اعتدال و توازن کے ذریعے ایسے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں جن سے مسائل سلجھ کر زندگی کو آگے بڑھاتے ہیں۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی حنفی العقیدہ ضرور تھے لیکن انھوں نے اسلام کی تفہیم کے سلسلے میں حنفی فقہ سے اختلاف کرنے میں تامل نہیں کیا۔ مثال کے طور پر تین طلاقوں کے مسئلے میں انھوں نے امام ابو حنیفہ کے مقابلے میں حافظ ابن القیم اور امام ابن تیمیہ کے مسلک کو ترجیح دی۔ اسی طرح تسمیہ عند الذبح کے مسئلے میں بھی امام شافعی کے فقہ کو اولیت دی۔ عورتوں کے مساجد میں نماز پڑھنے کے مسئلے پر بھی انھوں نے فقہ حنفی سے مدلل اختلاف کیا۔ وہ فقہی رواداری کے قائل تھے اور فقہ کو حرف آخر تسلیم نہیں کرتے اور اجتہاد کو دور حاضر میں ضروری سمجھتے تھے۔ یہی وقت کی ضرورت ہے اور یہی مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا نقطۂ نظر تھا۔

"خطبات اقبال پر ایک نظر" میں انھوں نے لکھا ہے کہ

"ایک ایسے دورِ جمود و تعطلِ ذہنی میں جب کہ لوگ اجتہاد کا لفظ زبان سے نکالتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ان پر آزاد خیالی کا لیبل نہ لگ جائے علامہ اقبال نے اپنی چشمِ بصیرت سے آنے والے زمانہ کو دیکھ لیا ..... کہ وہ زمانہ جلد آرہا ہے جب مسلم ممالک طوقِ غلامی سے آزاد ہو کر اپنی اپنی حکومتیں لے کر بیٹھیں گے اور دنیا کی دوسری مملکتوں کے ساتھ استحکام اور عروج و ترقی کے میدان میں مسابقت کرنے پر

مجبور ہوں گے۔ اس وقت سائنس اور ٹیکنالوجی کی غیر معمولی اور حیرت انگیز ترقیات کے عہد میں سینکڑوں، ہزاروں ایسے جدید مسائل پیدا ہوں گے جن کا حل اجتہاد کے بغیر ناممکن ہوگا۔"

(ص ۶۹ اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر ۱۹۸۳ء)

یہ صورت حال جسے علامہ اقبال نے دیکھ لیا تھا آج ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ اب اسلام کی اشاعت اور زندگی سے اس کا گہرا تعلق پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھولا جائے۔ مسائلِ زندگی کو اجتہاد کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور روح اسلام سے نئی نسلوں میں بصیرت کی نئی روشنی اور اسلام کو زندگی میں عملی طور پر اپنانے اور برتنے کی حقیقی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی تحریریں اور ان کے افکار ہمیں یہی راستہ دکھاتے ہیں۔ اسی لیے وہ دورِ حاضر میں غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں اور ہمارے دلوں میں عزت و احترام کی مسند پر متمکن ہیں۔

اب جب کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی ہمارے درمیان نہیں ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا کی تمام کتابوں کو خاص اہتمام سے شائع کیا جائے۔ نہ صرف کتابوں کو بلکہ ان کے مضامین، شذرات، انٹرویوز اور مطبوعہ و محفوظ تقریروں کو بھی یکجا و مرتب کر کے طبع کیا جائے اور پھر سیٹ کے طور پر پبلک میں پیش کیا جائے۔ مولانا کی یاد کو زندہ و باقی رکھنے کا یہی مفید اور کارآمد طریقہ ہے اور اس پر جلد عمل کرنا چاہیے۔ اس طرح ہم مولانا کے افکار کو آنے والی نسلوں تک پہنچا سکیں گے۔ یہ ہم سب کا دینی فریضہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی روح کو خوش کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ دیکھئے مولانا سعید احمد اکبر آبادی حضرت غالب کا یہ شعر پڑھ رہے ہیں:

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

۲۰ رجون ۱۹۸۶ء

مجنوں گورکھپوری

۴/ جون ۱۹۸۸ء کو حضرت مجنوں گورکھپوری ۸۴ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ موت یقیناً برحق ہے لیکن جب ایسے لوگ مرتے ہیں جنھوں نے معاشرے کے جنگل کو گلستان بنایا ہے یا جنھوں نے آنے والے زمانے کی نوید دے کر معاشرے میں نئے شعور اور نئے احساس کو جنم دیا ہے تو ان کے رخصت ہونے پر ہمیں دلی رنج ہوتا ہے اور ہم افسردہ ہو جاتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری کی وفات کی خبر جب میں نے سنی تو میں بھی اداس ہو گیا اور گذشتہ بیس سال کی ملاقاتوں کی تصویریں متحرک ہو کر ذہن کے پردے پر نمایاں ہونے لگیں۔ مجنوں صاحب کی ایک بات تو یہ ہے کہ وہ اسم با مسمیٰ تھے۔ دھان پان سے، دبلے پتلے، لاغر و نحیف، دیکھیے تو مجنوں دکھائی دیں۔ یہی ان کا تخلص تھا۔ اسی سے دنیا میں مشہور ہوئے اور یہی نام تاریخِ ادب کا حصہ ہے۔ جسمانی طور پر مجنوں لیکن ذہنی طور پر رستم کی طرح طاقت ور، بیمار ہوتے اور اکثر ہوتے لیکن ذہن اسی طرح تنومند و تازہ رہتا۔ بات کرتے تو علم کا دَر وا ہو جاتا۔ یادداشت ایسی کہ برسوں کی بات یا ربع صدی پہلے پڑھی ہوئی کتابوں کے حوالے حسبِ موقع فوراً زبان پر آ جاتے۔ اس یادداشت نے ان کا اس وقت بہت ساتھ دیا جب رعشہ کی وجہ سے لکھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا تھا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا بول کر لکھوایا۔ "غالب ــ شخص اور شاعر"، جو ان کی آخری کتاب ہے، کم و بیش اسی طرح بول کر لکھوائی گئی تھی۔

مجنوں صاحب کی تحریر کی سب سے بڑی خوبی اعتدال و توازن ہے۔ وہ لکھتے وقت جذبات کی رَو میں نہیں بہتے بلکہ مثال اور دلیل سے اپنی بات اس طرح احتیاط سے کہتے ہیں کہ

بات پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے اثرات کو قبول کیا لیکن اس کے ساتھ بہہ نہیں گئے۔ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۳۰ء اردو میں رومانیت اور رومانی ادب کا دور تھا۔ ایک طرف اختر شیرانی کی آواز ساری فضا پر چھائی ہوئی تھی اور دوسری طرف نیاز فتحپوری اور آل احمد وغیرہ کی رومانوی تحریریں اور افسانے قبولیتِ عام کے پَروں پر اُڑ رہے تھے۔ مجنوں صاحب نے بھی اسی زمانے میں افسانہ نگاری شروع کی اور اسی رنگ میں دادِ تحریر دے کر شہرت حاصل کی لیکن جب ترقی پسند تحریک شروع ہوئی تو انھوں نے آنے والے زمانے کی ہواؤں اور تقاضوں کا رُخ دیکھ کر افسانہ نگاری کو خیر باد کہا اور ترقی پسند نقطۂ نظر کی ترجمانی کر کے معاشرے میں نئے شعور کی پیدائش و ترویج میں مدد دی لیکن یہاں بھی انھوں نے آنکھیں کھلی رکھیں اور ادب ہی کو اپنی ہر تحریر کا بنیادی حوالہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہواؤں نے فکر و خیال کی سطح پر رُخ بدلا، ان کی تنقیدی تحریریں اسی طرح تازہ دم رہیں اور آج بھی اپنی معنویت اور جمالیاتی رنگ کے باعث دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں اور ادب کی تاریخ کا حصہ ہیں۔

وفات سے دس پندرہ سال پہلے وہ اپنی خود نوشت لکھوانا چاہتے تھے تاکہ ان کا دور آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ ہو جائے لیکن مناسب لکھنے والے کا کوئی انتظام نہ ہونے کی وجہ سے یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ البتہ ان کی خواہش ایک حد تک اس طرح پوری ہو گئی کہ میرے دوست لطف اللہ خان صاحب نے پندرہ سولہ گھنٹے کا انٹرویو ٹیپ پر محفوظ کر لیا۔ میں سوال کرتا تھا اور مجنوں صاحب اس کا جواب دیتے تھے۔ میں نے اس انٹرویو میں صرف لقمہ دینے کا کام کیا تاکہ مجنوں صاحب زیادہ سے زیادہ بول سکیں۔ اس انٹرویو میں گفتنی بھی ہے اور ناگفتنی بھی۔ لطف اللہ خان صاحب کو شاید آپ نہ جانتے ہوں لیکن انھوں نے جو کام کیا ہے وہ ادارے بھی نہیں کر سکتے۔ ان کے پاس آوازوں کا جو ذخیرہ ہے برصغیر میں تو یقیناً کسی فرد یا ادارے کے پاس نہیں ہے۔ شاید دنیا بھر میں کسی فرد کے پاس آوازوں کا اتنا بڑا ذخیرہ نہیں ہوگا۔ مجنوں صاحب کی "آواز" کی بات تو میں نے کی۔ ایک ذرا سی مثال اور دیتا ہوں۔ فیض احمد فیضؔ کا سارا کلام خود اُن کی زبانی محفوظ ہے۔ وہ بھی جو شائع ہو چکا ہے اور وہ بھی جو شائع نہیں ہوا۔ لطف اللہ خان صاحب بھی اب سترے

بہتر ہے ہو رہے ہیں اور ہم سب کو، حکومت کو، اداروں کو اس ذخیرے کو محفوظ کرنے کی فوراً سبیل کرنی چاہیے۔ مجنوں صاحب کا یہ پندرہ سولہ گھنٹے کا یہ انٹرویو بھی کتابی صورت میں شائع ہونا چاہیے۔

مجنوں صاحب نے افسانے بھی لکھے اور تنقید بھی۔ جمالیات پر سب سے پہلی کتاب انھوں نے لکھی۔ مغربی ادب کے شاہکار ادب پاروں کے اردو میں ترجمے بھی کیے۔ نئی فکر کو ادبی تنقید میں سمو کر اسے ایک ایسی صورت عطا کی کہ وہ مجنوں صاحب کی انفرادیت بن گئی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ مجنوں صاحب اسم بامسمّیٰ تھے۔ ان کا خاندانی احمد صدیق تھا۔ ادب میں انھوں نے صدیقیت کی ترویج کی اور ہمیشہ صداقت اور سچائی کا اظہار کرتے رہے۔ مجنوں گورکھپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ

> "مجھے بے باکی کے ساتھ کھرے کو کھرا اور کھوٹے کو کھوٹا، سچ کو سچ، جھوٹ کو جھوٹ، اصلیت کو اصلیت، فریب کو فریب کہہ دینے میں کبھی کوئی تامل نہیں ہوا اور میری زبان اور میرے قلم نے اس معاملے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی"۔

یہی ان کی تحریروں کی خوبی ہے اور اسی خوبی کی وجہ سے وہ آج کی طرح آنے والے زمانوں میں بھی دلچسپی سے پڑھی جائیں گی۔ انسان فانی ہے لیکن اس کی سدا بہار تحریریں اسے لافانی بنا دیتی ہیں۔ پروفیسر احمد صدیق یقیناً وفات پا گئے ہیں لیکن حضرت مجنوں گورکھپوری زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

(۲۵؍جون ۱۹۸۸ء)

ڈاکٹر سیّد عبداللہ: ایک تعارف

یہ انتہائی مسرت کا موقع ہے کہ اردو کے مجاہد، استادوں کے استاد، اردو فارسی زبان و ادب کے محقق اور نقاد پروفیسر ڈاکٹر سیّد عبداللہ صاحب[1] آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ڈاکٹر عبداللہ نے ساری عمر اردو زبان و ادب کی خدمت میں گذاری ہے اور اپنی بلند پایہ تصانیف سے اردو زبان کو مالا مال کیا ہے۔ ان کی تصانیف ہماری زبان کا وہ قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں آنے والی نسلیں محبت و احترام کے ساتھ سنبھال کر رکھیں گی۔ انھیں دیکھ کر، اُن سے مل کر، ان سے باتیں کر کے نہ صرف زندہ رہنے کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے بلکہ ساری عمر کام اور صرف کام کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ ان کی ذات مجسم خلوص ہے اور اسی خلوص کی وجہ سے ان کی شخصیت میں ایک ایسی دل کشی پیدا ہو گئی ہے کہ ڈاکٹر صاحب سے محبت کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذات جادو اثر، ان کی گفتگو پُرسحر اور ان کی تحریر پُراثر ہے۔ ڈاکٹر صاحب صرف ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ حقیقی ادیبوں کی اس عظیم برادری سے تعلق رکھتے ہیں جن کی تحریروں کے دائرے میں سارے مروجہ علوم آجاتے تھے اور اسی لیے ان کی تحریروں کا دامن وسیع، ان کا نقطۂ نظر فراخ اور ذہنی تناظر پھیلا ہوا ہے۔

ڈاکٹر عبداللہ صاحب اردو کے ان ادیبوں میں سے نہیں ہیں جو لکھتے اردو میں

---

[1] نفاذِ اردو کی آرزو دل میں لیے ڈاکٹر سیّد عبداللہ بھی ۱۴ راگست ۱۹۸۶ء کو اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

ہیں۔ شہرت کی دولت اردو کے وسیلے سے بٹورتے ہیں اور پھر بیوروکریسی کے دلّال بن کر اسی ہنڈیا میں چھید کرتے ہیں جس میں کھا رہے ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ایک سیمینار میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر عبداللہ صاحب فرما رہے تھے۔ وہاں "کچھ ادیبوں" نے جب اپنے مقالے پڑھے تو ان مقالوں کی ایک "اہم" "خصوصیت" تو یہ تھی کہ وہ موضوع سے ہٹے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ حضرات صرف اپنی بات کہنے کے لیے سیمنار کے پلیٹ فارم کو استعمال کر رہے ہیں۔ جن صاحب کا موضوع "سائنسی معاشرے میں ادب کا مقام" تھا انھوں نے اس موضوع پر تو ایسے کہا کہ اپنی بے ربط باتوں میں کہیں کہیں لفظ سائنس شامل کر دیا اور پھر جو کچھ کہنا چاہتے تھے وہ کہنے لگے مثلاً ایک جگہ ایک ہی سانس میں انھوں نے دو باتیں کہیں۔ ایک یہ کہ اردو درباری زبان ہے۔ دوسرے یہ کہ اردو مشکل زبان ہے۔ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اردو، جو آج تک عوام کی زبان رہی ہے اور جس کے ذریعے سارے پاکستان کے مختلف الزبان علاقے ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں، کیسے درباری زبان ہے۔ ممکن ہے کہ ان کے ہاں درباری زبان کے معنی عوامی زبان کے ہوں۔ بہرحال اردو وہ واحد زبان ہے جس کا تعلق اپنی پیدائش سے لے کر آج تک عوام سے رہا ہے۔ انگلستان و امریکہ میں انگریزی عوامی زبان ہے لیکن پاکستان میں انگریزی عوام کی نہیں سرکار دربار کی زبان ہے۔ اس لیے اگر وہ یہ کہتے کہ پاکستان میں انگریزی درباری زبان ہے تو بات سمجھ میں آتی لیکن ان کا مقصد تو ایک نعرہ دینا تھا، ایک لائن دینی تھی تاکہ یہ لائن اختیار کر کے اردو کے نفاذ کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اردو مشکل زبان ہے۔ اگر یہ مشکل زبان ہوتی تو عوام کی زبان نہیں بن سکتی تھی اور چوں کہ یہ عوامی زبان ہے اور رابطے کی زبان ہے اس لیے مشکل کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر مشکل سے مراد یہ تھی کہ اس میں فارسی و عربی کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو مشکل ہیں تو وہ یہ بھول گئے کہ فارسی و عربی ہماری وہ زبانیں ہیں جن سے ہمارا، خواہ ہم کوئی سی بھی زبان بولتے ہوں، مذہبی، تہذیبی و تاریخی رشتہ ہے اور وہ قومیں جو اپنے مذہب، اپنی تہذیب اور اپنی ملی و اجتماعی تاریخ سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہیں تو وہ اپنے حافظے کو کھو بیٹھتی ہیں اور حافظہ کھونے سے جیسے فرد پاگل ہو جاتا ہے اسی طرح حافظہ کھونے کے بعد معاشرہ بھی پاگل ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک میں تقریباً دو ہزار سے کچھ زیادہ بنیادی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جن کی مختلف صورتوں سے تقریباً اسی ہزار الفاظ بن جاتے

ہیں۔ ان دو ہزار بنیادی الفاظ میں سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سے زیادہ الفاظ ایسے ہیں جو اردو زبان میں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے کم و بیش پانچ سو الفاظ ایسے ہیں جو اردو اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں مثلاً سندھی، پنجابی، پشتو، بلوچی، براہوئی وغیرہ میں مشترک ہیں۔ سندھی کو لیجیے۔ سندھی میں تقریباً ۲۵ فی صد الفاظ فارسی زبان کے ہیں۔ کیا اس فطری لسانی اشتراک سے روگردانی کرکے ہم ملک کی یک جہتی اور قومی اتحاد کو نقصان نہیں پہنچائیں گے؟ یہ بات یاد رکھیے کہ اگر اس ملک میں اردو زبان کو جلد نافذ نہ کیا گیا تو ہماری قومی یک جہتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جائے گی اور ایک دن آئے گا اور خدا کرے وہ میری زندگی میں نہ آئے کہ آسمان ہمارے سروں پر گر پڑے گا۔ اردو، جیسا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کل اور پرسوں اپنے لیکچروں میں بتایا، کم مایہ زبان نہیں ہے۔ وہ زبان جس نے میر، غالب، اقبال جیسے شاعر پیدا کیے ہوں، وہ زبان جس نے مولانا محمد علی اور مولانا ظفر علی خان اور عطاء اللہ شاہ بخاری جیسے جادو بیان مقرر پیدا کیے ہوں، وہ زبان جس نے سر سید احمد خان، مولانا محمد حسین آزاد، ابوالکلام آزاد اور شبلی و حالی جیسے نثر نگار پیدا کیے ہوں، وہ زبان جس نے مولانا مودودی، ابوالحسن علی ندوی اور عبدالماجد دریابادی جیسے اردو نثر لکھنے والے پیدا کیے ہوں کیا کم مایہ زبان کہلائے گی؟ اس وقت ہمارا معاشرہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقل اور نور دونوں سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ اچھائی اور برائی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا ملک ہے جہاں دو نظام تعلیم رائج ہوں۔ ایک انگریزی تعلیم کا نظام اور دوسرا اردو تعلیم کا نظام۔ انگریزی تعلیم حاکم پیدا کر رہی ہے۔ ایسے حاکم جو لارڈ میکالے کے تصورات کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جن کے ذہن، جن کی روح، جن کی فکر بدیسی اور سامراجی ہے اور دوسرے اردو تعلیم، جو رعیت اور محکوم پیدا کر رہی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ جو صورت حال پیدا ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ اپنی بہترین صلاحیتوں سے محروم ہو کر اسی راستے پر چل رہا ہے جس پر ہمیں انگریزی سامراج چلا گیا تھا۔ اسی لیے ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ انگریزی و مغربی سامراج کا نمائندہ و ترجمان ہے اور جاہل عوام ہماری تہذیب، ہماری ثقافت اور ہماری روایت کے ترجمان ہیں۔ اسی لیے گذشتہ ۲۵ سال سے ہم مسلسل عدم استحکام

کا شکار رہے ہیں۔ صاحبو! قومیں اس طرح نہیں بنتیں جس طرح اور جس انداز سے ہمارے حکمران ۲۵ سال سے اسے بنا رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ صاحب اسی نقطۂ نظر کے ترجمان اور اسی مقصد کے علمبردار ہیں۔

میں نے ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی کم و بیش ساری تحریریں اور کتابیں پڑھی ہیں۔ ان کی کتابوں اور خیالات سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی جوان ہمتی سے اپنے اندر کام کرنے کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ میں یہاں ان کی علمی و ادبی خدمات کا جائزہ نہیں لے رہا ہوں بلکہ صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر عبداللہ جیسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اب جس مشن کو لے کر وہ اٹھے ہیں، اردو کے نفاذ کے سلسلے میں وہ جو کچھ عملی اقدام کر رہے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم سب ان کا ساتھ دیں، ان کی ہمت بڑھائیں تاکہ وہ اردو کے نفاذ کی تحریک کو منزلِ مقصود تک پہنچا دیں۔ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ احساسِ محرومی کا شکار نہیں ہونا چاہیئے بلکہ حکمران طبقے کو راہِ راست پر لانے اور انھیں شعور و عقل سے متصف کرنے کے لیے اپنی جد و جہد کو جاری رکھنا چاہیئے۔

حضرات، جیسے ہمارے ملک میں قحط سالی کے زمانے میں بارش کے لیے نمازِ استسقا ادا کی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہم گنہ گاروں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرما کر بارش بھیج دیتے ہیں اسی طرح آیئے ہم نفاذِ اردو، ملکی سلامتی اور قومی یک جہتی کے لیے "نمازِ نفاذ" ادا کریں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہم پر جلد ہوش و شعور کی بارش برسائے اور اہلِ اقتدار کا تہذیبی حافظہ واپس آجائے۔

(۱۸ اگست ۱۹۸۲ء)

مولانا اعجاز الحق قدوسی

مولانا اعجاز الحق قدوسیؒ کو میں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ سقوطِ حیدرآباد کے بعد، ۱۹۵۱ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے مجھے یاد ہے کہ پہلی ملاقات میں اپنی شائستگی و خوش گفتاری سے انھوں نے میرا دل موہ لیا تھا۔ باتیں ایسے کرتے جیسے شہد گھول رہے ہوں۔ ٹھنڈے انسان، میٹھی باتیں، مہذب اطوار، شائستہ انداز، خاکسارانہ وضع، عالم فاضل، حلیہ "روایت" کے عین مطابق — خشخشی کھچڑی داڑھی، بڑی چمک دار آنکھیں، کشادہ پیشانی، گٹھا ہوا جسم، بھرے بھرے گال، سر پر گھنے بال مگر حدود کے اندر، قد چھوٹا مگر پست قدی سے بالا، چھوٹی مہری کا پاجامہ، گلا بند شیروانی۔ یہ ان کی ایسی سکہ بند وضع تھی کہ جہاں جاتے دور سے پہچان لیے جاتے۔ پاکستان آئے تو مصنف کی حیثیت سے معروف تھے لیکن ان کا اصل اور رہنے والا کام پاکستان میں شروع ہوا اور گذشتہ تیس اکتیس سال میں انھوں نے اتنا اور اچھا کام کیا کہ بہت کم لکھنے والے اس زمرے میں آتے ہیں۔

پاکستان صوفیوں کی سرزمین ہے۔ انھوں نے اسی موضوع کو اپنایا اور "تذکرہ صوفیائے سندھ" لکھا جو اتنا مقبول ہوا کہ ان کی شہرت سارے پاکستان میں پھیل گئی۔ آدمی ہمت والے ہیں۔ دُھن کے پکے اور مستقل مزاج۔ اس کے بعد پاکستان کے مختلف علاقوں کے صوفیائے کرام پر لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ صوفیائے پنجاب، صوفیائے بنگال، صوفیائے سرحد، شیخ عبدالقدوس

ؒ ۱۹ر فروری ۱۹۸۶ء کو مولانا اعجاز الحق قدوسی نے کراچی میں وفات پائی۔

گنگوہی اور اقبال کے محبوب صوفیا وغیرہ اسی سلسلے کی تصانیف ہیں جو کئی ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی اثناء میں متعدد مضامین بھی لکھے جو مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ فارسی و عربی کی فاضلانہ استعداد رکھتے ہیں۔ "تزک جہانگیری" کا اردو میں ایسا ترجمہ کیا جو نہ صرف مستند مانا جاتا ہے بلکہ اپنے حواشی کی وجہ سے بڑی افادیت کا حامل ہے۔ "سیرالاولیا" کا اردو ترجمہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ کام اور صرف کام مولانا اعجاز الحق قدوسی کی حقیقی زندگی ہے۔ اب تک اردو میں کیا سندھی میں بھی سندھ کی کوئی ایسی تاریخ نہیں تھی جو سارے ادوار کا احاطہ کرتی ہو۔ مولانا نے تین جلدوں میں تاریخ سندھ لکھی جو ان کی دوسری کتابوں کی طرح اتنی مقبول ہوئی کہ اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے اور یونیورسٹی کالجوں کی اعلیٰ جماعتوں میں شاملِ نصاب کی گئی۔

مولانا سے ملیے تو ان کے چہرے کی شگفتگی، ان کے مسکراتے ہونٹ، ان کی بولتی آنکھیں آپ کو کبھی احساس نہیں ہونے دیں گی کہ انھوں نے ساری عمر مفلسی میں بسر کی ہے۔ معمولی آمدنی، بڑا کنبہ، جب یہ صورت ہو تو لکھنے پڑھنے والے انسان کے لیے ہمارے سفاک معاشرے میں سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔ لطف یہ کہ اس کام میں نہ روزی ہے اور نہ عزت و احترام۔ معاشرہ لکھنے پڑھنے والے کو ایک ایسا دیوانہ سمجھتا ہے جو اپنا وقت، اپنی عمر اور اپنی زندگی بے کار گنوا رہا ہے۔ مولانا قدوسی اگر مستند کتابیں لکھنے کے بجائے، اسی لگن کے ساتھ، ٹھیلہ لگاتے تو تیس سال میں زیب النساء اسٹریٹ، انار کلی یا راجہ بازار میں ان کی بڑی سی دکان ہوتی، کار میں کوٹھی سے نکلتے، بچوں کو انگلستان، امریکہ تعلیم کے لیے بھیجتے۔ معاشرے میں، دولت کی وجہ سے، ان کی عزت ہوتی۔ بڑی بڑی دعوتوں میں بلائے جاتے۔ اہلِ سیاست ان سے چندہ لینے آتے اور اقتدار ملنے پر خطابات اور درآمدی پرمٹوں سے نوازتے۔ مولانا کی حالت یہ ہے کہ آج سے اکتیس سال پہلے بھی بے زری کا شکار تھے اور آج بھی۔ پندرہ ہزار صفحات اور پچاس لاکھ سے زیادہ الفاظ لکھ کر، ۷۶، ۷۷ سال کی عمر میں اسی طرح مفلس اور تلاش

معاش میں سرگرداں ہیں اور رعشہ زدہ ہاتھ سے لیاقت آباد (لالوکھیت) کے گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد کمرے میں بیٹھے لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر عبرت ہوتی ہے اور اپنے سفاک معاشرے کے خلاف اعلانِ جہاد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ معاشرہ جہاں اہلِ علم بے عزت ہوں، جہاں ادب و فن گھاس پھوس سے بھی زیادہ بے قیمت ہوں، جہاں اہلِ ادب کے ساتھ بدسلوکی، بے اعتنائی برتی جاتی ہو، جہاں انھیں حقارت سے دیکھا جاتا ہو اور اہلِ اقتدار منافقت کے ساتھ بے فیض تعریف کرتے ہوں وہاں علم و حکمت اور عقل و دانش کے پھول کیسے کھل سکتے ہیں اور سر سید احمد خان، محمد علی جوہر، علامہ اقبال کیسے پیدا ہو سکتے ہیں؟ بہر حال علم و ادب کے شیدائیوں نے ان حالات میں بھی کام کیا ہے اور ان شیدائیوں میں مولانا اعجاز الحق قدوسی کا نام معدودے چند لوگوں میں سے ایک اور محترم نام ہے۔ اب جب کہ عمر کے برگد کو تند اور تیز ہوائیں ہلا رہی ہیں مولانا قدوسی نے اپنی زندگی کے پچھتر سال کی داستان بھی قلم بند کر دی ہے جو دل چسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ قدوسی صاحب نے رعشہ زدہ ہاتھ سے اپنی داستانِ حیات لکھ کر احباب کی اس فرمائش کو پورا کر دیا ہے جس کا تقاضا وہ برسوں سے کر رہے تھے۔

ہر باشعور انسان کی زندگی، اس کے تجربے، اس کی جدوجہد، کش مکش، عمل و ردعمل کی لہریں، روایت و انحراف کے دائرے، عملِ تغیر کی نئی نئی صورتیں اتنا اور ایسا مواد فراہم کرتی ہیں کہ ان سب کا بیان ناول کی طرح دلچسپ بن جاتا ہے۔ اسی لیے خود نوشت سوانح عمری ایسی دل کش تصنیف ہوتی ہے جس میں انسان کے باطن میں چھپی ہوئی روح جلوہ فگن ہوتی ہے اور دل کی آواز رس گھولتی ہے۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی خود نوشت بھی اسی لیے دل چسپ ہے۔ اس تصنیف میں زندگی کے تجربوں کے بیان میں ایک ایسی ادبیت ہے کہ ہر شخص اسے روانی و ذہنی انہماک کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ مولانا کے لکھنے کا اپنا انداز ہے جس میں ادبی شائستگی، مہذب انسان کی نرم مزاجی، ہماری روایتی شعر پرستی اور بات کو میٹھے سلونے لہجے میں کہنے کے تخلیقی عمل نے ایسا رس گھول دیا ہے کہ

ان کی عبارت دل موہ لیتی ہے۔ اس تصنیف کو پڑھ کر ایک حسّاس، باشعور انسان کی زندگی کے وہ پہلو سامنے آجاتے ہیں جو پڑھنے والوں کے لیے سرمۂ بصیرت ہیں۔ اس خود نوشت میں ہماری ملاقات ایسے بہت سے انسانوں سے بھی ہوتی ہے جنھوں نے انسانی رشتوں کو تقدس عطا کیا ہے، جنھوں نے گرتوں کو سہارا دیا ہے جنھوں نے علم و فضل سے معاشرے کو روشنی عطا کی ہے، جنھوں نے بے لوثی و ایثار کا چراغ روشن کر کے انسانیت کو زندہ رکھا ہے، جنھوں نے اس صدی کے بڑے حصّے کی ترجمانی و نمایندگی کی ہے اور جو اب تاریخ کا حصّہ بن گئے ہیں۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی کی یہ سرگذشتِ حیات اسی لیے دل چسپ اور اہم ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی اسے، میری طرح، شوق سے پڑھیں گے۔ [1]

(۲۲ مئی ۱۹۸۱ء)

---

[1] مولانا اعجاز الحق قدوسی مرحوم کی کتاب "میری زندگی کے پچھتر سال" کا پیش لفظ۔

اے کے بروہی کی یاد میں

جناب اے کے بروہی بھی وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موت برحق اور ایک ایسا عمل ہے جس سے ہر ذی روح کو دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن ممتاز ہستیوں کی وفات سے جو خلا پیدا ہوتا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوتا۔ اے کے بروہی مرحوم ایک ایسی ہی ممتاز ہستی تھے جنھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد علم و دانش، فلسفہ و فکر اور قانون و انصاف کے دائرے میں وہ کارنامے انجام دیے کہ ان کا نام اس حوالے سے برسوں تک یاد رہے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جب میں پاکستان آیا تو وہ بحیثیت وکیل عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور شام کو سندھ مُسلم لا کالج میں اصولِ قانون (Jurisprudence) پڑھاتے تھے۔ اس زمانے میں مَیں بھی ایل ایل بی کا طالب علم تھا۔ سندھ مسلم لا کالج اپنی موجودہ عمارت میں منتقل نہیں ہوا تھا بلکہ سندھ مدرسۃ الاسلام ہی میں واقع تھا۔ ہم روز شام کو صدر دروازے سے داخل ہوتے، وسیع و عریض صحن کو پار کرتے اور سامنے کی عمارت میں سیڑھیوں سے اوپر چڑھ جاتے جہاں تھوڑے سے طلبہ کلاسوں سے آتے جاتے یا برآمدے میں کھڑے باتیں کرتے نظر آتے۔ یہ پاکستان کا ابتدائی دور تھا اور زیادہ تر برّصغیر پاک و ہند کے دور دراز گوشوں سے آنے والے نوجوان ہی یہاں دکھائی دیتے تھے۔ مولوی صاحب، خدا ان کی مغفرت فرمائے، پرنسپل تھے۔ نیک دل، نیک نہاد اور نیک سیرت۔ سارا برّصغیر ہندو مسلم فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ کراچی شہر پاکستان کا نیا دارالحکومت تھا۔ قائداعظم اور لیاقت علی خان زندہ تھے۔ مہاجروں کے قافلے کراچی پہنچ رہے تھے اور نہایت محبت و خلوص کی فضا میں ہر شخص ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہو رہا تھا جب معاشرے کے افراد ایک دوسرے کے غم

بانٹ لیتے ہیں تو بڑے سے بڑا سانحہ بھی ہنستے کھیلتے گذر جاتا ہے۔ اس سارے بحران اور قتل و غارت گری کے باوجود ہم سب سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دشمن ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں کرتا تھا۔ اے کے بروہی صاحب اکثر کلاس میں دو قومی نظریے پر روشنی ڈالتے اور برّعظیم پاک و ہند میں ہونے والے واقعات پر اپنے مخصوص انداز سے اظہارِ خیال کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن جب وہ کلاس لے رہے تھے تو اچانک بجلی چلی گئی۔ سارا علاقہ تاریکی میں ڈوب گیا۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ دُور سے ریڈیو پر گانے کی آواز آ رہی تھی۔ بروہی صاحب نے کہا بجلی چلی گئی ہے۔ اسے بھول جایئے۔ اب میں موسیقی کے پس منظر میں نصاب سے گریز کر کے کچھ اور باتیں کروں گا۔ پھر انھوں نے پاکستان اور بھارت کے بارے میں پُرمغز گفتگو کی۔ بجلی آئی تو بھی وہ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ آج جب میں اس گفتگو پر غور کرتا ہوں تو بروہی صاحب تحریکِ پاکستان کے ایک ایسے داعی نظر آتے ہیں جن کی ساری فکر و نظر کا محور پاکستان تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بروہی صاحب ممتاز ہوتے گئے اور ایک ایسی شخصیت کے روپ میں ابھرے جسے قومی سطح کی شخصیت کہا جا سکتا ہے۔ عام انسان "مکان" کی قید میں رہ کر خوش ہوتا ہے لیکن بڑا انسان وہ ہے جو اپنے گاؤں اور اپنے علاقے کی سطح سے اُٹھ کر ملک کی سطح پر ابھرے اور پھر اپنا رشتہ اپنی زمین کے ساتھ ساتھ، ساری زمین سے جوڑ لے۔ بروہی صاحب نے یہی کیا اور ساری عمر اسی لیے وہ پھیلتے، بڑھتے اور بلند ہوتے گئے۔ اس تمام عرصے میں گاہے گاہے ان سے ملاقات ہوتی رہی اور جب کراچی یونی ورسٹی میں طبی نفسیات کا انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا تو اس کے بورڈ پر میں نے اپنے خاص نمایندے کے طور پر ان کا نام تجویز کیا اور ان سے اس تجویز کو قبول کرنے کی درخواست کی جسے انھوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

بروہی صاحب کا تعلق کسی مذہبی یا سیاسی جماعت سے نہیں تھا۔ ان کی ذات اور ان کی دانش و حکمت ان سب چیزوں سے بلند تھی۔ وہ سفیر بھی رہے اور وزیر بھی لیکن ان کی شخصیت عہدوں سے ہمیشہ بلند رہی۔ ان کی حقیقی حیثیت ایک ایسے فلسفی اور دانش ور کی تھی جو اسلام کا شیدائی تھا۔ وہ ملک کے چوٹی کے وکیل تھے اور اس حیثیت میں ان کا نام خود ایک

افسانہ بن گیا تھا۔ قانونی دلائل اور قانون کا علم ان کی شناخت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جس عدالت میں جاتے عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے۔

اسلام کے تعلق سے انھوں نے ہمیشہ عہد حاضر کے ان فلسفیوں کے نظریات پر تنقید کی جو سائنس کو مذہب پر فوقیت دیتے رہے ہیں اور جن میں سگمنڈ فرائڈ، کارل مارکس، ماہر عمرانیات درخیم وغیرہ شامل ہیں۔ بروہی صاحب کا زاویۂ نظر یہ تھا کہ مذہب دراصل عقیدے اور ایمان کا معاملہ ہے جس کے ساتھ صاحب ایمان شب و روز بسر کرتا اور زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ اس عمل سے وہ مذہبی شعور پیدا ہوتا ہے جو زندگی کی تاریکیوں کو روشن کر دیتا ہے۔ بروہی صاحب کا بنیادی نقطۂ نظر یہ تھا کہ انسانی صورت حال ہی کچھ ایسی ہے کہ انسان بغیر مذہب کے بامعنی زندگی نہیں گذار سکتا۔ اس صورت حال میں انسان کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں: آیا وہ سچا مذہب اختیار کرے یا جھوٹا مذہب اختیار کرے۔ مذہب اس کی ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ انسان کی شخصیت کی حقیقی نشو و نما اسی شعور سے پیدا ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے جو مذہبی سچائی سے وابستہ ہے۔ یہ کائنات گہرے اور بامعنی مقصد کے ساتھ پیدا کی گئی ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے سنجیدگی کے ساتھ جد و جہد کرے۔ یہ کائنات ایک مربوط وحدت ہے اور اصولِ توحید کے تحت چل رہی ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان علامات اور اشاروں سے خدا اور اس کی قدرت کو، اس کے جلال و جمال کو، حسن و فطرت کو نہ صرف تاریخ میں بلکہ اپنے باطن کی گہرائیوں میں مسلسل تلاش کرے۔ یہ اس کا مذہبی فریضہ ہے۔ بروہی صاحب کی تقریریں اور تحریریں اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتی ہیں۔

اب بروہی صاحب ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی ساری فلسفیانہ تحریروں کو یکجا کر کے دو جلدوں میں شائع کر دیا جائے اور انھیں طاقِ تاریخ پر رکھ دیا جائے تاکہ تاریخ ان کی اصل قدر و قیمت کا تعین کر کے بروہی صاحب کا درجہ متعین کر سکے۔

(۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۷ء)

میر علی احمد خان تالپور مرحوم

وقت کو کس نے روکا ہے۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آتا ہے اور پل بھر میں گذر جاتا ہے اور یادوں کی خوشبو اور کانٹوں کی چبھن چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ شاید یہی زندگی ہے اور اسی لیے دُنیا — سرائے فانی ہے۔

موت ایک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر علی احمد خان تالپور کی زندگی سے لبریز گفتگو ابھی تازہ تھی کہ پتا چلا آج ان کی وفات کو ایک سال ہوگیا ہے۔ یادوں کی پریاں ایک ایک کر کے تختِ رواں سے اُترنے لگیں اور تیس سال پہلے کی ایک تصویر سامنے آگئی۔ اب تو کراچی کچھ سے کچھ ہوگیا ہے۔ وہ جگہ جہاں آج شیرٹن ہوٹل نظر آتا ہے، وہاں پہلے پتھر کی بنی ہوئی اونچے گنبد والی ایک شاندار عمارت تھی جس کے وسیع و عریض مرغزار جون جولائی کی تپتی ہوئی سہ پہر میں قلب و نظر کو ٹھنڈک بہم پہنچاتے تھے۔ یہ پیلس ہوٹل کی عمارت تھی۔ ہم چند ادیب گاہے ماہے اُدھر بھی جا نکلتے اور راہداری میں پڑی ہوئی کرسیوں پر ایک وجیہہ انسان کو اکثر وہاں دیکھتے جس کے ارد گرد چند دوست احباب بیٹھے ہوتے اور وہ بلند آواز میں گفتگو کر رہے ہوتے۔ ایک دن تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ میر علی احمد خان تالپور صاحب ہیں جو کچھ عرصے پہلے تک حکومت مغربی پاکستان کے وزیر با تدبیر تھے۔ فراخ دل، فراخ پیشانی، روشن آنکھوں میں ذہانت و دانائی کی چمک، طویل قامت، چہرے سے شرافت و تدبر نمایاں، متحمل مزاج، اور باسلیقہ۔ خوش لباس، خوش مزاج۔ بات کرتے تو جوہر کھلتے۔ اردو فارسی کے برمحل اشعار

ایسی بے ساختگی سے پڑھتے کہ گفتگو میں نکھار آجاتا اور بات سیدھی دل میں اتر جاتی۔ ان کی سادگی، وسیع المشربی، وطن کی محبت، وسیع مطالعہ، نئی نئی کتابوں کی باتیں ــــ مضامین نو کے انبار لگ جاتے۔ مسائلِ حاضرہ پر ایسے گفتگو کرتے کہ سننے والے کا ذہن روشن ہو جاتا۔ ساری گفتگو مصلحت سے پاک اور بے لاگ ہوتی۔ کوئی اختلاف کرتا تو توجہ سے سنتے اور پھر اس کا جواب دیتے۔ بعض دفعہ تو اسی عمل میں گھنٹوں گذر جاتے۔ اب ایسے لوگ کم ہو گئے ہیں جو مسائل کو غور و فکر اور تبادلۂ خیال سے صاف کریں اور نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں کا ذہن بھی نکھار دیں۔ میں نے ایسے لوگ کم دیکھے ہیں جن کا مطالعہ اتنا وسیع ہو جتنا میر علی احمد تالپور صاحب کا تھا۔ کتاب پڑھنے اور کتاب جمع کرنے کا شوق ایسا تھا کہ آج بھی ان کا کتب خانہ دیکھنے اور دکھانے کی چیز ہے۔ ایک دن گیارہ بجے پیر حسام الدین راشدی مرحوم اور میں دونوں ان کے گھر گئے۔ میر صاحب نے اندر ہی بلا لیا۔ بستر پر ڈھیر ساری کتابیں رکھی تھیں اور میر صاحب کروٹ سے لیٹے ہوئے کتاب پڑھ کر دنیا کی سیر کر رہے تھے ــــ دنیا کی سیر میر کی صحبت میں ہو گئی۔ میں جب بھی ملا انھیں کتابوں کے اندر دیکھا۔ میر صاحب نے جو کچھ علم حاصل کیا اپنے ذوق اور مطالعہ سے کیا۔ انھیں فارسی، اردو، انگریزی اور سندھی پر دسترس حاصل تھی۔ کثرتِ مطالعہ نے ان کے ذہن کو روشن اور دل کو فراخ کر دیا تھا اسی لیے وہ دوسرے سیاست دانوں سے بالکل مختلف تھے۔ سازشوں اور جوڑ توڑ سے پاک۔

ایک خاص بات میر صاحب میں یہ تھی کہ وہ کچے کانوں کے نہ تھے۔ جب آدمی اقتدار میں ہوتا ہے تو اس کے حوالی موالی اپنی پسند و ناپسند اور ضرورت و مصلحت کے مطابق صاحبِ اختیار کے کان بھرتے رہتے ہیں اور اس طرح اصل حقائق کو اس سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔ جناب میر علی احمد تالپور کہا کرتے تھے کہ اقتدار کے دوران ان لوگوں کو پہچاننا بہت ضروری ہوتا ہے تاکہ حقائق اور سچائیاں نظروں سے پوشیدہ نہ ہوں۔ میر صاحب سیاست دان ہوتے ہوئے بھی اسی لیے صاف گو اور بے باک انسان تھے۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی۔ سندھ میں پی پی پی کی مقبولیت میں ان کا بڑا

ہاتھ تھا لیکن جب یہ جماعت برسر اقتدار آئی تو میر صاحب دو چار سال کے بعد ہی اس سے الگ ہو گئے۔ میر صاحب قومی اسمبلی کے ان چار ارکین میں سے ایک تھے جنھوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر اصول کی بنیاد پر دستخط نہیں کیے اور جب پانی سر سے گذرنے لگا تو "پاکستان قومی اتحاد" میں سرگرم عمل ہو کر ایسی تحریک چلائی جو کچھ ہی عرصے میں کامیابی سے ہم کنار ہو گئی۔

میر صاحب کی پُرعظمت شخصیت کا ایک پہلو یہ تھا کہ وہ متحمل مزاج تھے اور ان کے مزاج کا نمایاں وصف یہ تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ والیہ وسلم کی ایسی سنت ہے کہ جس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔ اس سے معاشرہ سُدھرتا ہے اور انسانیت جنم لیتی ہے۔ میں نے میر صاحب کو ہمیشہ یہی کرتے دیکھا۔ غریبوں کے ہمدرد، کم زوروں کے حامی، دکھ درد میں سب کے شریک، شرافت و انسانیت کے پیکر، اصولوں پر سنگِ خارا لیکن محبت و اخلاص میں —— ریشم کی طرح نرم' —— میر صاحب یقیناً جنتی تھے۔

میر صاحب سے میری آخری ملاقات دسمبر ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ وہ لندن جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ہشاش بشاش تھے۔ حسبِ معمول حکمت و دانش کی، علم و ادب کی، سیاست و تدبر کی اور نئی کتابوں کی باتیں کرتے رہے۔

میں نے میر صاحب کو کبھی مایوس نہیں دیکھا۔ اس شام انھوں نے بہت دلچسپ باتیں کیں۔ اپنے بچپن کی باتیں کرتے رہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اور بعد کے واقعات بیان کرتے رہے۔ مختلف نامور شخصیات کے بارے میں پُرلطف قصے سُناتے رہے۔ میں نے کہا میر صاحب! اگر آپ اپنی خود نوشت لکھ دیں تو گذشتہ تین چوتھائی صدی کی تہذیبی، علمی، سیاسی اور معاشرتی تاریخ محفوظ ہو جائے گی۔ میر صاحب نے آمادگی کا اظہار کیا۔ میں نے کہا کل میں آپ کو دو عمدہ قسم کے رجسٹر بھیجوں گا۔ آپ روز ناشتے کے بعد کسی کو املا کرا دیجیے۔ چند ماہ میں یہ سب باتیں محفوظ ہو جائیں گی۔ دوسرے دن میں نے رجسٹر بھیج دیئے۔ ایک ہفتے بعد فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ لندن چلے گئے ہیں اور

پھر تین مہینے بعد جب ان کا جسدِ خاکی واپس آیا تو میر صاحب وہاں جا چکے تھے جہاں سے جاکر کوئی واپس نہیں آتا

قابلِ سیر نہیں بس کہ جہانِ گذراں
جو گیا یاں سے کبھی اس نے نہ پھر کر دیکھا
(مصحفی)

میر صاحب جیسی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ ہمیں ان کی یادگار قائم کرنی چاہیے۔ ان کے خاندانی نوادر، کتابیں اور سب اشیاء کو محفوظ کر کے ان کے نام پر بنائے ہوئے ادارہ میں محفوظ کر دینی چاہئیں تاکہ صدقۂ جاریہ کا ثواب ہم بھی حاصل کر سکیں۔ اپنے قومی محسنوں کو یاد کرنے اور رکھنے کا یہی سب سے اچھا طریقہ ہے۔

(۷ر اپریل ۱۹۸۸ء)

صادقین کے بارے میں

۱۰ر فروری ۱۹۸۷ء منگل کے دن صبح ہی صبح سید صادقین احمد نقوی، جنھیں دنیا زمانہ صادقین کے نام سے جانتا تھا، اللہ کو پیارے ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرنا ایک فطری عمل ہے اور موت زندگی کی سب سے بڑی سفاک حقیقت ہے لیکن صادقین کی وفات کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ دنیائے فن سے ایک ایسا فن کار رخصت ہو گیا تھا جو نہ صرف ممتاز و منفرد بلکہ بے بدل تھا۔ ایسے جوہر کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں۔ اخبارات چھپ چکے تھے لیکن صادقین کی وفات کی خبر آگ کی طرح آناً فاناً میں پھیل گئی اور نماز جنازہ میں کم وبیش ہر وہ شخص شامل تھا جو صادقین کو جانتا یا اس کے فن سے آشنا تھا۔ میر کا یہ شعر بار بار میرے ذہن کے دریچے سے جھانک رہا تھا:

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

صادقین میرے دوست تھے۔ ایسے دوست کہ جو ایک دوسرے کو پہچانتے ہیں اور دلوں میں محبت کی خوشبوئیں بسائے جب بھی ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اُن کا وجود محبت و خلوص کی ابدی خوشبو سے مہک اُٹھتا ہے اور ملنے والے ایسے تازہ دم ہو جاتے ہیں جیسے ابھی ابھی غسل کیا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ صادقین سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۵۔۵۶ء میں اسپین کے سابق سفیر اور شہید سہروردی کے بڑے بھائی مرحوم شاہد سہروردی کے کمرے میں جہانگیر روڈ پر واقع ایک کوٹھی کی ذیل داری میں ہوئی تھی۔ انتیس تیس سال کی عمر، دبلا پتلا جسم، ململ کا کڑھا ہوا کُرتا، چوڑے پائنچوں کا پائجامہ، آنکھوں پر عینک، ستواں ناک، چھوٹی چھوٹی

سی کتروں مونچھیں، ڈاڑھی صاف، کھلتا ہوا گندمی رنگ، آواز میں کراراپن، تیل سے چمکتے ہوئے سیاہ بال، موزوں قد۔ شاہد سہروردی صاحب نے، جو ادب اور آرٹ کے عالم، انگریزی کے شاعر، تہذیب و شائستگی کا نمونہ تھے، میرا تعارف کرایا۔ اس زمانے میں ان کے فن کی شہرت تیزی سے پھیل رہی تھی اور وہ ایک ہونہار مصوّر کی حیثیت سے فن کے افق پر نمودار ہو رہے تھے۔ کچھ دیر رک رک کر باتیں ہوئیں اور پھر وہ چلے گئے۔ کوئی دو ہفتے بعد ایک دن میرے پاس دفتر آئے اور کوئی ڈھائی تین گھنٹے بیٹھے رہے۔ پھر آنے جانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ میرے اور ان کے درمیان خلوص و محبت کی جو شمع روشن ہوئی تھی وہ مرتے دم تک باقی رہی۔ کراچی آتے تو ایک بار ٹیلی فون ضرور کرتے۔ ایک دن ملاقات ہوئی۔ دل چسپ باتیں ہوئیں۔ کہنے لگے جوش صاحب میری نمائش میں آئے تھے۔ میں نے پوچھا حضرت کیسی رہی۔ کہنے لگے بھئی سمجھ میں نہیں آئیں۔ نقیبر نے کہا جوش صاحب! جب میں دس برس کا تھا تو آپ کی شاعری بھی میری سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ صادقین نہایت ذہین انسان تھے۔ خوب صورت باتیں کرتے تھے۔ ایسی دلربا باتیں کہ ذرا سی دیر میں مرکزِ توجہ بن جاتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں وہ پیرس میں تھے۔ میں بھی اُس زمانے میں کوئی دو مہینے پیرس میں رہا۔ روز ملاقات ہوتی۔ "ڑیں ڑر" کیفے میں ہم گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ دوپہر کو کھانا عام طور پر ساتھ کھاتے۔ دُنیا زمانے کی باتیں ہوتیں۔ اچھی بھی بُری بھی۔ کاغذ اور پنسل، قلم ان کے ساتھ ہوتے۔ کسی کا چہرہ پسند آیا۔ ذرا سی دیر میں اس کی تصویر بنا ڈالی۔ اکثر یہ ہوتا کہ وہ جس کی تصویر بن رہی ہوتی خود اُٹھ کر ہماری میز پر آجاتا اور اسکیچ دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا۔ دس بارہ دفعہ ایسا ہوا کہ وہ خاکہ لے جاتا اور سو پچاس ڈالر زبردستی صادقین کے سامنے رکھ جاتا۔ صادقین منع کرتے مگر یورپ و امریکہ کا یہی دستور ہے۔ ہماری طرح نہیں کہ فن کار ساری عمر بھوکا مرتا رہتا ہے اور فن کے پرستار، زرداری کے باوجود، تصویریں مفت حاصل کرنے کی سبیل نکالتے اور اسی بیماری میں مبتلا رہتے ہیں۔ پیرس میں میں نے صادقین کو پہلی بار کسی مالی بحران میں مبتلا نہیں دیکھا۔

صادقین کے مزاج میں ایک درویشی تھی۔ ایسی درویشی جو ہر فن کار اور ادیب و شاعر میں ہونی چاہیے۔ فن ان کا اوڑھنا بچھونا اور ان کی زندگی کی منزل تھا۔ ساری عمر اسی میں لگا دی۔

نہ شادی بیاہ کے جھنجھٹ میں پڑے اور نہ گھر بار کے بکھیڑوں میں اُلجھے۔ اچھی کامیاب زندگی گذاری اور زندگی کو اپنی مرضی کے مطابق بسر کیا۔ اور اس طور بسر کیا کہ کوئی زر دار، صاحبِ ثروت ایسی بھرپور، دلچسپ اور بامعنی زندگی کیا بسر کرتا۔ وہ ہر دم فن کی دنیا میں رہتے تھے اور ہر لمحہ فن کی خوشبوؤں میں بسی دلہن کے ساتھ ریاض کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنا کام صادقین نے کیا نہ صرف پاکستان میں بلکہ دنیا میں بہت کم معاصر فن کاروں نے اتنا کام کیا ہے۔ انتھک محنت کے بغیر نہ فن کی دُنیا آباد ہو سکتی ہے اور نہ خونِ جگر کی نمود ہو سکتی ہے۔ صادقین نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ عوام، مظلوم عوام، انسان کی عظمت، منافقت اور جبر و استحصال سے بغاوت ان کی مصوری کے عام موضوعات تھے۔ ان کا ایک کمال یہ تھا کہ انھوں نے خطاطی کے ذریعے فن کو خواص و عوام تک پہنچا دیا۔ اسی لیے پاکستان کا کوئی دوسرا فن کار ایسا نہیں ہے جسے خواص و عوام دونوں اس طور پر جانتے، پہچانتے اور چاہتے ہوں۔

اس وقت موقع نہیں ہے کہ میں تفصیل سے صادقین یا ان کے فن کے بارے میں کچھ بات کروں۔ یادوں کا ایک سیلاب ہے جو اُمڈا آتا ہے۔ اس وقت تو میں میرؔ کے اس شعر پر اپنی بات ختم کرتا ہوں:

وے لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

(۱۷ر مارچ ۱۹۸۷ء)

محمد نقوش کے بارے میں

ہر نسل کا نوجوان خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر سے وہ اپنے راستے اور اپنی منزلیں مقرر کرتا ہے۔ میری نسل کا نوجوان جب خواب دیکھتا تھا تو اس میں بڑا مصنف، بڑا شاعر، بڑا صحافی، بڑا مُوجد یا علم حاصل کر کے بڑا آدمی بننے کی خواہش مضمر ہوتی تھی اور وہ نوجوان خود کو اپنے خواب کی تعبیر کے لیے وقف کر دیتا تھا۔ یہ وہ خواب تھے جن سے معاشرے میں بڑے آدمی پیدا ہوتے تھے اور معاشرہ ہر دم سرسبز و شاداب رہتا تھا۔ آج کا نوجوان بھی بڑا آدمی بننے کے خواب دیکھتا ہے لیکن ان خوابوں میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت سمیٹنے کی آرزو شامل ہوتی ہے۔ آسائش سے معمور زندگی، اور دولت کی ریل پیل، یہی آج بڑے آدمی کی پہچان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں آسائش سے معمور بڑے گھروں اور کاروں کی تو کثرت ہے لیکن بڑے آدمیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ محمد طفیل مرحوم نے بھی اپنے نسل کے خوابوں کے عین مطابق، بڑا مدیر اور بڑا ناشر بننے کا خواب دیکھا اور ساری عمر اسی خواب کی تعبیر میں لگا دی اور پھر یہ ہوا کہ محمد طفیل کو سارے دنیا زمانے نے اپنے دور کا سب سے بڑا مدیر تسلیم کر لیا۔ یہی ان کا کارنامہ ہے اور اسی کارنامے سے ان کا نام نہ صرف آج روشن ہے بلکہ آنے والے زمانوں میں بھی روشن رہے گا۔

محمد طفیل کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ نوجوان تھے۔ سیدھے سادے، خاموش طبع، کم آمیز لیکن ملنسار، دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے غم گسار، مولانا اسمٰعیل میرٹھی کی نظم "پن چکی" کی طرح دن رات کام میں لگے رہنے والے۔ دھن کے پورے۔

کام کے پکے، نقوش کے مرشد بھی اور نقوش کے مرید بھی۔ یہی کام تھا۔ یہی مقصدِ حیات تھا۔
کثرتِ ذکر سے دونوں ایک ہو کر ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ محمد طفیل کا ذکر کیجیے تو وہ
محمد نقوش کا ذکر ہو گا، محمد نقوش کا ذکر کیجیے تو وہ محمد طفیل کا ذکر ہو گا۔ تاکس نہ گوید بعد
ازیں من دیگرم تو دیگری۔ اسی لیے دونوں اسی طرح لازم و ملزوم ہیں جس طرح میاں
بشیر احمد اور ہمایوں، مولانا صلاح الدین احمد اور ادبی دنیا، نیاز فتح پوری اور نگار، شاہد احمد دہلوی اور ساقی
حکیم یوسف اور نیرنگِ خیال۔ یہ ادبی جرائد کا عظیم دور تھا اور محمد طفیل اور نقوش اسی روایات کی آخری کڑی تھے۔
"نقوش" نے کسی فکری یا ادبی تحریک کو جنم نہیں دیا لیکن اردو ادب کے بہترین شہ پاروں
کو گھر گھر پہنچا کر فروغِ ادب کی عظیم خدمت انجام دی۔ اس میں معاصر ادب بھی شامل ہے اور کلاسیکی
ادب بھی۔ نقوش کی مقبولیت کا راز یہ تھا کہ محمد طفیل اسے معیاری مواد
سے مزین کر کے حُسنِ ترتیب اور ذوقِ جمال کے ساتھ اس طرح پیش کرتے کہ جو پڑھتا داد
دیتا اور پھر سنبھال کر محفوظ کر لیتا۔ اسی لیے نقوش وہ واحد رسالہ تھا جو پڑھا بھی جاتا تھا اور
سینت کر، سنبھال کر رکھا بھی جاتا تھا۔ نقوش کی شہرت کا راز یہ بھی تھا کہ محمد طفیل نے
ایسے معیاری اور بلند پایہ خاص نمبر شائع کیے کہ جو مواد کے اعتبار سے منفرد اور حُسنِ ترتیب
کے اعتبار سے بے مثل تھے اور جن کی مجموعی تعداد ۱۴۳ ہے۔ محمد طفیل معیاری ادب کا
اتنا بڑا گلاس لبالب بھر کر پیش کرتے کہ قارئینِ ادب کے ذوق کی پوری طرح آسودگی
ہو جاتی۔ غزل نمبر، شخصیات نمبر، منٹو نمبر، مکاتیب نمبر، شوکت تھانوی نمبر، آپ بیتی
نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، میر نمبر اور آخر میں رسول نمبر وہ خاص شمارے ہیں، جو
اب ہماری ادبی تاریخ کا حصہ ہیں اور جن کا ڈنکا سارے برعظیم میں بج رہا ہے۔

محمد طفیل مرحوم نے نقوش میں بلند پایہ تحقیقی مقالات شائع کر کے جدید اور
قدیم کی حد فاصل کو پاٹ دیا۔ اس سے ایک طرف جدید تحقیقات کی روشنی نے علم و ادب
کے حلقوں کو منور کیا اور دوسری طرف خود نقوش نئی تحقیق کا حوالہ بن گیا۔ وقت کے ساتھ
ساتھ یہ حوالے پھیلتے اور بڑھتے جائیں گے اور انھیں حوالوں کے تعلق سے نقوش
کی اہمیت بھی قائم و دائم رہے گی۔ نقوش اور دوسرے علمی و ادبی رسالوں میں یہی بنیاد

فرق ہے اور اسی لیے نقوش نئے اور پرانے دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا اور مقبول رہے گا۔

محمد طفیل کی شخصیت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ کم گو تھے۔ یہ خصوصیت اس نسل کے دور کے ادیبوں کی ایک عام مشترک خصوصیت تھی۔ اس دور کے ادیب کم بولتے اور زیادہ لکھتے تھے۔ آج کے دور کے ادیب کی مشترک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام طور پر زیادہ بولتے اور کم لکھتے ہیں۔ زیادہ بولنے میں فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ کے ہاتھ رنگ چوکھا آتا ہے اور کم بولنے اور زیادہ لکھنے میں نقصان یہ ہے کہ فائدے کا پتا بہت دیر میں چلتا ہے۔ محمد طفیل کے نفع نقصان کا پتا بھی اسی لیے دیر سے چلا اور اسی لیے وہ مرنے کے بعد آج بھی زندہ ہیں۔

محمد طفیل کے نام، کام اور شخصیت کے ساتھ مثنوی مولانا جامی کی وہ حکایتِ مجنوں یاد آتی ہے جس میں ایک صحرانورد نے مجنوں کو تنہا بیٹھے اور اپنی انگلیوں کے قلم سے " ریت پر کچھ لکھتے ہوئے دیکھا " صحرانورد نے مجنوں سے پوچھا کہ یہ خط کس کے نام لکھ رہے ہو۔ ابھی تیز ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور سب کچھ مٹا کر رکھ دے گا۔ مجنوں نے جواب دیا :

گفت شرحِ حسنِ لیلےٰ می دہم
خاطرِ خود را تسلی می دہم
تا چشیدم جرعۂ از جامِ او
عشقبازی می کنم با نامِ او

یہی سچے عاشق کی پہچان ہے اور محمد طفیل، خدا انھیں کروٹ کروٹ چین دے، ایک ایسے ہی عاشق تھے جو ساری عمر اپنے خوابوں کو حقیقت

میں بدلنے کے لیے ادب سے عشق بازی کرتے رہے۔ ان کے کام کی خوشبو آج بھی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اور ہمارے مشامِ جاں کو معطر کیے ہوئے ہے۔ شاید جرأت نے یہ شعر ایسے ہی عاشقوں کے لیے کہا تھا:

جو مریض تھا پڑا جاں بہ لب خبر اور کچھ نہیں اس کی اب
مگر اتنا کہتے ہیں لوگ سب کہ بڑا یہ نیک خصال تھا

(۶ر جولائی ۱۹۸۷ء)

مولانا ماہر القادری

انسان فانی ہے اور اسے ایک نہ ایک دن اس دُنیا سے رخصت ہونا ہے لیکن اس کے کام اور اس کے کارنامے برسوں بلکہ صدیوں تک زندہ و باقی رہتے ہیں۔ گویا تخلیق کم فانی یا لافانی ہوتی ہے اور یہی وہ حقیقی معیار ہے جس پر ہمیں کسی شخص کی بڑائی کو پرکھنا چاہیے۔ اس دور میں جب علم و ادب اور فن و ہنر بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں اور انسان کی بڑائی صرف روپے کی ریل پیل سے ناپی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم، ادب و فن، معاشرتی اقدار کے عدم توازن کا شکار ہو کر، پس پشت چلے گئے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے رہ گئے ہیں جو اپنی زندگی کا مقصد علم و ادب کو قرار دیتے ہیں۔ اسی منفی رجحان کی وجہ سے ادب و فن کے نام پر اب وہ کام سامنے آ رہے ہیں جن کا مقصد تخلیق کے بجائے صرف حصولِ زر ہے۔ آج پورا معاشرہ حُبِ زر کی شدید بیماری میں مبتلا ہے اور یہ بیماری اب کم و بیش ہر طبقے میں پھیل گئی ہے۔ آج کے اس معیار سے دیکھیے تو مولانا ماہر القادری صاحبِ زر نہیں تھے اور اس لیے بڑے آدمی بھی نہیں تھے لیکن آخر کیا وجہ ہے کہ اس کے باوجود ہم ان کی یاد منانے کے لیے یہ سیمی نار منعقد کر رہے ہیں۔ سیمی نار تو بڑے لوگوں کے لیے منعقد کیا جاتا ہے؟ اس سیمی نار کے انعقاد سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ معاشرے میں ایک طبقہ آج بھی ایسا موجود ہے جو زر پرستی کے رجحان کو معیارِ زندگی تسلیم نہیں کرتا بلکہ تخلیقِ فن کو عظمت کی کسوٹی سمجھتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس کی وجہ سے علم و ادب ابھی باقی و زندہ ہیں۔

علم اخلاق کے جوہر کو جلا دیتا ہے اور جہل کے پردے کو اٹھا دیتا ہے۔ اسی سے

عظمتِ انسان متعین ہوتی ہے۔ مولانا ماہرالقادری اسی لیے بڑے آدمی تھے۔ انھوں نے ساری عمر علم وادب کی خدمت میں گذاری اور اپنی ساری صلاحیتوں کو جہل کے پردے اٹھانے اور اخلاق کے جوہر کو جلادینے پر صَرف کر دیا۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی بیباکی کے ساتھ سچائی کا اظہار تھی۔ وہ جس بات کو حق جانتے برملا اس کا اظہار کر دیتے۔ اسی وجہ سے وہ ہر محفل میں اکثر بحثوں میں اُلجھے نظر آتے۔ مولانا سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی اور شعر وادب کی محفلوں میں اکثر ہوتی رہی۔ جب ملتے محبت و خلوص سے ملتے اور ہمیشہ پوچھتے: "اب کون سی کتاب پر کام ہو رہا ہے؟" "فاران" پابندی سے مجھے بھجواتے، کبھی دستی، کبھی ڈاک سے۔ خط لکھنے میں بڑے ماہر تھے۔ پابندی سے جواب دیتے۔ ایک دفعہ کسی محفل میں زبان کے مسئلے پر مجھ سے اُلجھ پڑے۔ میں نے عرض کیا کہ جب بات بڑھ جائے تو ضروری ہے کہ مستند کتابوں سے رجوع کیا جائے تاکہ بات صاف ہو جائے۔ کہنے لگے کہ ہاں یہ بات آپ نے ٹھیک کہی۔ میں نے گھر آکر لغات دیکھیں اور اتفاق سے میری بات درست نکلی۔ مولانا کا دوسرے دن فون آیا۔ کہنے لگے کہ لغات میں تو وہی لکھا ہے جو آپ کہہ رہے تھے لیکن بات اس کے علاوہ بھی ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جنھیں زبان کے نکات و رموز پر اتنی قدرت حاصل ہو۔ زبان کے سلسلے میں سینکڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ان کی تحریریں آج بھی مختلف رسائل و جرائد میں بکھری ہوئی ہیں جنھیں یکجا و مرتب کرنے کی فوری ضرورت ہے۔ "اُردو لغت" کے سلسلے میں جس جانفشانی و محنت سے زبان و معنی کے نکات کو بغیر کسی معاوضے کے بیان کیا اس کی داد ہمیشہ دی جائے گی۔

مولانا کی فکر و شخصیت کی کئی جہتیں تھیں۔ وہ شاعر تھے اور اپنے دور کے نامور شاعر تھے جن کا کلام نہ صرف ہر اچھے رسالے میں شائع ہوتا تھا بلکہ کوئی بڑا مشاعرہ ان کے بغیر بڑا ہونے سے کچھ کم رہ جاتا تھا۔ وہ جانِ مشاعرہ بھی تھے اور جانِ محفل بھی۔ اپنے فقروں، لطیفوں اور دلچسپ انداز سے محفل کو زعفران زار بنائے رہتے تھے۔ جیسی محفل ہوتی ویسی ہی غزل یا اشعار پڑھتے۔ ان کے خریطۂ کلام میں ہر قسم کا مال تھا جسے وہ جب

طلب تقسیم کرتے رہتے۔ ان کی شخصیت کی دوسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک ممتاز ماہرِ زبان تھے۔ الفاظ و محاورات کے معنی و مفہوم کے لطیف و باریک پردوں کو وہ جس طرح اُٹھاتے تھے بہت کم لوگوں کو یہ سلیقہ و شعور حاصل ہے۔ تیسری جہت یہ تھی کہ وہ ایک باسلیقہ مدیر تھے۔ ۱۹۴۹ء سے وفات (مئی ۱۹۷۸ء) تک وہ باقاعدگی سے فاران نکالتے رہے جو ان کی وفات کے بعد اب بھی مولانا اسمٰعیل احمد مینائی کی زیرِ ادارت شائع ہو رہا ہے۔ اس رسالے نے دو قابلِ ذکر کام کیے۔ ایک یہ کہ صحتِ زبان کے مسئلے کا لکھنے پڑھنے والوں میں شعور پیدا کیا۔ دوسرے ادب و اخلاق کے رشتے کو گہرا اور استوار کیا۔ مولانا ماہر کا مقصدِ ادب یہ تھا کہ ادب اخلاق کے جوہر کو جلا دیتا اور پاکیزگیِ فکر و خیال کو پروان چڑھاتا ہے۔ دین ان کی سیاست تھی اور یہی وجہ ہے کہ فکری سطح پر وہ مولانا مودودی مرحوم سے بہت متاثر تھے۔ اسی اندازِ نظر سے فاران کا مزاج بنا تھا۔

مولانا ماہرالقادری عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھے۔ اس کا اظہار کثرت سے اور بار بار ان کی شاعری میں ہوا ہے۔ ان کی نعتیں ہم عام طور پر محفلِ میلاد میں آج بھی سنتے ہیں اور اس طرح سنتے ہیں کہ ہمارے دلوں کی تاریکی نور کی حرارت سے دور ہو کر آنسوؤں کی صورت میں بہہ جاتی ہے۔ ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کا اخلاص تھا۔ وہ ایک سمجھ دار مخلص انسان تھے۔ ایک خلوص بے شعور ہوتا ہے اور ایک خلوص باشعور ہوتا ہے۔ بے شعور خلوص بارش کے پانی کی طرح نالیوں میں بہہ کر ضائع ہو جاتا ہے اور باشعور خلوص انسان و انسانیت کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ماہرالقادری نے انسان و انسانیت کی قدروں کو اس دورِ زر پرستی میں بھی پروان چڑھایا۔ مولانا کے دو شعر ہیں :

خوف ہو یا لالچ ہو پیارے ! موت ہے یہ فن کاروں کی
دیس کی دُھن میں گانے والو ! یہ دُھن تو درباری ہے

اہلِ قلم کا بک جانا ہے علم و ادب کی رسوائی
سچی بات کہے گا کیا وہ جس کی زباں سرکاری ہے

یہی وہ اخلاص ہے جس نے ان کے قلم، ان کی زبان میں بے باکیٔ اظہار کی نوک کو تیز کر دیا تھا اور یہی وہ اخلاص تھا جس کی گرمی سے سننے والوں کے دل پگھل کر آب ہو جاتے تھے۔

آج بہت کم لوگوں کو یہ بات شاید یاد ہے کہ مولانا ماہرالقادری افسانہ نگار اور ناول نگار بھی تھے اور ان کے کئی ناول اور افسانوں کے مجموعے شائع ہو کر عام ہوئے تھے۔ انگڑائی (۱۹۳۶ء)، طلسم حیات (۱۹۳۷ء)، محبت بھرے خطوط (۱۹۴۱ء) حسن و شباب (۱۹۴۵ء)، پیپلنے (۱۹۴۶ء)، نگینے (۱۹۵۳ء) ان کے افسانوں کے چھ مطبوعہ مجموعے ہیں۔ جب میں جوان تھی (۱۹۴۲ء)، کردار (۱۹۴۲ء) اور کانچ ہاؤس (۱۹۴۸ء) ان کے تین ناول ہیں۔ فکشن کی یہ سب کتابیں خالص رومانوی انداز کی ہیں۔ کاروانِ حجاز ان کا ایک سفرنامہ ہے۔

مولانا ماہرالقادری کی شاعری کے بھی کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں ظہور قدسی (۱۹۳۶ء)، نعتیہ کلام، محسوسات ماہر (۱۹۴۱ء)، نغمات ماہر (۱۹۴۳ء)، جذبات ماہر (۱۹۴۴ء)، ذکر جمیل (۱۹۴۴ء)، فردوس (۱۹۵۵ء) شامل ہیں۔ ابھی ان کا بہت سا کلام ایسا ہے جو کتابی صورت میں شائع کیا جانا چاہیئے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک طویل مثنوی انھوں نے کراچی کو موضوع بنا کر لکھی تھی اور اس کی ایک نقل مجھے بھی نیا دور میں اشاعت کے لیے بھیجی تھی۔ آج ان کی شاعری کے مجموعے عام طور پر نہیں ملتے۔ بہتر یہ ہے کہ "کلیات ماہرالقادری" کے نام سے ان کے سارے کلام کو یکجا کر کے زمانے کی گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ کام مداحانِ ماہر کو فوراً کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان کی نثری تحریروں، بالخصوص ان مضامین کو جو زبان کے تعلق سے لکھے گئے ہیں، جمع کر کے شائع کرنا چاہیے۔ مرحوم ادباء و شعراء کے بارے میں جو تحریریں انھوں نے فاران میں لکھیں وہ تو کتابی صورت میں کچھ عرصہ پہلے شائع ہو گئی ہیں۔ اب ان کی دوسری تحریروں کی طرف فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مولانا ماہر اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ کراچی کی ادبی محفلیں سونی ہو گئی ہیں۔ مشاعرے اب بے رونق ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان محفلوں کو دوبارہ آباد کرنے

کے لیے ضروری ہے کہ ہم مولانا ماہر کے مدرسۂ فکر کو آباد کریں، اس کی ترویج واشاعت کریں اور ادب وفن کی تخلیق کی اہمیت کو دوبارہ اپنے معاشرے میں قائم کریں۔ تخلیق ہی سے معاشرے نمو پاتے اور زندہ رہتے ہیں ورنہ جنگل بن کر دشت وصحرا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(۱۶ر جولائی ۱۹۸۶ء)

ابراہیم جلیس

تاریخ اور دن تو یاد نہیں البتہ اتنا یاد ہے کہ ۱۹۵۰ء کا موسم گرما تھا جب ابراہیم جلیس سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ کسی اخبار میں کام کرتے تھے اور بہادر یار جنگ ہائی اسکول میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ڈرامہ" دلی کی آخری شمع" دیکھنے آئے تھے۔ نظر حیدرآبادی مرحوم نے تعارف کرایا کہ یہ ابراہیم جلیس ہیں، مشہور افسانہ نگار۔ یہ سُن کر ابراہیم جلیس نے قہقہہ لگایا۔ یہی قہقہہ آج بھی میرے کان میں گونج رہا ہے۔ ہنس مکھ، شاداب چہرہ، لمبا قد، گھنے سیاہ بال، بھرا بھرا جسم، روشن آنکھیں، چہرے پر خلوص کی نرمی جو آنکھوں کی چمک میں بھی شامل تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے کہ شاید برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں اس وقت ان کی دو کتابیں ــ "چالیس کروڑ بھکاری" اور" چور بازار" پڑھ چکا تھا اور ان کے متعدد افسانوں سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ ابراہیم جلیس نہ صرف موہنی شخصیت کے مالک تھے بلکہ ان کا قلم بھی موہنی قلم تھا۔ ان کی تحریر دلوں میں اُتر جاتی تھی۔ جو پڑھتا تھا ان کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ ان کی تحریریں ان تجربوں پر مشتمل ہوتی تھیں جو براہ راست زندگی سے حاصل کیے گئے تھے۔ ان کا دل دردمند عوام کے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا اسی لیے اس میں وہ روحِ معاشرہ شامل تھی جو تحریروں کو پُر اثر بنا دیتی ہے۔

پاکستان آکر، اس دور کے ہر نوجوان کی طرح، انھوں نے اپنی صلاحیت اور اپنی محنت سے اپنی زندگی کو بنایا اور وہ شہرت اور عزت حاصل کی جو کم لوگوں کو میسر آئی۔ وہ ساری عمر کسی نہ کسی اخبار سے وابستہ رہے اور اپنی خوش رنگ تحریروں سے قارئین کے ایک وسیع حلقے

کو متاثر کرتے رہے۔ جدید اردو صحافت کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی ابراہیم جلیس کا نام روشن حروف میں لکھا جائے گا۔ انھوں نے اپنے کالم سے تحریر کا ایک نیا مزاج پیدا کیا۔ اپنے پڑھنے والوں میں ایک نیا شعور بیدار کیا۔ معاشرتی مسائل کی طرف ان کی توجہ دلائی اور اس طرح عوام و خواص کے ذہن کو بدلنے اور اسے آگے بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا۔

ابراہیم جلیس زندہ دل انسان تھے۔ ہر محفل میں سجتے تھے اور ہر حلقے میں مقبول تھے۔ چھوٹوں میں چھوٹے اور بڑوں میں بڑے۔ نہایت مہذب اور شائستہ۔ شریف النفس اور وضع دار۔ دوسروں کے کام آنے والے۔ دکھ درد میں شریک ہوکر دوسروں کے غموں میں ہاتھ بٹانے والے۔ اس زمانے میں جن نوجوانوں نے ادب کے افق کو وسیع کیا ان میں نظر حیدرآبادی، خواجہ معین الدین، صمد انی نقوی، عبدالقیوم اور عبدالماجد کے علاوہ ابراہیم جلیس کا نام شامل تھا۔ اب یہ سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے چلے گئے ہیں :

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

لیکن اُن کے نام، اُن کے کام کے ساتھ آج بھی ہمارے لیے شمع نور ہیں۔ ابراہیم جلیس روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ ایسا جاندار و پُراثر قلم ہر لکھنے والے کو نہیں دیتے۔ جس صلاحیت اور قوتِ قلم کا اظہار مرحوم ابراہیم جلیس نے سترہ سال کی عمر میں کیا وہ ۵۵ سال کی عمر تک روز افزوں قوت کے ساتھ آگے بڑھتا رہا۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ وقت کے ساتھ تحریر افسردہ ہوکر مرجھانے لگتی ہے لیکن ابراہیم جلیس کا قلم آخر وقت تک تنومند و توانا رہا اور اس کا رنگ و اثر ہمیشہ قائم رہا۔ اگر پاکستان کے نامور صحافیوں کی ایک فہرست مرتب کی جائے تو ابراہیم جلیس کا نام فہرست کی لوح پر لکھا جائے گا۔ وہ ساری عمر نامور ادیب اور صفِ اول کے صحافی کی حیثیت سے مشہور رہے اور یہ اللہ کی دین ہے جسے بھی وہ دے۔

ابراہیم جلیس اب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کی وفات کو ۸ سال ہو گئے ہیں۔ آٹھ سال کا عرصہ انسان کی زندگی میں خاصا عرصہ ہوتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کل ہی اس جہان سے گذرے ہیں۔ اس احساس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی تحریروں کا جادو آج بھی ہمارے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ ابراہیم جلیس یقیناً مر گئے ہیں لیکن ابراہیم جلیس آج بھی زندہ ہیں۔ ان کی تحریریں آج بھی اپنی شگفتہ بیانی سے ہمارے دلوں کو موہ رہی ہیں اور آنے والے زمانوں میں بھی شاید اسی طرح متاثر کرتی رہیں گی۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی مختلف تحریروں اور کالموں کا ایک کڑا انتخاب کر کے شائع کیا جائے تا کہ ان کی تحریریں اخباروں کے قبرستان سے زندہ معاشرے کے صاحبانِ ذوق تک پہنچ سکیں۔ ابراہیم جلیس کی یاد کو تازہ رکھنے، ان کی تحریروں کو نئی نسلوں تک پہنچانے کا سب سے بہتر اور سب سے موثر طریقہ یہی ہے۔

موت برحق ہے۔ وہ سب کو آنی ہے۔ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہی موت ہے۔ اس وقت مجھے میر کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دنیا میں دیر رہنا ہوتا نہیں کسو کا
یہ تو سرائے فانی اک کارواں سرا ہے

مرنے والوں کی یاد کو زندہ و تازہ رکھنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو، ان کی تحریروں کو آنے والی نسلوں تک پہنچاتے رہنا چاہیئے اور یہی میری آپ سب سے گذارش ہے۔

۲۵ راکتوبر ۱۹۸۵ء

کامل القادری مرحوم

۲ر جولائی ۱۹۸۲ء کو کامل القادری اچانک وفات پاگئے اور کہیں تیسرے دن اخباروں کو معلوم ہوا کہ کراچی شہر کی علمی و ادبی زندگی کو نہال کرنے والا شخص مارٹن روڈ کے ایک کوارٹر میں پرسوں رات مر گیا ہے:

جن جن کو تھا یہ عشق کا آزار مر گئے
اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

وہ لوگ جو کامل القادری کو جانتے تھے میرے ساتھ اس بات کی گواہی دیں گے کہ وہ ایک بہت مخلص انسان تھے۔ سونے کی طرح کھرے اور آئینے کی طرح صاف۔ علم و ادب ان کی زندگی تھے اور وہ دن رات اپنی دُھن میں مگن اسی کام میں لگے رہتے تھے۔ زبان کے سچے۔ بات کے پکے۔ متعدد کتابوں کے مصنف، شاعر، ادیب، محقق، نقاد، بلوچستان اور اس کی تہذیب کے عاشق، کامل القادری پہلے پاکستانی ادیب و محقق ہیں جنھوں نے بلوچستان کو اپنا موضوع بنایا اور اس کی تہذیب و تاریخ کے بارے میں کئی کتابیں اردو انگریزی اور بلوچی، براہوی میں لکھیں۔ کامل القادری کے اس کام نے، اللہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے، بلوچستان کی نئی نسل میں ایسا اعتماد پیدا کیا کہ اب وہاں اس موضوع پر کام کرنے والوں کی ایک خاصی تعداد موجود ہے۔ کراچی میں رہتے ہوئے بھی اُن کا دل بلوچستان کی وادیوں اور کہساروں میں بھٹکتا رہتا تھا اور ان کی بے قرار روح ہر وقت وہاں کی تہذیب و تاریخ میں سفر کرتی رہتی تھی۔ براہوی زبان میں ان کی کتاب "شروغ" برسوں سے شاملِ نصاب ہے۔ جس لگن اور دل جمعی کے ساتھ

کامل القادری مرحوم نے بلوچی ادب و تہذیب کی خدمت کی اُسے پاکستان کی تہذیبی تاریخ جو کسی ملک کی بنیادی تاریخ ہوتی ہے، فراموش نہیں کرسکتی۔ ۱۹۶۱ء میں ان کا ایک اہم علمی مقالہ "اردو اور براہوئی" شائع ہوا تو اس مقالے نے لسانی تحقیق کا ایک نیا دروازہ کھول دیا۔ "مہمات بلوچستان" کے نام سے دو جلدوں میں ان کی کتاب تقریباً دو سال پہلے شائع ہوئی تھی اور اتفاق دیکھیے کہ ۱۳؍۱۹۸۱ء کو کامل القادری اپنی اس کتاب کی تقریبِ رونمائی میں اسٹیج پر موجود تھے اور محترم میر علی احمد خان تالپور صاحب، آج کی طرح، مہمان گرامی خصوصی تھے اور یہ خاکسار، آج ہی کی طرح، صدرِ جلسہ تھا اور آج ۲؍فروری ۱۹۸۳ء کو ہم سب ماشاء اللہ موجود ہیں لیکن کامل القادری اس لیے موجود نہیں ہیں کہ وہ اب ہم سے اتنی دور چلے گئے ہیں کہ واپس بھی نہیں آسکتے۔

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ
غالباً زیرِ زمیں میرؔ ہے آرام بہت

کامل القادری بڑی خوبیوں اور بڑی صلاحیتوں کے انسان تھے۔ میں نے ایسے بہت کم لوگ دیکھے ہیں جو ہوش و شعور کے ساتھ باعمل زندگی گذارتے ہیں لیکن یہ عمل ان کی اپنی ذات یا اپنے فائدے کے لیے نہیں بلکہ علم و ادب کی خدمت کے لیے ہوتا ہے جس سے معاشرے کا ذہن روشن اور تہذیبی ترقی کا آفتابِ عالمتاب طلوع ہوتا ہے۔ کامل القادری نے اپنی زندگی اپنے لیے نہیں بلکہ قوم و معاشرے کے لیے وقف کردی تھی۔ ساری عمر وہ یونہی بسر کرتے رہے اور آخر دم تک اسی عمل میں لگے رہے اور جب ۲؍جولائی ۱۹۸۲ء کو انھوں نے اچانک وفات پائی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ نہ ان کا کوئی ذاتی مکان تھا، نہ انکے پاس پیسہ تھا اور نہ کوئی ایسا وسیلہ جس سے ان کے بعد ان کی بیوی اور ان کے چھ چھوٹے چھوٹے بچے اپنا پیٹ پال سکیں۔ ایسے معاشرے میں جہاں کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہے، زندگی کی بنیادی ضروریات کو چھوڑ کر علم و ادب کی خدمت کرنا بظاہر کوئی عقلمندی کی بات معلوم نہیں ہوتی لیکن کامل القادری جیسے لوگوں کی دیوانگی ہی نے اس دنیادار اسلامی معاشرے کو زندہ رکھا ہے اور اُسے نور و روشنی عطا

کی ہے۔ یہ بات دنیادار معاشرے کی سمجھ میں نہیں آسکتی اور آنی بھی نہیں چاہیے کہ یہ اس کے اختیار فہم سے بالا ہے لیکن اگر معاشرے میں علم و ادب، تاریخ و تہذیب کی بے لوث خدمت کرنے والے دیوانے باقی نہ رہیں تو سارا معاشرہ محض بڑا سا گھنا جنگل بن کر رہ جائے اور اس میں رہنے والے وحشی درندے سب ایک دوسرے کو کھا جائیں۔ اس لیے وہ صاحبانِ اقتدار اور وہ صاحبانِ دولت و ثروت، جو ہوش مند ہوتے ہیں، علم و ادب کے دیوانوں کو سہارا دیتے ہیں، ان کے حوصلے بڑھاتے ہیں اور ان کے اس عمل سے اپنے نام کو روشن کر کے تاریخ میں نیک نام ہو جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ علم و ادب کے دیوانے اپنے اچھے بُرے کو نہیں سمجھتے یا وہ کم عقل اور کند ذہن ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے لیے یہی کٹھن اور اذیت ناک راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ کانٹوں بھرا راستہ جسے صاف کر کے وہ خود تو لہولہان ہو جاتے ہیں لیکن سارے معاشرے کے لیے خوشبو و لطافت کے سدا بہار پھول کھلا جاتے ہیں اور اس طرح معاشرے کی 'بصارت' میں 'بصیرت' کا اضافہ کرتے ہیں۔ اے صاحبانِ اقتدار و ثروت انھیں حقارت کی نظر سے مت دیکھو کہ یہ غریب لوگ، یہ دیوانے فی الحقیقت بہت بڑے لوگ ہیں اور وہ کام کر رہے ہیں جو محض اقتدار اور دولت سے نہیں کیا جا سکتا۔ میر، غالب، اقبال نہ صاحبانِ اقتدار تھے اور نہ صاحبانِ دولت لیکن آپ خود دیکھیے کہ آج ہم اپنے معاشرے کو، اپنی تہذیب کی روح کو، اپنی بصیرت کو انھیں کے ناموں سے پہچانتے ہیں۔ آج یہی دیوانے ہمارے معاشرے کی، ہماری تہذیب کی شناخت ہیں اور ہم خود کو انھیں دیوانوں کے حوالے سے جانتے اور فخر کرتے ہیں۔ اگر ہمارے فرزانے، صاحبانِ اقتدار اور صاحبانِ دولت ان دیوانوں کو اُن کی اپنی زندگی میں پہچان لیں اور ان کے لیے صرف اتنا کر دیں کہ جو ایک زندہ فلاحی معاشرے میں انسان کی بنیادی ضرورت کہلاتا ہے تو ہمارا معاشرہ کتنا زندہ اور کتنا فعال و پُرقوت ہو کر دُنیا کی عظیم قوموں کی صف میں شامل ہو جائے۔ ہمارے ادیب، ہمارے مفکر و دانش ور جن حالات میں کام کرتے ہیں، معاشی بدحالیوں کی جس کش مکش سے ہر وقت دوچار رہتے ہیں اور اپنی باطنی اُپج سے مجبور ہو کر علم و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اُسے ہم فی سبیل اللہ جہاد ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ

بات ہم سب کو یاد رکھنی چاہیے کہ روٹی کپڑا مکان انسان کی فی الواقعی بنیادی ضرورت ہے اور
جب یہ میسر آجائے تو اس کے بعد ہی دوسری ذہنی و علمی اور فکری و تخلیقی سرگرمیاں شروع
ہوتی ہیں ہمارے ہاں صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے ادیب، ہمارے دانشور، ہمارے
مفکر ساری عمر اسی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ وہ وہ
نہیں کرپاتے جو وہ کرسکتے ہیں اور جس سے معاشرے زندہ، روشن اور نیک نام ہوتے
ہیں۔

کامل القادری مرحوم نے ان ساری مشکلات کے ساتھ علم و ادب کی دنیا میں بہت
کام کیا اور اپنے اس کام سے نہ صرف اپنے معاشرے کا نام روشن کیا بلکہ اس کے شعور اور
فکر و نظر میں بھی بہت اضافہ کیا اور اب جب وہ، اپنی عمر طبعی کو پہنچنے سے پہلے ہی، ہم
سے رخصت ہوگئے ہیں ان کے بیوی بچوں کی کفالت اور تعلیم و تربیت ہماری ذمہ داری ہے۔
ہم ان اداروں کے تہہ دل سے شکرگذار ہیں جنھوں نے اپنی ذمہ داری محسوس کی
اور ان اداروں کے بھی یقیناً شکرگذار بلکہ احسان مند ہوں گے جو اپنی اس قومی
ذمہ داری کو جلد محسوس کریں گے۔

مرنے والے مرجاتے ہیں اور جانے والے چلے جاتے ہیں۔ ہم ان کے تعزیتی جلسے
بھی کرتے ہیں اور ذرا دیر کو غم و اندوہ کا اظہار بھی کرتے ہیں لیکن یہ بالکل بھول
جاتے ہیں کہ اس جانے والے کی تصانیف اور تحریروں کو شائع کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔
کتنے بڑے بڑے ادیب اور دانشور ان چند سالوں میں ہم سے جدا ہوگئے۔ مژگاں تو کھول
شہر کو سیلاب لے گیا۔ لیکن ان کی کتابیں جو کبھی چھپی تھیں، اب نایاب ہیں۔ کیا یہ ہماری
قومی ضرورت نہیں ہے کہ ہم مرنے والے دانشوروں، ادیبوں اور مفکروں کو خراجِ تحسین
پیش کرنے اور علمی، ادبی و فکری روایت کے تسلسل کو باقی و زندہ رکھنے کے لیے ان کی
ساری مطبوعہ و غیر مطبوعہ تحریروں کو شائع کریں تاکہ نئی نسل ان کی تحریروں سے فکر و ادب
کے چراغ کو روشن رکھ سکے اور ساتھ ساتھ ان کتابوں کی رائلٹی سے مرنے والے کے خاندان
کی کفالت کرسکیں۔ "اکادمی ادبیاتِ پاکستان" اس بنیادی کام کو حسن و خوبی انجام دے سکتی ہے۔

خواتین و حضرات! میں نے جو کچھ عرض کیا اس پر انفرادی حیثیت میں آپ بھی غور کیجیے اور جہاں تک ممکن ہو علم و ادب اور فکر و دانش کے فروغ کے لیے اپنے اپنے طور پر عملی قدم اٹھائیے اور اپنے معاشرے کو ظلمات کی پاتال سے نکال کر روشنی و نور بہم پہنچانے کا سامان کیجیے۔ کامل القادری کی وفات میرے لیے، جناب میر علی احمد خان تالپور صاحب اور دوسرے عزیز و اقارب کے لیے ایک ناقابلِ تلافی نقصان، ایک گہرا ذاتی غم اور ایک بڑا سانحہ ہے — ع

تھا جن سے لطفِ زیست سو وے یار مر گئے

لیکن قومی سطح پر کامل القادری کی وفات ان عبرت ناک معاشرتی حالات کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہے جن کی آندھیوں میں علم و ادب کے چراغ بجھ بجھ جاتے ہیں۔ کیا ہم اس صورتِ حال کو یوں ہی نظر انداز کرتے رہیں گے؟

(۲ر فروری ۱۹۸۳ء)

ڈاکٹر ایوب قادری

انجمنیں افراد سے چلتی ہیں اور افراد کے اتحاد کو عرفِ عام میں انجمن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ وہ افراد قابلِ تعریف ہیں جو انجمن بناتے ہیں اور کام کرتے ہیں اور کام اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے دل خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں اور سرشار اس لیے ہوتے ہیں کہ وہ "پُل بنا، چاہ بنا، مسجد و تالاب بنا" کے مطابق اپنی سماجی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ایسے نیک کام کرتے ہیں کہ کام کے حوالے سے ان کا نام بھی زندہ و باقی رہتا ہے۔ محمد تقی میر نے شاید اسی لیے کہا تھا ع

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

آج کی تقریب میں "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایوارڈ" ڈاکٹر ایوب قادری مرحوم کی علمی خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جا رہا ہے۔ آج کی تقریب اس لیے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے، جو جامعہ کراچی کے وائس چانسلر اور برصغیر پاک و ہند کے نامور مورخ تھے، تاریخ کو اس طور پر پیش کیا کہ ماضی کو حال میں لاکھڑا کیا اور ساتھ ساتھ اسے مستقبل سے ملا دیا۔ یہ تینوں زمانے اور ان زمانوں کا شعور وہ زاویہ ہے جو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم نے تاریخ کو دیا ہے۔ تاریخ انسان کے حافظے اور اس کے کارناموں کا نام ہے۔ مورخ انھیں یکجا کر کے اس طور پر بیان کرتا ہے کہ انسانی حافظہ زندہ ہو جاتا ہے اور ایک نیا شعور اس کی اجتماعی قوتوں کو تندرست و توانا کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ انسانی فکر و شعور کو زندہ و متحرک کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ کو بھلا دیتی ہیں، تاریخ انھیں بھلا دیتی ہے۔ وہ قومیں جو تاریخ سے

سبق نہیں سیکھتیں ہمیشہ خوار وپس ماندہ رہتی ہیں۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ ہمیں وہ بناتی ہے جو ہم ہیں اور ساتھ ساتھ وہ بھی بناتی ہے جو ہم بننا چاہتے ہیں۔ آج بحیثیت قوم ہم وہ ہیں جو تاریخ نے ہمیں بنایا ہے لیکن ہم وہ نہیں ہیں جو ہمیں بننا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے تاریخی دھاروں کی طرف سے نظریں بند کر لی ہیں۔ ہم نے تاریخ سے سبق سیکھنا بند کر دیا ہے۔ ہم نے تاریخی شعور کو اپنی قومی زندگی کے دریا میں شامل نہ کر کے خود قوم کے دریا کو خشک کرنے کا عمل شروع کر رکھا ہے۔ ہم اسی لیے زر پرست ہو گئے ہیں۔ ایسے زر پرست کہ میدانِ حشر میں ہونے والی نفسا نفسی کا سماں ہمارے چاروں طرف ہو رہا ہے اور ہم ایک دوسرے سے بے نیاز دولت بٹورنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ آدمی دولت حاصل کرے لیکن اس کی محبت میں مبتلا نہ ہو۔ یہی رویہ دولت مند اور زر پرست میں فرق پیدا کرتا ہے۔ ہم بحیثیت قوم مفلس ہیں لیکن ہم بحیثیت فرد حُبِ زر کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ اسی لیے زندگی کی دوسری قدریں ہمارے معاشرے میں سوکھ کر مرجھا رہی ہیں۔ ہم آدمی کو "زر" سے پہچانتے ہیں اور "بے زر" کو کمتر سمجھتے ہیں۔ اہلِ علم بھی اسی لیے زر پرستی کی دوڑ میں لگ گئے ہیں اور علم و ادب او رفکر و شعور کی کھیتی بُری طرح سوکھ رہی ہے۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم کی کتبِ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہیں کہ قومیں تاریخی شعور سے زندہ رہتی ہیں۔ ماضی کوئی پتھر یا ڈلا نہیں ہے بلکہ وہ ایک زندہ سماجی شعور کا نام ہے۔ ڈاکٹر ایوب قادری بھی اسی روایت کے عَلم بردار تھے۔ وہ ساری عمر تاریخ کو کھنگالتے رہے اور صدفِ تاریخ سے گوہر آب دار ہمارے سامنے لاتے رہے۔ وہ صحیح معنی میں صاحبِ علم تھے۔ کتابیں پڑھنا، کتابیں لکھنا، علم کی شمع کو روشن رکھنا اور ماضی کی شمع سے زمانۂ حال کو روشن رکھنا یہی ان کا کام تھا۔ مرحوم ایوب قادری نے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ اسی کام سے زندہ رہیں گے۔ آنے والی نسلیں انھیں اسی کام سے پہچانیں گی اور ان کا نام پاکستان کی علمی دنیا میں عزت و احترام سے لیا جائے گا۔ وہ طبعی موت نہیں مرے بلکہ ایک سفاک تیز رفتار سُوزوکی نے انھیں مار دیا اور وہ مر گئے۔ ہمارے عظیم و نامور خطاط استاد یوسف دہلوی بھی ایک ایسی ہی سفاکی کا شکار ہو گئے تھے۔ زر پرست

معاشرے میں صاحبان علم کی موت بھی کوئی بڑا قومی سانحہ نہیں بنتی لیکن جب ہمارے معاشرے کو ہوش آئے گا تو ہم محسوس کریں گے کہ ہماری خود غرضانہ تیز رفتاری نے کیسا ظلم ڈھایا ہے؟ ایوب قادری کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ ابھی ان کا قلم جوان تھا اسکا کام کرنے کا جذبہ زندہ تھا اور وہ دن رات کام میں لگے ہوئے تھے۔ جب بھی میرے پاس آتے کسی کتاب کی تلاش میں یا کسی علمی موضوع پر تبادلۂ خیال کے لیے آتے۔ علم کی یہ لگن اور کام کرنے کی یہ دُھن، اس دور میں جہاں فرزانے بہت اور دیوانے بہت کم ہیں، مجھے خال خال نظر آتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ یونی کیرین نے پس مرگ ڈاکٹر ایوب قادری کو "ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ایوارڈ" دے کر ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے اور یہ اعتراف یقیناً ایک بڑا اعتراف ہے۔

(۱۲/ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان: ایک تعارف

استاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب اُن نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک اور ممتاز ہیں جن پر نہ صرف ہم سب فخر کرتے ہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ وہ جامع الصفات ہیں۔ ایک ہی ذات میں اتنی صفات کا یکجا ہو جانا ایک ایسا کمال ہے جو اس دور میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ عظیم اُستاد ہیں۔ ایسے فاضل و شفیق اُستاد جن کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ اُن کے شاگرد اس برصغیر اور بیرونی ممالک میں افقِ علم و ادب پر چھائے ہوئے گیسوئے زندگی کو اس طور پر سنوار رہے ہیں کہ اُستاد کا فیض معاشرے کو روشن و منور کر رہا ہے۔ ایسے محقق اور مفکر کہ ان کی تحقیقات نے ادب و فکر کے در و بام پر اُجالا کیا ہے۔ ایسے قطب اقطاب اور ایسے بزرگ ولی اللہ کہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ کو راستی کی طرف موڑ کر ان کی زندگی کو نیکی کے راستے پر لگایا ہے۔ جس پر توجہ کی پارس بن گیا۔ جسے نظرِ کیمیا اثر سے دیکھ لیا کندن ہو گیا۔ روشن آنکھیں، شگفتہ و خنداں نورانی چہرہ، صاف دھیما لہجہ، دل میں اُتر جانے والا، باتیں جیسے گلوں کی خوشبو، کم سخن لیکن ہر سخن میں معنی کا ایک دریا۔ جب کبھی لقمہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کی لذت کام و دہن کا مستقل مزا بن گئی، چشمۂ فیض ایسا کہ ہر دم جاری ہے۔ جو آیا شاد کام گیا۔ بیمار آیا صحت مند گیا۔ درماندوں کے رفیق، دشمنوں کے دوست، سب کے لیے دعاگو۔ جب بھی دیکھنے کا موقع ملا عبادت گذاری میں دیکھا، دن کو بھی اور رات کو بھی۔ مزاجاً فقیر لیکن امیروں کے پیشوا۔ جو لفظ دل کی زبان سے نکلا مشرف بہ قبولیت ہوا۔ علم اتنا کہ بہت سے عالموں کے پاس مل کر نہ ہو گا۔ لکھائی ایسی کہ جیسے صفحۂ قرطاس پر موتی ٹانک دیے ہوں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت، فارسی و عربی

پر پوری دسترس ۔ خطوں کے جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے ہم آپ سلام کا جواب دیتے ہیں۔ رسولؐ کے عاشق ، سنت کے پیروکار ، شریعت و طریقت کے پابند ، سلسلہ نقشبندیہ میں میرے استاد۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ۔ ہادی بھی ۔ راہنما بھی ۔ اللہ تعالیٰ ایسے استاد سب کو دے ۔ غالب نے کہا تھا اور وہی میں استاد کے لیے کہتا ہوں ؎

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

۲

ڈاکٹر صاحب کی اب تک ساٹھ کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں علمی ، ادبی و تحقیقی کتابیں بھی ہیں جیسے "سید حسن غزنوی" جو عہد غزنوی پر پہلی بنیادی تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ "حالی کا ذہنی ارتقا" جس نے تحقیق میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ فارسی پر اردو کا اثر ، علمی نقوش ، فارسی کے قدیم شعراء تحقیقی جائزے ، ادبی جائزے ، تحریر و تقریر ، متین برہان پوری کے مرثیے ۔ "ثقافتی اردو" تو ایک ایسی کتاب ہے کہ یہ موضوع اس انداز سے پہلی بار سامنے آیا ہے ۔ "اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات" تحقیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے ۔ سندھی اردو لغت اور اردو سندھی لغت وہ لغات ہیں جو آج سے تیس سال پہلے تالیف کی گئی تھیں اور آج تک ان پر اضافہ نہ ہو سکا ۔ جامع القواعد (حصۂ نحو) وہ تصنیف ہے جو آج بھی استناد کا درجہ رکھتی ہے ۔ اقبال ان کا محبوب موضوع ہے اور محبوب اس لیے ہے کہ اقبال کی شاعری میں انھیں روحِ اسلام کارفرما نظر آتی ہے ۔ اقبال اور قرآن اور معارفِ اقبال جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین انھوں نے اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھ کر روحِ اقبال اور روحِ اسلام کو اجاگر کیا ہے ۔ دیوانِ روشن اور دیوانِ عظیم تتوی تدوینِ متن کی ممتاز مثالیں ہیں ۔ ادب و تحقیق کی طرح تصوف ان کا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ان کی کم و بیش ۲۷ تالیفات شائع ہو چکی ہیں جن میں رسائلِ مشاہیرِ نقشبندیہ ، ملفوظاتِ صوفیہ ، ارشادِ رحیمیہ ،

ہدایت الطالبین، تحفۂ زوّاریہ، وسیلۃ القبول، اثبات النبوۃ، رسالۂ تہلیلیہ، مکاشفاتِ عینیہ، تاریخ اسلاف، سوانح امیر کلال، سعید البیان، گلشنِ وحدت، مکتوباتِ سیفیہ، مجمع البحرین، رسالۂ سلوک، لوایح خانقاہِ مظہریہ، سراج منیر اور تین ضخیم جلدوں میں مکتوباتِ امام ربانی اور مکتوباتِ معصومیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً حضرات القدس، خزینۃ المعارف اور زبدۃ المقامات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ انگریزی میں ان کی دو کتابیں تاریخ بہرام شاہ غزنوی اور برصغیر میں فارسی ادب قابلِ ذکر ہیں۔ فن لغت پر ایسا عبور کہ ماہرینِ فن ان کی رائے کے محتاج ہیں۔ سرتاپا انکسار اور سرتاپا علم۔ یہی ہماری عظیم روایت تھی اور آج اسی روایت کے وہ ملک بھر میں واحد اور ممتاز نمائندے ہیں۔

دین اسلام اور اس کی روایت ان کی ہر تحریر میں رنگ و خوشبو پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہے۔ ایک جگہ نئی نسل سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں :

" دین کی تکمیل علم، عمل اور اخلاص سے ہوا کرتی ہے ..... دنیوی معاملات کے لیے بھی یہی تین چیزیں ضروری ہیں۔ وہ علم بے کار ہے جس پر عمل نہ ہو اور وہ عمل محض فریب ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔ ذرا دیکھیے جو عمل (ادب) ہم پیش کر رہے ہیں اس میں اخلاص کس درجے میں موجود ہے بھی یا نہیں۔ اشتراکیت اور جنسیات اپنی جگہ مردود نہیں اور ان کا موضوعِ سخن بنانا کوئی عیب نہیں لیکن بقول میرؔ ع

عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

یاد رکھیے پاکستان صرف ریت کے ٹیلوں کا نام نہیں۔ وہ جس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اس کے حصول کی کوشش کیجیے ورنہ آپ کو نہ صرف قوم کے سامنے بلکہ خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔"

(تحقیقی جائزے ص ۱۲۲-۱۲۳)

یہی ان کا نقطۂ نظر ہے اور اسی نقطۂ نظر کو انھوں نے اردو ادب کے حوالے سے اپنے ایک مضمون "تہذیبِ جدید کا فکری بحران" میں واضح کیا ہے۔ ان کے اندازِ نظر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی سے پاک ہے اور اعتدال کے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچائی اور حق کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ زبان اور اہلِ زبان کی بحث یوں تو صدیوں سے ہو رہی ہے لیکن گذشتہ چالیس سال سے پاکستان میں کسی نہ کسی عنوان سے جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"کسی غیر زبان کے سیکھنے کے لیے ہم لاکھ جتن کریں ہمیں اہلِ زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا مثال کے طور پر انگریزی کا کوئی کتنا ہی بڑا عالم فاضل کیوں نہ بن جائے اس کو اہلِ زبان تسلیم نہیں کیا جائے گا لیکن اردو کی نوعیت مختلف ہے۔ انگریزی اجنبی اور پردیسی زبان ہے۔ اردو اسی ملک کی زبان ہے جس کا دوسری ملکی زبانوں کے ساتھ خون کا رشتہ ناتا ہے اور لسانی اشتراک کی وجہ سے وہ برصغیر کے ہر حصے میں خود بخود اور اچھی طرح جانی پہچانی جاتی ہے۔ بول چال کی حد تک اس کی حیثیت بین الملکی زبان کی سی ہے اور سرکاری طور پر اسے قومی زبان کا منصب حاصل ہے اس لیے پاکستان کے ہر شہری کو اردو کے اہلِ زبان بننے کا آئینی حق حاصل ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے جو فطری تقاضے ہیں ان سے روگردانی نہ کی جائے۔ صحت کے ساتھ جو شخص بھی اردو لکھے، پڑھے اور بولے وہ اہلِ زبان ہے۔ اس میں پنجاب، سندھ یا کراچی کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیئے۔ جس طرح دلی اور لکھنؤ کا فرق وقت کے ساتھ خود مٹ گیا اسی طرح یہ امتیاز بھی ہمیں ختم کرنا ہوگا . . . . . .
میرے نزدیک ہر وہ شخص اہلِ زبان ہے جو صحتِ زبان کی قید کے ساتھ اردو لکھنے اور بولنے پر قادر ہو خواہ وہ کہیں کا رہنے

ہو۔" (تحقیقی جائزے ص ۸۳ - ۸۵)

یہی وہ رویہ ہے جس کی ہمیں، ہمارے ملک اور قوم کو زندگی کی ہر سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے مثبت اور تعمیری فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یک جہتی و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ منفی و انتہا پسندانہ رویوں سے گریز کرکے تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر اسی نظر سے دیکھا ہے اور یہی وہ طرزِ فکر ہے جس سے علمائے دین، صاحبانِ ادب اور اہلِ نظر کو ساری زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ یہ وصل کا راستہ ہے اور باقی سارے راستے فصل کے راستے ہیں۔ مولانا روم نے کہا تھا:

تو برائے وصل کردن آمدی　　　نے برائے فصل کردن آمدی

لسانی، نسلی و صوبائی تعصبات کے اس دور میں اسی طرزِ فکر کے باعث ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب ایک ایسی مشعلِ پُر نور کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے پاکستانی معاشرے کی ظلمتیں دور ہو سکتی ہیں۔ وہ از سر تا پا محبت ہی محبت ہیں۔ وہ محبت جس سے گلشنِ دل میں بہار آجاتی ہے اور زندگی نفرتوں کی دلدل سے نکل کر انسانیت کے باغ میں آجاتی ہے، جہاں ہر طرف مشامِ جان کو معطر کرنے والے پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اسی شگفتگی اور اسی خوشبو سے ڈاکٹر صاحب دینی و دنیوی زندگی کو حیاتِ نو بخش رہے ہیں۔ خدا انھیں ہمارے سروں پر تا دیر قائم رکھے۔ آمین۔

۲۸ر فروری ۱۹۸۸ء

اختر حسین رائے پوری

کہیں پڑھا تھا، یاد نہیں کہاں، کہ ہر بالغ نظر اور باشعور انسان کی زندگی میں مشاہدات
و تجربات کا اتنا تنوع اور اتنا انوکھاپن ہوتا ہے کہ اگر انھیں بیان کیا جائے تو ایک دلچسپ
ناول وجود میں آسکتا ہے لیکن عام طور پر انا پرست اور خود پرور انسان اپنی بڑائی کے
پہاڑ بنانے میں لگ جاتا ہے اور اس کے اصل تجربات جھوٹی بڑائی کے ملبے تلے دب کر
رہ جاتے ہیں۔ اسی لیے بہت کم خود نوشتیں ایسی ہوتی ہیں جو پڑھنے والوں کے دل کو چھوتی ہیں۔
"گردِ راہ" اس اعتبار سے اُردو زبان میں ایک مختلف خود نوشت ہے۔ گردِ راہ کی خوبی
یہ ہے کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے اپنی زندگی کے حالات، اپنے تجربات و مشاہدات
کو نہایت دھیمے انداز میں، انکسار و معروضیت کے ساتھ، انا پرستی اور خود پروری سے
بچ کر، اس سادگی سے بیان کیا ہے کہ یہ خود نوشت ناول سے زیادہ دلچسپ اور زندگی
سے زیادہ حقیقی بن گئی ہے۔ "گردِ راہ" کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں ہمیں
ایک جہت، ایک زاویے کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں زندگی اپنے زمانے کی روح سے
پیوست ہے اور زمانہ حالات سے مربوط ہے۔ ساتھ ساتھ واقعات، حالات، تجربات و
مشاہدات کے مربوط بیان سے اس دور کی زندگی کے خدوخال اس طور پر اُبھرے
ہیں کہ زندگی اور زمانے کے رنگ نکھر کر اس تصویر کو خوب صورت بنا دیتے ہیں۔ کتاب
بظاہر مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے لیکن زاویۂ نظر اور جہت کے سرے اس میں ایک

ایسا ربط اور ایسی ترتیب پیدا کر دیتے ہیں کہ شروع سے آخر تک یہ ایک دل کش اور جاذبِ نظر تحریر بن جاتی ہے۔ یہی ربط "گردِ راہ" کو ایک خوبصورت اور دل فریب ساخت عطا کرتا ہے اور اسے ایک باقاعدہ تصنیف بنا دیتا ہے۔ ایک ایسی تصنیف جس میں فلسفۂ حیات بھی ہے اور نظریات و افکار بھی ہیں اور ساتھ ساتھ وہ انوکھی دلچسپی بھی جو ایک داستان میں ہوتی ہے۔ ایک ایسی داستان جسے ایک بالغ نظر، پختہ کار اور لفظوں کا پارکھ ادیب بیان کر رہا ہو۔

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے جب مجھ سے کہا کہ "گردِ راہ" کے آخری پروف میں دیکھ دوں تو میں نے اُس محبت کے پیشِ نظر جو تقریباً تیس سال سے میرے اور اُن کے درمیان ہے، ہامی بھر لی اور عرض کیا کہ ایک ماہ میں پروف دیکھ کر واپس کر دوں گا لیکن جب میں نے پروف پڑھنے شروع کیے تو تین دن میں سارے پروف پڑھ ڈالے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ میں تین دن تک اس کے علاوہ کوئی اور کام نہ کر سکا۔ اپنی زندگی کے حالات و واقعات دوسروں نے بھی بیان کیے ہیں اور متعدد خود نوشتیں اُردو میں لکھی اور شائع ہوئی ہیں لیکن "گردِ راہ" اس صنفِ ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے کہ آئندہ خود نوشت لکھنے والے اس تصنیف کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں گے۔ بظاہر یہ ایک عام سا جملہ ہے لیکن اس میں بہت سی ایسی باتیں پوشیدہ ہیں جن کے اظہار کے لیے ایک تفصیلی مضمون کی ضرورت ہے، جو میں آج تو نہیں لیکن جلد لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ سرِدست تو میں آپ کی توجہ اس اہم تصنیف کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب میں اپنے اس جملے کا طلسم کھولوں تو آپ بھی میرے ساتھ شریک ہوں۔

"گردِ راہ" میں ایک اور چیز جو دل کو موہتی اور پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے وہ سچائی کا جرأت کے ساتھ واقعاتی اظہار ہے جسے اتنی سادگی اور خلوص سے بیان کیا گیا ہے کہ سچائی کا اظہار قاری کو اپنے اثر کے سیلاب میں بہا لے جاتا ہے۔ ادبی صحافت کے اس دور میں، جب ساری زندگی اخبار کے صفحات پر آ کر مبتذل ہو گئی ہے۔ گردِ راہ اپنے خالص ادبی اظہار اور ادبی رنگ کی وجہ سے ہمیشہ ویسی ہی تازہ رہے گی جیسی

آج ہے اور جسے پڑھنے والا بار بار پڑھ کر اس کی معنویت سے، اس کی خوشبو اور رنگوں سے لطف اندوز ہوتا رہے گا۔ یہ باتیں میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری میرے سامنے موجود ہیں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب کو دوسری بار پڑھ کر میں اس کے طلسم میں اور زیادہ گرفتار ہو گیا ہوں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ دو بار پڑھ سکتے ہیں۔ کتنی کتابیں ہیں جو آپ لفظاً لفظاً اور سطر بہ سطر پڑھ سکتے ہیں۔ گرد راہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک عرصے کے بعد ہاتھ آئی ہے۔

یہاں میں ایک بات کی طرف اور اشارہ کرتا چلوں کہ گرد راہ میں ایک ایسا اسلوب اُبھرتا ہے جو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی شناخت بن جاتا ہے اور جو لہجے کے دھیمے پن، لفظوں کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنے کے ہُنر، مشاہدات و تجربات کو ناپ تول کر بیان کرنے کی خصوصیت اور صاف ذہن کے ساتھ اپنی بات پوری طرح پڑھنے والوں تک پہنچانے کے شعوری عمل سے وجود میں آیا ہے۔ اسی اسلوب نے اس تصنیف کو بلند پایہ، منفرد اور ممتاز بنا دیا ہے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری صاحب نے اس تصنیف میں بہت سے اردو و فارسی اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور یہ سب اشعار ایسی برجستگی اور خوبی کے ساتھ نثر کا حصہ بن کر آئے ہیں کہ سوائے ابوالکلام آزاد کے کسی دوسرے ادیب کے ہاں یہ حُسنِ اشعار نہیں ملتا۔ ڈاکٹر اختر حسین صاحب نے نثر کی انگوٹھی میں اشعار کو نگینے کی طرح جڑ دیا ہے۔ اور بھی کئی پہلو ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے لیکن یہ سب پہلو میں آئندہ کسی وقت پیش کروں گا۔

(۲۲؍ فروری ۱۹۸۴ء)

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی

جامعہ کراچی کے لیے یہ ایک یادگار دن ہے کہ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب آج ہمارے درمیان تشریف رکھتے ہیں۔ مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب ہمارے دور کی وہ منتخب روزگار شخصیت ہیں جنھوں نے جدید دور کے تعلق سے اسلام کی ترجمانی کرکے ہمارے ذہنوں کی بے شمار الجھنوں کو دور کیا ہے اور ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے جن کے جواب کی تلاش میں آج کا جدید ذہن سرگرداں ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے ان تمام مسائل کا نہ صرف حل پیش کیا ہے بلکہ اس انداز سے پیش کیا ہے جو نئی نسل کے لیے قابلِ قبول اور جاذبِ توجہ ہے۔ اقبالؔ بھی اسی وجہ سے مولانا کے مطالعہ کا مرکز ہیں۔ "نقوشِ اقبالؔ" کے نام سے ان کی ایک تصنیف شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہے۔ میں مولانا سے پہلی بار ان کی معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخِ دعوت وعزیمت" کے ذریعے متعارف ہوا۔ اس وقت میں خود ایک کتاب لکھنے میں مصروف تھا جو ۱۹۶۴ء میں "پاکستانی کلچر" کے نام سے شائع ہوئی۔ "تاریخ دعوت وعزیمت" کی اب تک چار جلدیں میری نظر سے گذری ہیں جن کے مطالعے سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ان کتابوں کا لکھنے والا ایک ایسا ذہن رکھتا ہے جس میں فکر واجتہاد کے ساتھ روایت کا شعور بھی موجود ہے۔ اس کے بعد سے جہاں کہیں مولانا کی کوئی تحریر میری نظر سے گذرتی میں اُسے دلچسپی سے پڑھتا۔ آج سے دس پندرہ سال پہلے پروفیسر محمد مجیب کی کتاب "انڈین مسلم" میں نے پڑھی تھی جس سے میں متاثر ہوا تھا اور اس کے کچھ ہی عرصے بعد مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی صاحب کی کتاب "ہندوستانی مسلمان" میری نظر سے گذری جس نے مجھ میں ایک نئی روشنی کا احساس پیدا کیا۔ اس کے بعد ان

کی ایک اور کتاب "انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر" جب میں نے پڑھی تو اس میں ایک ایسے زاویے سے جدید دور اور اسلام کے تعلق پر روشنی ڈالی گئی تھی جو بالکل نئی تھی۔ ان کی ایک اور تصنیف "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش" بھی اسی نقطۂ نظر کی مزید وضاحت کرتی ہے۔ ان سب تصانیف میں ہمیں ایک ایسے نئے ذہن سے واسطہ پڑتا ہے جس کے لیے جدید دنیا کے مسائل اور ان کے حل کی جستجو ایک منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مولانا کے قلم کی خوبی یہ ہے کہ وہ عام زبان میں بڑی سے بڑی بات کو اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ ان کی بات پڑھنے والوں تک پورے طور پر پہنچ جاتی ہے۔ بڑی سے بڑی بات کو عام زبان میں بیان کرنے کے کٹھن تخلیقی عمل سے وہی لوگ واقف ہوتے ہیں جنھوں نے لاکھوں الفاظ کو استعمال کر کے اس عمل کی مشق بہم پہنچائی ہے۔ اس سلسلے میں معاصر شخصیتوں پر جو قلمی تاثرات و مشاہدات مولانا نے لکھے ہیں وہ خوب صورت تحریروں کا معطر مجموعہ ہے جو "پرانے چراغ" کے نام سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا پاکستان کو اسلام کی ایک تجربہ گاہ سمجھتے ہیں۔ "مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش" میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ پاکستان کا:

> "یہ تجربہ جو اپنی اہمیت، نزاکت اور اپنے دُور رس نتائج کے اعتبار سے تاریخ کا ایک اہم ترین اور عہد آفرین واقعہ تھا، ان ہی راہنماؤں کے ہاتھوں کامیاب ہو سکتا تھا جو اسلامی شریعت کی ابدیت اور اسلامی تہذیب کی برتری پر غیر متزلزل ایمان رکھتے ہوں، جن کا خلوص اور صداقت، خود غرضی مفاد پرستی اور مصلحت کوشی سے پاک اور ہر شبہ سے بالاتر ہو، ان کا ذہن مغربی اقدار و افکار کی غلامی اور ان کی سیرت غیر اسلامی تعلیم و تربیت کے اثرات سے بالکلیہ آزاد ہو چکی ہو اور ایمان راسخ اور اخلاقی جرأت کے ساتھ جدید علوم کے پیدا کردہ وسائل اور قوتوں کو اپنے اعلیٰ دینی و اخلاقی مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی قدرت اور آزاد و جدید اسلامی معاشرہ

کے ماحول کے مطابق ان کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔"

(ص ۱۰۰)

اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

"پاکستان کا اپنے بنیادی مقاصد سے انحراف اور عصر حاضر کی دوسری نامذہبی اور تجدد پسند حکومتوں کی تقلید تاریخ جدید کا ایک عظیم سانحہ ہوگا اور ان کروڑوں افراد کے ساتھ بے وفائی جنھوں نے اس اسلامی معمل اور تجربہ گاہ کے قیام کے لیے شدید ترین تکالیف برداشت کیں اور عظیم قربانی پیش کی۔ اس سے بڑھ کر اس کا نقصان یہ ہوگا کہ یہ طرزِ عمل ہمیشہ کے لیے اس اُمنگ، اور آرزو کو سرد کر دے گا اور اس تجربہ کی کامیابی کے امکان کو اگر ختم نہیں تو نہایت بعید بنا دے گا۔" (ص ۱۰۳)

یہ چند باتیں میں نے اس لیے آپ کے سامنے پیش کیں تاکہ پاکستان کے حوالے سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب کے خیالات سے آپ متعارف ہوسکیں۔ ان کی تحریروں میں غیر معمولی تنوع ہے۔ انھوں نے عہد جدید بے شمار مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تصانیف سے لاتعداد لوگوں نے استفادہ کیا ہے اور یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ حضرت مولانا آج ہماری مادرِ علمی میں نہ صرف موجود ہیں بلکہ آپ سے ابھی خطاب فرمائیں گے۔

ان الفاظ کے ساتھ میں مولانا کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ وہ جامعہ کراچی میں تشریف لائے اور سب کی طرف سے مولانا کو خوش آمدید کہتے ہوئے ان کا خیر مقدم کرتا ہوں: ع

آمد آن یارے کہ ما می خواستیم

(۲۶ رمئی ۱۹۸۴ء)

ڈاکٹر سہیل بخاری: ایک تعارف

ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصانیف پر نظر ڈالیے تو ان میں آپ کو ایک ایسا تنوع نظر آئے گا جو کم لکھنے والوں کے ہاں ملتا ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں تحقیق و تنقید ملتی ہے جس کے تحت جہاں "ناول نگاری" کے موضوع پر ایک کتاب ملتی ہے وہیں "سب رس پر ایک نظر"، "باغ و بہار پر ایک نظر"، "غالب کے سات رنگ" اور "اقبال: مجدد عصر" کے عنوانات کے تحت ان کی کتابیں سامنے آتی ہیں۔ اردو داستان کو بھی ہم اسی ذیل میں لا سکتے ہیں۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں بہت کم کام ہوا ہے۔ لے دے کر دو چار کتابیں ہیں جن میں کلیم الدین احمد کی "فن داستان گوئی" اور گیان چند جین کی "اردو کی نثری داستانیں"، جس کا حال ہی میں ترمیم شدہ ایڈیشن اپریل ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا ہے، یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔ سید وقار عظیم کی کتاب "ہماری داستانیں" بھی اسی ذیل میں شامل کر لیجیے۔ ان کے علاوہ چند مضامین کو چھوڑ کر داستانوں پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی زیر نظر تصنیف "اردو داستان" یقیناً اس موضوع پر ایک اضافہ ہے۔ داستانوں نے اردو کو زبان و بیان کے نئے کینڈے اور اظہار کے ایسے رنگا رنگ اسالیب دیے ہیں کہ اہل علم کو داستانوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ پچاس کے عشرے میں حسن عسکری مرحوم نے "طلسم ہوشربا" کا ایک انتخاب شائع کیا تھا اور اس انتخاب سے اردو ادب کے پڑھنے والوں میں داستانوں کا چرچا شروع ہوا تھا۔ بعض لکھنے والوں نے اس کے کرداروں اور اسالیب کو اپنی تخلیقی تحریروں میں استعمال بھی کیا تھا لیکن ان داستانوں کو پڑھنے کی بہت کم لوگوں کو توفیق ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان

داستانوں کو دوبارہ پڑھا جائے اور ان سے وہ رنگ ونور اخذ کیا جائے جو ان ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی داستانوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی تصنیف سے اردو داستانوں کی طرف نہ صرف رغبت پیدا ہوتی ہے بلکہ میرا خیال ہے کہ آنے والے دور میں اردو داستانیں اور بالخصوص طلسم ہوشربا کا احیاء ہوگا اور ہمارے لکھنے والے اس بحر زخّار میں غوطہ زنی کر کے اہل ادب کے سامنے سچے موتی چُن کر لائیں گے۔ جب تہذیبیں اپنے سوتوں سے کٹ جاتی ہیں تو ان کے ادب کا وہی حشر ہوتا ہے جو ہمارے ادب کا ہوا ہے۔ ہم مغرب، کے چبائے ہوئے باسی لقموں کو آخر کب تک چباتے رہیں گے۔ آپ مغرب سے سب کچھ سیکھیے لیکن اپنی فضا، اپنے موسم میں سانس لیجیے۔ اسی سے آپ کی اور آپ کے ادب کی شناخت پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کی اس تصنیف سے ہمیں یہی راستہ ملتا ہے۔

یہ بات تو میں نے ضمناً کہہ دی۔ آپ چاہیں تو اسے جملۂ معترضہ کہہ لیجیے۔ میں تو ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب کی تصانیف کے تنوع کی بات کر رہا تھا۔ ان کا ایک اور اہم موضوع زبان و لسانیات ہے جس کے تحت ہم ان کی دو کتابوں "اردو کا روپ" اور "اردو کی کہانی" کو رکھ سکتے ہیں۔ یہاں میں ایک اور کتاب کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہتا ہوں اور وہ ہے "اردو کا اشتقاقی لغت"۔ یہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی لغت ہے اور اس پر بھی ہمیں دل کھول کر ڈاکٹر سہیل بخاری کو داد دینی چاہیے۔ ایک اور کتاب ان کی "تصور الوہیت" کے بارے میں ہے جسے آپ مابعد الطبیعیات کے ذیل میں لا سکتے ہیں۔ لیکن اس کتاب کی طرف ہمارے صاحبان نظر کی نظر اس لیے نہیں گئی کہ ہم تو مابعد الطبیعیات کو کبھی کا ترک کرنے کی نیت کر چکے ہیں۔ بے چارے حسن عسکری برسوں اس کی طرف توجہ دلاتے رہے مگر ہم بحیثیت قوم اس کام کو، جس سے ہم اپنے تہذیبی سوتوں کو تلاش کر سکیں، خیر باد کہہ چکے ہیں۔ آخر ہم سائنس و ٹیکنولوجی کے مینار سے شیخ محی الدین ابن العربی کی رجعت پسندانہ خیالات کیوں سنیں گے ؟۔ بہرحال ایک آدھ کتاب اور ہے جس کا نام مجھے اس وقت یاد نہیں آرہا ہے۔ شاید وہ کتاب جسے ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب نے اس

خاکسار کے نام معنون کیا تھا۔

ان سب تصانیف پر نظر ڈالیے تو سہیل بخاری صاحب ہمیں اس دور کے ایک بڑے اور اہم لکھنے والے نظر آئیں گے۔ ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیے اور ان کا حق یقیناً ان کو پہنچانا چاہیے۔

(۱۲؍ جولائی ۱۹۸۷ء)

بچّوں کی شاعری ؛ محشر بدایونی

حضرت محشر بدایونی شاعر بھی اچھے ہیں اور انسان بھی۔ انسان کی پہچان تو خیر ذرا دیر میں ہوتی ہے لیکن شاعر کی حیثیت سے آج سارے برعظیم میں ان کی شہرت ہے۔ کوئی اچھا مشاعرہ ان کے بغیر اچھا نہیں ہوتا۔ جہاں جاتے ہیں اپنے شعروں سے دلوں میں اُتر جاتے ہیں۔ یہی اچھے شاعر کی پہچان ہے اور اسی لیے میں ان کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ لیکن اس قدر دانی کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ وہ جہاں بڑوں کے لیے شاعری کرتے ہیں وہاں بچوں کے لیے بھی ایسی شاعری کرتے ہیں کہ بہت کم شاعر ان کے رتبے کو پہنچتے ہیں۔ محشر بدایونی صاحب نے دوسرے شاعروں کی طرح بچوں کا حق نہیں مارا بلکہ دل لگا کر محبت کے ساتھ ایسی شاعری کی ہے کہ قوم کے بچوں کی کثیر تعداد ان کی پرستار ہے۔ ۱۹۶۱ء میں "بین باجے" کے نام سے ان کی نظموں کا ایک مجموعہ چھپا تھا جس کی نظمیں آج بھی بچوں کو یاد ہیں۔ یاد اس لیے ہیں کہ ان میں شاعرانہ مٹھاس بھی ہے اور بہتے دریا کی سی روانی بھی۔ ۱۹۶۲ء میں "شاعر نامہ" کے نام سے ان کا ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں امیر خسرو سے لے کر مجاز تک اردو شاعروں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں "سائنس نامہ" کے نام سے ایک اور مجموعہ شائع ہوا جس میں جابر بن حیان سے لے کر ابونصر فارابی تک مسلم سائنس دانوں کو بچوں سے متعارف کرایا تھا۔ یہ دونوں مجموعے بچوں میں مقبول ہوئے لیکن "بین باجے" کی نظمیں بچوں کے ادب میں یقیناً اضافہ ہیں۔ اب برسوں بعد ان کا زیر نظر مجموعۂ کلام "جگ مگ تارے" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان نظموں میں بھی وہی تازگی، وہی سادگی اور وہی رچاوٹ ہے جو "بین باجے" میں ملتی ہے،

لیکن تخیّل کی پرواز اور بچّوں کی نفسیات نے شاعرانہ اثر کو اور بڑھا دیا ہے۔ یہ سب نظمیں ایسی ہیں کہ جس بچے کے ہاتھ لگ جائیں وہ انھیں کا ہو کر رہ جائے۔ بڑے پڑھیں تو ماضی کے دریچے کھل جائیں اور بچپن کی جنّت سے آنے والی خوشبو سے سارا وجود تازہ دم ہو جائے۔ بچے پڑھیں تو ان میں نئی دنیاؤں کے سفر کا حوصلہ پیدا ہو اور ذہن کی تربیت ونشوونما ہو۔

بچّوں کے لیے شاعری کرنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اچھی شاعری کیجیے تو پتّا پانی ہو جائے۔ یہ بات تو سب کہتے ہیں کہ بچّے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں لیکن کتنے شاعر ہیں جو اس بات کو اپنے عمل سے آگے بڑھاتے ہیں۔ اسی لیے میں محشر بدایونی کا قدردان بھی ہوں اور مدّاح بھی۔ بچّوں کی شاعری میں مَیں انھیں اسی روایت کا علم بردار سمجھتا ہوں جس کی ابتدا اسمٰعیل میرٹھی نے کی تھی۔ محشر بدایونی اسی روایت کے ممتاز شاعر ہیں۔ اب جب کہ میں محشر بدایونی کے بارے میں لکھ رہا ہوں تو اس موقع پر ان سے ایک آدھ فرمائش بھی کرتا چلوں۔ اردو شاعری میں شادی بیاہ، سالگرہ، تہوار، آزادی وغیرہ کے گیت تو ہیں جو مل جُل کر گائے جاتے ہیں لیکن ایسے گیت نہیں ہیں جو مختلف سماجی موقعوں پر کورَس کی صورت میں گائے جاسکیں۔ یہ اس دور کے بچّوں کی بُنیادی ضرورت ہے مثلاً بچے میچ دیکھ رہے ہیں۔ جذباتِ مسرت سے اُن کے دل معمور ہیں۔ اب ایسے موقع پر اگر کسی گیت کے بول، جس کی دُھن مقرر ہو اور جسے بچّوں نے اپنے اسکول میں دیکھا اور مل کر گایا ہو، ہونٹوں پر آکر کورَس بن جائے تو اس سے ایک طرف نظم وضبط پیدا ہوگا، جذبۂ حب الوطنی بیدار ہوگا اور ساتھ ساتھ بچّوں کے جذبات کا تزکیہ (کیتھارسس) بھی ہو جائے گا۔ غور کیا جائے تو جدید زندگی میں بے شمار ایسے موقعے آتے ہیں جہاں بچّوں کو مل جل کر گانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ محشر صاحب یہ کام سلیقے سے کر سکتے ہیں۔ یہی گیت بچے بڑے ہو کر ایسے موقعوں پر کورَس کی صورت میں گائیں گے اور اس طرح یہ قومی گیت بن جائیں گے۔ اس قسم کے گیت ہماری قومی ضرورت ہیں۔ یہی پاکستانی قوم کی شناخت اور ہمارے

قومی مزاج کے ترجمان بنیں گے۔ محشر صاحب کے اس مجموعے میں اس قسم کے گیتوں کی ہلکی سی جھلک مجھے "ہم بچے ہمت والے ہیں"، "آزادی کا دن"، "جاگ رہا ہے پاکستان" میں ملتی ہے۔

حضرت محشر بدایونی کا یہ مجموعہ ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ بچے اسے پڑھیں اور اس سے لطف اندوز ہوں۔ مجھے امید ہے کہ محشر صاحب بچوں کی نظموں کی طرف اب اور توجہ دیں گے اور بچوں کی شاعری کے اس خلا کو بھی جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں سے پُر کر دیں گے۔[1]

(۱۸ر اگست ۱۹۸۴ء)

---

[1] پیش لفظ "جگ مگ تارے" از محشر بدایونی

بچّوں کی نظمیں ؛ شان الحق حقی

شان الحق حقی صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ ان کا قلم چوطرف چلتا ہے۔ وہ "غزل" بھی کہتے ہیں اور "نظم" بھی اور دونوں اپنے رنگ کی۔ ترجمہ کرتے ہیں تو ترجمے کو بھی "اصل" بنا دیتے ہیں۔ وہی لہجہ، وہی سبھاؤ جو اصل میں ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا حقی صاحب نے کہہ مکرنیاں اور پہیلیاں لکھیں اور ایسی لکھیں کہ حضرت امیر خسرو کی یاد تازہ ہوگئی۔ چھوٹے بڑے سب بوجھنے بیٹھ گئے اور گھنٹوں مزے لیتے رہے۔ نثر لکھنے پہ آئے تو افسانے بھی لکھے اور خوبصورت مضامین بھی۔ لطف یہ کہ نثر بھی نظم کی طرح چٹخارے دار۔ جو پڑھے زبان و بیان کا مزا لے۔ اس بار وہ بچّوں کے لیے مزیدار نظموں کا دلفریب تحفہ لے کر آئے ہیں — "سہانے ترانے"۔ میرے سامنے رکھا ہے۔ میں نے ایک ایک نظم پڑھی۔ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کئی نظمیں بچّوں کو بلا کر سنائیں۔ سب نے لطف اٹھایا اور بچّوں نے بھی مزے لے لے کر سنیں۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو بچّے پسند کرتے ہیں۔ مشاہدات بھی ہیں، دلچسپ کہانیاں بھی۔ کہاوتوں کو بھی نظم میں ڈھالا ہے۔ معلومات بھی ہیں، چہلیں بھی ہیں اور اٹکھیلیاں بھی۔ تو تو مَیں مَیں بھی ہے اور لڑائی جھگڑا بھی، چیخ پکار بھی، شور شرابا بھی، ہنسی مذاق بھی ہے، دھینگا مشتی بھی۔ ان نظموں کو پڑھ کر میلے کا سا سماں بندھ جاتا ہے۔ بہت عرصے بعد بچّوں کی ایسی اچھی نظمیں پڑھنے کو ملی ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔ اپنے امّی ابّو کو بھی سنائیے اور آپا، باجی کو بھی، بھیا کو اور بھائی جان بھی۔ سب پسند کریں گے۔

قوم کے ادیب بڑے بوڑھے اور راہبر و راہنما یہی کہتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے

ہیں لیکن جیسے وہ اپنے مستقبل سے بے پرواہ ہوگئے ہیں اسی طرح بچوں کے مستقبل سے بھی۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے لکھنے والے ہیں۔ سب ایک سے ایک طرّم خاں مگر کیا مجال کہ بچوں کا ذرا بھی خیال ہو۔ نہ اُن کے لیے لکھتے ہیں، نہ اُن کے لیے سوچتے ہیں۔ کہنے یہی جاتے ہیں کہ بچے قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ ذرا ان سے کوئی یہ تو پوچھے کہ قبلہ! آپ کی بات سر آنکھوں پر لیکن آپ نے خود بچوں کے لیے کیا لکھا ہے؟ بچوں کو تو روز ایک کتاب چاہیے۔ اچھی لکھی ہوئی، اچھی چھپی ہوئی۔ تصویروں اور خاکوں سے جی ہوئی۔ جن سے اُن کی تربیت ہو، جنھیں پڑھ کر وہ سوچیں سمجھیں۔ اُن کی معلومات میں اضافہ ہو۔ ان کا ذہن کھُلے اور مستقبل۔ کے لیے وہ تیار ہو جائیں۔ آپ ان کے لیے کیا کرتے ہیں؟۔ اُن کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ وہ تو بس خالی جمع خرچ کرتے ہیں۔ ہم تو جب جانیں کہ ہمارے سب لکھنے والے اپنے اور اپنی قوم کے بچوں کے لیے اچھی اچھی کتابیں لکھیں۔ اتنی کتابیں کہ لائبریریاں بھر جائیں اور بچے ان کو پڑھنے پر تُل جائیں۔ وہ کیسا اچھا زمانہ ہوگا کہ قوم کے سب بچے گاؤں، دیہات کے بچے، قصبوں، شہروں کے بچے سب ان کتابوں کو پڑھ رہے ہوں گے اور واقعی قوم کا مستقبل سنوَر رہا ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ شان الحق حقی صاحب اس ایک مجموعے پر بس نہیں کریں گے بلکہ بچوں کے لیے نہ صرف ڈھیر ساری نظمیں لکھیں گے بلکہ نثر میں بھی نئی نئی کتابیں لکھیں گے۔ معلومات کی کتابیں، سائنس کی کتابیں، کہانیوں کی کتابیں، مُہمّات کی کتابیں، سفر کی کتابیں، حالاتِ زندگی کی کتابیں، اخلاق و روایت کی کتابیں غرضیکہ ہر طرح کی کتابیں جنھیں پڑھ کر بچے حقی صاحب کی لمبی عمر کی دعا مانگیں گے اور اچھے اللہ میاں بچوں کی دعائیں بہت سُنتے ہیں۔[1]

(۱۹۸۱ء)

---

[1] پیش لفظ "سہانے ترانے" از شان الحق حقی

نعت گوئی : احمد سہارنپوری

بچپن تھا اور میں گورنمنٹ ہائی اسکول سہارنپور میں پڑھتا تھا۔ اس زمانے میں شام کو کھیلنا بھی تعلیم کی طرح ضروری تھا۔ کھیل کے میدان میں باقاعدہ حاضری ہوتی تھی۔ جو نہ جاسکتا وہ درخواست دیتا ورنہ غیر حاضر ہونے پر جرمانہ ادا کرتا۔ شام کو گھر سے کھیل کے میدان جانے کے لیے نکلتا تو محلہ شاہ مدار راستے میں پڑتا۔ محلّے میں بائیں طرف ایک مکان تھا جس کے باہر کے دروازے پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ میرے ہم جماعت نے بتایا کہ یہاں ایک شاعر احمد صاحب رہتے ہیں۔ ایک دن میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ بازار جارہا تھا کہ راستے میں ایک صاحب ملے۔ درمیانی سا قد، گٹھا ہوا جسم، سانولا رنگ، گول گول، بھرا بھرا چہرہ اور اس پر بڑی بڑی مونچھیں۔ شیروانی پہنے ہوئے لیکن اس کے سارے بٹن کھلے ہوئے جس میں سے باریک ململ کا کرتا جھانک رہا تھا۔ میں نے سلام کیا۔ انھوں نے جواب دیا۔ والد صاحب نے بتایا کہ احمد صاحب بہت اچھے شاعر ہیں اور بہترین نعتیں کہتے ہیں۔ والد صاحب اور احمد صاحب باتیں کرتے رہے اور میں انھیں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اچھا! شاعر ایسے ہوتے ہیں۔ ادب کا چسکا مجھے بچپن سے تھا۔ اس زمانے میں بھی میں بچّوں کے رسالے "پھول اور غنچہ" کا خریدار تھا اور پبلک لائبریری لاہور کی کتابیں باقاعدگی سے منگواتا اور پڑھتا تھا۔ نئی کتاب مل جاتی تو گویا جنت کی کنجی ہاتھ آجاتی۔ پھر یہ ہوا کہ جب بھی حضرت احمد سہارنپوری آتے جاتے رستے میں مل جاتے تو میں انھیں ادب سے سلام کرتا اور وہ بڑی محبت سے جواب دیتے۔

میں بی اے کا طالب علم تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء کی بات ہے کہ حضرت احمد کا مجموعۂ کلام

"ہلالِ یثرب" کے نام سے شائع ہوا اور میں نے اسی زمانے میں پڑھا۔ آسان زبان لیکن اخلاص و محبت کی ایسی گرمی کہ شعر دل کو پکڑ لیتے تھے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے گہری عقیدت مسلمان گھرانوں کی تہذیب کا ایک حصہ ہے۔ محفلِ میلاد کا عام رواج تھا اور سہارنپور میں حضرت احمد سہارنپوری کا کلام نعت خوان نہایت خوش الحانی سے پڑھتے تھے۔ ان کا "سلام" تو اتنا مقبول تھا کہ ہر گھر میں میلاد کے موقع پر پڑھا جاتا تھا۔ اس زمانے میں ریڈیو کا رواج بھی عام ہو گیا تھا۔ ایک دن ریڈیو سن رہا تھا کہ اعلان ہوا "اب حضرت احمد سہارنپوری اپنا کلام پیش کریں گے۔" میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ انھوں نے بڑے اچھے انداز میں اپنی غزل سنائی۔ ریڈیو سے ان کے شعر سن کر میں ان کا اور قائل ہو گیا۔ کچھ دن بعد ملے تو میں نے غزل کی تعریف کی۔ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے "کیا آپ بھی کچھ کہتے ہیں؟" بڑوں کے سامنے یہ کہنا کہ "جی ہاں میں بھی کہتا ہوں" اس زمانے میں بُری بات سمجھی جاتی تھی۔ میں نے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ نصرت تو کہتے تھے کہ آپ بھی شاعری سے شوق رکھتے ہیں۔ میں خاموش رہا۔

احمد صاحب غریب سہارنپوری کے شاگرد تھے اور نصرت قریشی احمد صاحب کے شاگرد تھے، جو میرے عزیز دوست اشتیاق احمد قریشی کے قریبی عزیز تھے۔ چند سال ہوئے نصرت قریشی لاہور میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ فن پر اچھی نظر تھی۔ اُستادانہ شعر کہتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک حضرت احمد سہارنپوری سے گاہ گاہ ملاقات ہوتی رہی۔ پھر میں پاکستان آ گیا اور چند سال بعد معلوم ہوا کہ احمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ اتفاق کی بات دیکھیے کہ ۳۵-۳۶ سال بعد جناب ضبط سہارنپوری نے ایک مجموعۂ کلام لا کر دیا اور مجھ سے کہا کہ ازراہِ کرم اس پر مقدمہ لکھ دیجیے، یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس نعتیہ کلام کو یہاں سے بھی شائع کیا جائے۔ کلام دیکھا تو ماضی کے دریچے کھل گئے اور خوشبو بھری تازہ ہوا کے جھونکوں سے دل و جان معطر ہو گئے۔ اپنے بچپن کے مقبول و مشہور شاعر کا کلام اتنے عرصے بعد پڑھا تو معلوم ہوا کہ اچھا شعر ہمیشہ اچھا ہوتا ہے اور وقت کی گرد اس پر نہیں بیٹھتی۔ وہی تازگی، وہی اخلاص کی مہک، وہی محبت کی گرمی اور عقیدت کا جوش اس میں محسوس ہوا۔ احمد سہارنپوری کا کلام عام روزمرہ کی زبان میں لکھا گیا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ اس میں

اخلاص کی وہ گرمی ہے کہ یہ عوام و خواص دونوں کے دلوں میں گھر کر لیتا ہے۔ اس میں ایسا سوز ہے جو دلِ عاشق میں ہوتا ہے اور اس سوز میں وہ والہانہ کیفیت ہے جو سرشاریِ عشق سے پیدا ہوتی ہے۔ رسول اللہؐ کی محبت کے گیت جس نے گائے، عقیدت کے پھول جس شاعر نے چڑھائے اس کا کلام ہمیشہ کے لیے تازہ ہو گیا۔ حضرت احمد سہارنپوری اردو کے ان نعت گو شعرا میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں جنھوں نے عشق رسولؐ سے سرشار ہو کر ایسا نغمہ چھیڑا جس کی لے آج بھی سرشار کیے دیتی ہے۔ ان کا کلام ہم آج بھی محفل میلاد میں سنتے ہیں اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ حضرت احمد سہارنپوری کا کلام ہے۔ وہ احمد سہارنپوری جو عاشق رسولؐ تھے، جو کوئے محمدؐ کے راہرو تھے، جو ساقی یثرب کے مے خوار تھے، جو کالی کملی والے کی محبت میں سرشار تھے۔ اسی لیے ان کے اشعار میں وہ اثر آج بھی محسوس ہوتا ہے جو عشق کی آگ سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ "ہلالِ یثرب" کی اشاعتِ نو سے حضرت احمد سہارنپوری کا نعتیہ کلام نئی نسلوں تک پہنچے گا اور یہ کلام پاکستان میں لکھے جانے والے نعتیہ کلام کی روایت کا "پیش رو" کہلائے گا۔[1]

(۳۱ اگست ۱۹۸۴ء)

---

[1] پیش لفظ

قومی شاعری : منظر ایوبی

منظر ایوبی ہمارے معروف شاعر ہیں۔ "تکلم" کے نام سے ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۸۱ء میں اور "شناخت" کے نام سے دوسرا مجموعہ ۱۹۸۴ء میں شائع ہو چکا ہے اور اب قومی شاعری پر مشتمل تیسرا مجموعۂ کلام "چڑھتا چاند، اُبھرتا سورج" کے نام سے آپ کے سامنے ہے۔ منظر ایوبی پختہ گو اور مشاق شاعر ہیں۔ انھیں غزل اور نظم دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ حد درجہ حساس ہیں اور دلِ درد مند بھی رکھتے ہیں۔ پاکستان ان کے لیے عشق بھی ہے اور حسرت بھی اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں شیرینی بھی ہے اور تلخی بھی۔ تلخی اس لیے کہ پاکستان ان کے خوابوں کی سرزمین ہے اور وہ اسے وہ بنانا چاہتے ہیں جس کا خواب ان کی نسل نے دیکھا تھا۔ ایک ایسا معاشرہ جہاں عدل و انصاف بھی ہو اور معاشی و معاشرتی مساوات بھی۔ یہی وہ سماجی شعور ہے جو منظر ایوبی کی شاعری میں اثر و تاثیر پیدا کرتا ہے۔ پاکستان کو اپنے خوابوں کی حقیقی سرزمین بنانے کا یہی جذبہ ہمیں "چڑھتا چاند، اُبھرتا سورج" کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اس شاعری میں حب الوطنی کی سرشاری قدم قدم پر محسوس ہوتی ہے۔ یہاں ان کے خواب شاعری کے روپ میں ڈھل گئے ہیں۔

منظر ایوبی نے اپنے اس مجموعۂ کلام کو ملی نغمے، رزمیہ نغمے، محنت کشوں کے گیت اور قومی نظمیں وغیرہ کے ذیلی عنوانات کے تحت تقسیم کیا ہے۔ ان عنوانات سے آپ اس مجموعے کے تنوع کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں، نغمے اور گیت کورس میں گائے جانے کے لیے لکھے گئے ہیں تاکہ شاعری کے ذریعے قومی آدرشوں، آرزوؤں، خوابوں اور حبِّ وطن کو قوم کی گردشِ خون میں شامل کیا جا سکے۔ قومی شاعری ہمارے متعدد شاعروں نے کی ہے۔

اس شاعری نے دلوں کو گرمایا بھی ہے اور نئے نئے خوابوں کو اُجاگر بھی کیا ہے لیکن اس شاعری کا بہت کم حصہ ایسا ہے، جس میں شاعرانہ جوہر بھی ہو اور معنویت بھی۔ سماجی شعور بھی ہو اور خوابوں کا اظہار بھی۔ منظر ایوبی کی شاعری میں یہ سب خصوصیات بیک وقت موجود ہیں۔

منظر ایوبی پی آر کے شاعر نہیں ہیں۔ جن شاعروں کی پی آر مضبوط اور تعلقاتِ عامہ استوار تھے انھوں نے ریڈیو، ٹیلی وژن کی مدد سے اپنے نغموں اور گیتوں کی دُھنیں بنوائیں اور انھیں مقبولِ عام بنانے کے لیے اس طرح کام کیا جس طرح صنعت کار اپنی اشیاء کی فروخت کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس مجموعے کی اشاعت کے بعد صاحبانِ نظر ان نظموں، نغموں اور گیتوں کی طرف بھی توجہ دیں گے تاکہ شاعری کے ذریعے قومی خوابوں کی فصل بونے کا کام سہل ہو سکے۔ زندہ قومیں اپنے قابلِ ذکر شاعروں کو پہچانتی ہیں اور میرا خیال ہے کہ منظر ایوبی صاحب ہمارے ایسے شاعر ضرور ہیں جن کو پہچاننا ہمارا تہذیبی فرض ہے۔ مجھے امید ہے کہ منظر ایوبی صاحب قومی شاعری کے اس عمل کو جاری رکھیں گے اور مختلف سماجی و اجتماعی موقع و محل کا لحاظ رکھتے ہوئے ایسے نغمے اور گیت بھی لکھیں گے جنھیں مختلف اجتماعات، جلسوں، جلوسوں، کھیلوں، مقابلوں، سفر، پکنک اور جشن وغیرہ کے موقع پر کورس کی شکل میں گایا جا سکے تاکہ نئی نسل میں اتحادِ فکر اور یک جہتی کا عمل تیز ہو سکے اور یہ کورس گیت / نظمیں ایسے مواقع پر ہمارے جذبات کی ترجمانی کر کے ہمارا تزکیہ (کیتھارسس) کر سکیں۔ اس قسم کے گیتوں اور نظموں کی میں منظر ایوبی میں غیر معمولی صلاحیتیں پاتا ہوں۔؎

(۱۹۸۵ء)

؎ پیش لفظ ’’چڑھتا چاند اُبھرتا سورج‘‘

اردو گیت : ڈاکٹر بسم اللہ نیاز

زمانے کو کس نے روکا ہے۔ ایسے گذر جاتا ہے جیسے آیا ہی نہیں تھا۔ تصوّر کی آنکھ سے دیکھیے تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے کہ میں ایک طالب علم تھا اور دنیائے ادب میں کچھ کر گذرنے کے ولولے سے ہر دم سرشار رہتا تھا۔ سوتے جاگتے بس یہی دھن تھی کہ مجھے ادیب بننا ہے۔ یہی منزل تھی اور یہی مقصودِ حیات۔ دن رات کتابیں پڑھنے یا علم و ادب کی باتیں کرنے میں گذر جاتے۔ ہر مہینے ادبی رسالوں کا اسی طرح انتظار رہتا جیسے دیدارِ محبوب کا۔ رسالوں میں ماہنامہ "نگار" بھی آتا تھا۔ "نگار" میں چھپی ہوئی ہر تحریر صحیفۂ آسمانی معلوم ہوتی تھی۔ اسی زمانے میں اردو گیتوں پر ایک مضمون "نگار" لکھنؤ میں چھپا۔ لکھنے والی کا نام بسم اللہ بیگم تھا۔ یہ نام میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سُنا تھا۔ مضمون پڑھا تو اچھا لگا اور اس میں لکھی ہوئی باتیں ایسی دل میں اُتریں کہ وہ آج بھی میرے شعور کے دھندلکوں میں جگنو کی طرح چمک رہی ہیں۔ محترمہ بسم اللہ بیگم صاحبہ سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ترقی پسند تحریک اردو ادب پر چھائی ہوئی تھی۔ وامق جونپوری، مُطّلبی فرید آبادی آرزو لکھنوی، حفیظ جالندھری اور میراجی کے گیت بہت مقبول تھے اور یہ قدیم صنفِ ادب نئے شعور و احساس کے ساتھ نئے شعرا میں مقبول تھی۔ قدیم صنفِ سخن نے جب عہدِ حاضر کی روح کو لفظوں میں سمیٹا تو یہ نئے گیت گردشِ خون میں شامل ہو کر معاشرے کے دل کی دھڑکن بن گئے۔ یہ دور اردو گیتوں کی مقبولیت کا ایک نیا دور تھا۔ اسی زمانے میں محترمہ بسم اللہ بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ دھان پان سی، سانولی سلونی سی، انتہائی شائستہ خاتون۔ نرم لہجہ، دھیمی آواز لیکن ایسی صاف کہ کانوں میں رس گھول دے۔ باتیں کریں تو پھول جھڑیں

اور احترام کرنے کو بی چاہے طالبات کی محبوب اُستاد۔ میری بہنیں بھی اُن کی شاگرد تھیں۔ کوئی ان کی شفقت کا ذکر کرتا۔ کوئی ان کی قابلیت کے گن گاتا۔ کوئی کہتا اللہ ایسا اچھا پڑھاتی ہیں کہ علم و ادب کا دریا شاگردوں کے ذہن کے کوزے میں سماجاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ برسوں سے گیتوں پر کام کر رہی ہیں اور دن رات اسی میں لگی رہتی ہیں۔ عمر عزیز کا بڑا حصّہ بسم اللہ نیاز صاحبہ نے اسی مقالے کی تیاری اور تصنیف پر لگادیا۔ کراچی یونی ورسٹی سے انھیں اس پر پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی ملی اور اب برسوں بعد ان کا یہ کام کتابی صورت میں شائع ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ لگن کے ساتھ اتنی محنت کم لوگوں نے اپنی تصنیف پر کی ہوگی اور اسی وجہ سے یہ ایک ایسی تصنیف ہے کہ اس موضوع پر آئندہ جو بھی کام کرے گا پروفیسر ڈاکٹر بسم اللہ کی کتاب کو نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ یہ کتاب گیت کے موضوع پر اردو ادب میں یقیناً ایک اہم اضافہ ہے۔

اس تصنیف کی بڑی خوبی یہ ہے کہ پروفیسر بسم اللہ صاحبہ نے اپنے موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ ایک طرف انھوں نے گیتوں کو برعظیم کی تہذیب و معاشرت سے ملا دیا ہے اور دوسری طرف ان کی ادبی و تخلیقی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ اپنے موضوع کی تلاش میں انھوں نے سارے قدیم و جدید ادب کو کھنگالا ہے اور ذرّہ ذرّہ جمع کر کے سلیقے سے اس مواد کو ایک خوب صورت گجرے کی صورت میں گوندھ دیا ہے۔ فاضل مصنف نے پورے مقالے کو جس طور پر مرتب کیا ہے اور جس طرح ابواب بندی کی ہے اس سے پوری کتاب، منطقی ترتیب کے ساتھ، اپنے پڑھنے والوں سے کلام کرنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے جہاں رجحانات و میلانات کا تجزیہ کیا ہے وہاں گیت نگاروں کے گیتوں کا تنقیدی مطالعہ بھی تفصیل کے ساتھ کیا ہے اور ذہنی دیانت داری کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ وہ میراجی کی کوشش کو سعی ناکام کہتی ہیں۔ آپ ان کی رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اسے بے وزن نہیں کہہ سکتے۔

اس تصنیف کا اسلوب بھی سادہ اور دل نشین ہے۔ ڈاکٹر بسم اللہ نے علمی مباحث کو عام بول چال کی معیاری زبان میں، اختصار کے ساتھ، اس طرح سمیٹا ہے کہ پڑھنے

والا پوری کتاب کو دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔ اس کتاب کی تصنیف پر میں پروفیسر ڈاکٹر بسم اللہ نیاز صاحب کو دلی مبارک باد دیتا ہوں اور ساتھ ساتھ ایک فرمائش بھی کرتا ہوں کہ ایک اور جلد میں وہ ان تمام گیتوں کو بھی یکجا مرتب کر دیں جو دورانِ تحقیق انھوں نے جمع کیے ہیں۔ یہ ایک بڑی خدمت ہوگی ورنہ یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہو جائے گا اور کوئی دوسرا اس لگن کے ساتھ انھیں پھر جمع نہیں کر سکے گا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ تصنیف دنیائے ادب میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جائے گی اور صاحبانِ علم پروفیسر بسم اللہ کو ان کے اس کارنامے پر خراجِ نیاز پیش کریں گے۔ؔ

(۱۹۸۵ء)

ؔ پیش لفظ : اردو گیت

جدید مرثیہ ؛ ڈاکٹر یاور عبّاس

سفر لمبا اور منزل دُور ہو تو پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی فرصت کہاں اور کسے ہوتی ہے؟ لیکن ایک دن، جب ڈاکٹر دلاور عباس اپنے بھتیجے ڈاکٹر رضا عباس کے ساتھ آئے تو میں نے محسوس کیا کہ عمرِ رفتہ آواز دے رہی ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو یادوں کے بے شمار چراغ تا حدِ نظر ٹمٹما رہے تھے۔ ان چراغوں کی روشنی میں بعض چہرے صاف نظر آ رہے تھے اور بعض اتنے دھندلا گئے تھے کہ پہچاننا بھی مشکل تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یادوں کے بوسیدہ مکان کی دہلیز پر یہودی مالک مکان آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور مکان کے اندر اور مکان کے باہر دُور دُور تک چراغ ہی چراغ ٹمٹما رہے ہیں اور میں تپتے ہوئے صحرا میں بارش کا منتظر ہوں۔

ریڈیو پاکستان کراچی کے سامنے "سعید منزل" میں ڈاکٹر ناصر عباس مرحوم اپنے سرخ و سفید رنگ اور سفید بالوں کے ساتھ، مریضوں کے ہجوم میں، میز پر جھکے ہوئے نسخے لکھ رہے ہیں۔ ایک میز پر اُن کے بیٹے ڈاکٹر یاور عبّاس بیٹھے ہیں اور مریضوں کو دیکھ رہے ہیں اور ایک کمرے میں ڈاکٹر دلاور عباس ناک پر رکھی ہوئی چھوٹی سی عینک کے بالائی حصے سے شمس زبیری کو دیکھ کر کوئی فقرہ چُست کر کے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ عباس پولی کلینک میں گہما گہمی ہے۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہے۔ مریض اور بیمار بھی ہیں۔ دوست احباب بھی ہیں اور شاعر و ادیب بھی۔ دوپہر ہو۔ گرمی یا سردی ہو۔ چائے سے خاص خاص احباب کی تواضع ہو رہی ہے۔ ڈاکٹر یاور عبّاس کے پاس مریضوں کا جمگھٹا ہے۔ جب فرصت ہوتی ہے تو وہ اٹھ کر میرے پاس آتے ہیں۔ شگفتہ چہرے اور مُسکراتے ہوئے ہونٹوں اور محبّت کی مٹھاس سے کانوں میں رس گھول دیتے ہیں۔ بُوٹا سا قد، بھرا بھرا جسم، سیاہ رنگے ہوئے بال،

بالوں میں تیل اور احتیاط سے جمی ہوئی مانگ، کھلتا ہوا گندمی رنگ۔ چوڑا سینہ اور سینے میں انسانی محبّت سے معمور، دھڑکتا ہوا دل، شریف النفس اور منکسر المزاج، باتیں ایسی کہ دل لگے، لہجہ ایسا کہ اپنائیت کی روشنی سارے وجود میں پھیل جائے۔ بات بات میں شعر و شاعری، بہت اچھے طبیب، بہت اچھے غزل گو اور بہت اچھے مرثیہ نویس۔ یہیں شاہد احمد دہلوی، شمس زبیری، کرار نوری، ارم لکھنوی، سلیم احمد، ڈاکٹر صفدر حسین، جوش ملیح آبادی، استاد قمر جلالوی، امید فاضلی سیّد آلِ رضا، ذوالفقار بخاری اور شہر کے بہت سے شاعروں اور ادیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ جیسے آزادی سے پہلے کتب خانہ علم و ادب دلّی میں ادیبوں کا مرکز تھا، اسی طرح "عباس پولی کلینک" کراچی شہر میں ایک ایسا مرکز بن گیا تھا جہاں ذرا دیر بیٹھئے تو کوئی نہ کوئی شاعر یا ادیب وہاں ضرور مل جاتا۔ ڈاکٹر یاور عباس شہر میں ہونے والے خاص خاص مشاعروں میں عام طور پر شرکت کرتے۔ غزل پڑھتے اور خوب داد پاتے۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر یاور عباس نے ایامِ محرّم میں اپنے گھر پر مجالسِ مراثی کا اہتمام کیا اور کم و بیش ہر قابلِ ذکر شاعر نے ان مجالس کے لیے ہر سال نیا مرثیہ لکھا۔ ان شاعروں میں جوش ملیح آبادی اور آلِ رضا بھی شامل تھے اور نسیم امروہوی اور امید فاضلی بھی۔ اور خود ڈاکٹر یاور عباس بھی۔ مجھے یاد ہے کہ وہ ہر سال کم از کم ایک نیا مرثیہ ضرور لکھتے اور اہلِ علم و ادب کے سدا روشن چراغوں کی اسی محفل میں سُناتے۔ محفل میں تل دھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ یہ محفلیں یادگار محفلیں تھیں۔ اگر ان محفلوں کی داستان لکھی جائے تو شہر کراچی کی علم پروری روشن ہو جائے اور لوگوں کو پتا چلے کہ ڈاکٹر یاور عباس نے کس طور پر برسوں اس شہر میں شعر و ادب کا نور پھیلایا ہے۔

اب نہ ڈاکٹر یاور عباس ہیں اور نہ جوش ملیح آبادی، سیّد آلِ رضا اور ذوالفقار بخاری بھی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ استاد قمر جلالوی اور ارم لکھنوی بھی اس جہان سے گذر گئے لیکن اس دور کی یاد اور ان محفلوں کی زندگی اب بھی میرے وجود کو تازہ دم کیے ہوئے ہے۔ جب تک ڈاکٹر یاور عباس زندہ تھے یہ محفلیں ہر سال سجتی تھیں اور اب میخانۂ حیات ویران ہوگیا ہے لیکن یاور عباس مرحوم کا کلام اب بھی تازہ اور زندہ ہے جوان کے لائق بیٹے ڈاکٹر رضا عباس کے ہاتھوں

شائع ہوکر سامنے آرہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ ہر سال ان کی برسی کے موقع پر ان کے مراثی کا ایک مجموعہ ضرور شائع کریں گے اور پھر ان کی غزلیات کا مجموعہ بھی اسی عرصے میں شائع کریں گے۔ ایک سعادتمند بیٹا اپنے باپ کے نام کو روشن و زندہ رکھنے کے لیے یہی کرسکتا ہے اور یہی انھیں کرنا چاہیے۔ اس طرح صاحبانِ علم کو معلوم ہوسکے گا کہ ڈاکٹر یاور عبّاس غزل گو کی حیثیت سے کتنے بلند پایہ شاعر تھے اور جدید مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ان کا کتنا اہم و بلند مقام ہے؟

ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیوں میں موضوعِ سخن تو یقیناً واقعاتِ کربلا ہیں لیکن انھوں نے ان واقعات کو دورِ حاضر کی روح سے اس طور پر پیوست کردیا ہے کہ ان کے مرثیوں میں ہماری روح کی آواز اور باطن کا کرب شامل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مرثیے ہیں متاثر کرتے ہیں اور ہماری رُوح میں اتر جاتے ہیں۔ ان مرثیوں کے مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یاور عبّاس مرحوم کو زبان و بیان پر کتنی قدرت حاصل تھی اور یہ قدرتِ بیان ہمارے دور میں کتنے شاعروں کو حاصل ہے؟ ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیوں کی زبان کوثر و تسنیم میں دُھلی ہوئی ہے۔ لفظوں کی ترتیب میں ایسا سلیقہ موجود ہے جو زبان پر قدرت اور مسلسل مشق و ریاض کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اسی سلیقے سے وہ لہجہ پیدا ہوا ہے جس میں مٹھاس بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ "دل گدازی" بھی ہے اور جادو بیانی بھی۔ یہ مرثیے ان کی روح کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور سُننے اور پڑھنے والوں کی روح میں اُتر جاتے ہیں۔ ان مراثی کی اشاعت تاریخِ مرثیہ میں یقیناً ایک اضافہ ہے اور میرا خیال ہے کہ صاحبانِ علم و ادب ان مراثی کو پسند کریں گے اور مرحوم کی شاعرانہ صلاحیتوں کی دل کھول کر داد دیں گے۔ خدا مرحوم ڈاکٹر یاور عباس کی مغفرت فرمائے اور فردوسِ بریں میں درجاتِ بلند عطا فرمائے۔ آمین

(۱۶ر مئی ۱۹۸۶ء)

---

۵۰ پیش لفظ۔

سلیم احمد کے بارے میں

یکم ستمبر ۱۹۸۳ء کی شام کو جب سلیم احمد کے جسدِ خاکی کو زیرِ زمین آرام کرنے کے لیے قبر میں اُتارا جا رہا تھا تو معاً میں نے محسوس کیا کہ ماضی کے دریچے کھُل گئے ہیں اور گذرے دنوں کے منظر ایک ایک کر کے تیزی کے ساتھ نظروں کے سامنے آ رہے ہیں۔

میں نے اور سلیم احمد نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میرٹھ نامی بستی میں کم و بیش ایک ساتھ کیا تھا۔ میرٹھ جس کی طویل تاریخ ماضی کے دھندلکوں میں گم ہے۔ وہ میرٹھ جہاں راون کی سُسرال تھی۔ وہ میرٹھ جسے اندر پرستھ کی تعمیر کے صلے میں پانڈوؤں کے سب سے بڑے بھائی یدھشٹر نے ماہی نامی معمار کو، جاگیر کے طور پر، دیا تھا اور جہاں اس نے اپنا محل تعمیر کیا تھا۔ اس محل کے آثار آج تک اندر کوٹ نامی محلے میں پائے جاتے ہیں۔ جاٹوں کی روایت کے مطابق، یہاں جہاراٹھ گوت آباد تھی اور یہی جہاراٹھ بگڑ کر میرٹھ ہو گیا۔ آج بھی اس پورے علاقے میں جاٹ کثرت سے آباد ہیں۔ یہ وہی میرٹھ ہے جو اس زمانے میں غزنویوں کی سلطنت میں شامل تھا جب لاہور اُن کا دارالحکومت تھا۔ فتح دہلی کے بعد قطب الدین ایبک نے غیاث الدین بلبن کو میرٹھ کا حاکم مقرر کیا تھا جس کی ایک مسجد کے آثار گڑھ مکتیشر میں آج بھی موجود ہیں۔ اسی میرٹھ میں میری اور سلیم احمد کی ملاقات ہوئی۔ ہم دونوں ایف۔ اے کے طالب علم تھے اور ادب کی دُنیا میں کچھ کر گذرنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ دن رات یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ یہی موضوعِ سخن تھا اور یہی مقصدِ زندگی تھا۔ ہم دونوں نئی نئی کتابیں پڑھتے، تبادلۂ خیال کرتے اور گھنٹوں انھیں مسائل میں گم رہتے۔ سلیم احمد اس وقت میرٹھ کے نوجوان شعرا میں سب سے ممتاز تھے۔ ہنر

تخلص کرتے تھے اور اقبال کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ "دائرۂ ادبیہ" کے ایک جلسے میں، جو ہر ہفتے فیض، عام کالج میں ہوتا تھا سلیم احمد نے ایک نظم سنائی تھی جس کا ٹیپ کا مصرع "انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب" تھا۔ یہ نظم اتنی پسند کی گئی تھی کہ ساری محفل مجسّم واہ واہ سبحان اللہ بن کر رہ گئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ دائرۂ ادبیہ کے ایک اور جلسے میں سلیم احمد نے جب ایک غزل سنائی تو لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور اس شعر پر تو وہ بے ساختہ داد ملی کہ آج بھی وہ آوازیں میرے وجود کا حصّہ ہیں :

زمین والوں کی مشکلوں کو سمجھ سکیں گے نہ عرش والے
کہ آسماں سے زمیں کے اوپر نگہ پڑتی ہے طائرانہ

اس زمانے میں سلیم احمد اور میں، بے قرار روحوں کی طرح، سارے میرٹھ شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے تھے۔ میرٹھ کالج کے ہوسٹل سے بھیّا وحیدالدین کی لال کوٹھی تک، وہاں سے بیگم پُل، خیر نگر، کنبوہ دروازہ، رشید چائے والے کی دوکان کبھی کوٹھی جنت نشان کی طرف، کبھی نواب اسمٰعیل خان کی کوٹھی کی طرف، کبھی رزمی صدیقی کے ہاں پُروا فیاض علی جہاں لیلیٰ مجنوں والے ماسٹر روپی سے ملاقات ہوئی اور کبھی بھینسالی گراؤنڈ اور نادر علی بلڈنگ، جہاں حکیم فرخ آبادی کا مطب تھا اور جہاں سلیم احمد کا گھر بھی تھا۔ کبھی سی پٹ بازار یا دیلی بازار سے ہوتے، اگزری سے گذرتے قاری محمد یونس کے گھر۔ اس تمام عرصے میں کسی نہ کسی ادبی موضوع پر گفتگو ہوتی رہتی اور یوں معلوم ہوتا کہ ہم جلد ہی کائنات کے رازہائے سربستہ دریافت کرلیں گے۔ اسی اثنا میں کام کے منصوبے بنتے۔ نئی تحریروں پر بات ہوتی۔

گرمیوں کے موسم میں ہم جہاں سے گذرتے چمیلی، موتیا اور بیلے کی خوشبوؤں سے گلی کوچے مہکے ہوتے۔ چاندنی راتوں میں رات کی رانی کی مہک قدم قدم پر تازہ دم کرتی۔ یہ خوشبوئیں آج بھی مشامِ جان کو معطر کیے ہوئے ہیں۔ ادب اور شعر و شاعری اس شہر کی روح میں اسی طرح شامل تھے جس طرح زر پرستی آج ہماری روح میں شامل ہے۔

اسی ادب پرور ماحول اور اسی تخلیقی فضا کا اثر تھا کہ فرزندانِ میرٹھ نے اردو ادب میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ آج ان کے نام تاریخِ ادب کا حصّہ ہیں۔ اسماعیل میرٹھی، اکبر وارثی، محمد حسن عسکری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، خلیق احمد نظامی، پروفیسر کرار حسین، انتظار حسین، سلیم احمد، شمیم احمد، عالمتاب تشنہ، احمد ہمدانی، امید فاضلی، قیصر زیدی، ڈاکٹر صفدر حسین، حفیظ میرٹھی، نخشب جارچوی، بوم میرٹھی، حامد اللہ افسر، ساغر نظامی، ندرت میرٹھی، وہ چند نام ہیں جن کے کاموں سے ہم سب واقف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ اپنی زندگی کے اسی زمانے میں سلیم احمد اور میں روز ایک افسانہ لکھتے۔ کبھی کرشن چندر کے رنگ میں، کبھی عصمت چغتائی، منٹو کے رنگ میں اور کبھی ناصر علی دہلوی کے رنگ میں ادب لطیف تخلیق کرتے۔ روزانہ شام کو بے مقصد سڑکوں پر گھومتے ہوئے کسی پیڑ کے نیچے یا کمپنی باغ کے سرسبز و شاداب لان پر بیٹھ کر اپنے اپنے افسانے پڑھتے، ان پر تبادلۂ خیال کرتے اور اگلے افسانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ دو تین سال کے عرصے میں ہم نے سینکڑوں افسانے لکھے اور بے شمار کتابیں پڑھیں۔ اس کاوش سے لکھنے کی مشق ہو گئی اور ادب کا ذوق سنور گیا۔

سلیم احمد کی وفات نے ماضی کے نہاں خانے میں جو دریچہ کھولا ہے اس سے یادوں کی برات اُتر آئی ہے۔ بہت سے دھواں دھواں چہرے صاف نظر آ رہے ہیں۔ گم شدہ واقعات کے سرے دوبارہ ہاتھ میں آ گئے ہیں۔ اسی زمانے میں تحریک پاکستان نے زور پکڑا، سلیم احمد نے خاکساروں کا بیلچہ سنبھال لیا اور میں لیاقت علی خان کے الیکشن میں مصروف ہو کر قرب و جوار کے گاؤں دیہات کے دوروں پر نکل گیا۔ اس دور میں تصورِ پاکستان نے ادب کی جگہ لے لی تھی۔ میں نے ایک پمفلٹ لکھا جس میں دو قومی نظریے کی وضاحت کے ساتھ پاکستان کی معاشی خوش حالی کو بیان کیا گیا تھا۔ پھر یہ ہوا کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان بن گیا اور ہم میرٹھ سے بچھڑ کر جب دوبارہ ملے تو کراچی میں تھے۔ وہ کراچی جو پاکستان کی شہ رگ ہے۔ جہاں ہم نے اپنی تعلیم پوری کی اور زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا اور وہ بنے جو آج ہم نظر آتے ہیں۔

سلیم احمد اب ہم میں نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنا سفر ہم سب سے پہلے طے کرلیا۔ میرٹھ میں بھی وہ مقبول اور ہر دل عزیز تھے اور کراچی میں بھی وہ سارے شہر کے محبوب تھے۔ زندگی ہی میں برادرم مظہر یوسف صاحب نے کہا تھا کہ وہ ان کا مجموعۂ کلام شائع کریں گے لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ کام جس کا آغاز مظہر یوسف صاحب نے سلیم احمد کی زندگی میں کیا تھا، ان کی وفات کے بعد پورا ہوگا۔ اکائی "تنظیم احباب میرٹھ" کی طرف سے شائع کی جارہی ہے لیکن دامے درمے قدمے اس کی اشاعت کا سہرا مظہر یوسف صاحب کے سر ہے۔ تنظیم احباب میرٹھ دراصل میرٹھ کالج اور فیض عام کالج کے ان سابق طلبہ کی ویسی ہی ایک انجمن ہے جیسی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ہے۔ یہ ایک ثقافتی انجمن ہے جو علم و ادب اور تعلیم و تہذیب کی اس شمع کو روشن رکھنا چاہتی ہے جو ہمیشہ سے فرزندانِ میرٹھ کا طرۂ امتیاز رہا ہے تاکہ یہ روشنی اسی طرح پاکستان کے در و بام کو بھی منوّر کرتی رہے جس طرح کبھی میرٹھ کے در و بام کو روشن کرتی تھی۔

سلیم احمد کا تخلیقی سفر جو میرٹھ میں شروع ہوا تھا کراچی میں اس وقت انجام کو پہنچا جب ان کی تخلیقی قوت اپنے شباب پر تھی۔ سلیم احمد نے شاعری میں، ڈرامے میں، فکر و تنقید میں، صحافت میں وہ کارنامے انجام دیے جن کا اثر عہدِ حاضر پر گہرا پڑا ہے اور جن کا رشتہ آنے والے زمانے سے بھی گہرا ہے۔ "اکائی" سلیم احمد کی شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے جس میں ان کی غزل کا منفرد لہجہ اور آہنگ و اسلوب متعین ہو جاتا ہے۔ یہ وہ مخصوص لہجہ ہے جس نے غزل کی روایت میں اضافہ کیا ہے اور جو تاریخِ غزل میں سلیم احمد کی پہچان ہے۔[۵]

(۱۹۸۵ء)

۵۔ پیش لفظ "اکائی"

صبا اکبر آبادی کی غزل

صبا صاحب اُردو کے اُن چند اہم شاعروں میں سے ایک ہیں جنھیں دنیائے ادب میں وہ مقام اب تک نہیں مل سکا جس کے وہ، اپنی قادر الکلامی اور شاعرانہ جوہر کے باعث بہمہ وجوہ مستحق ہیں۔ عمرِ عزیز کے اس حصے میں، جب عام طور پر تخلیقی سوتے خشک ہونے لگتے ہیں اور شاعری ورزش بن کر رہ جاتی ہے، صبا صاحب کا دریائے زیست اسی تخلیقی توانائی کے ساتھ آج بھی بھرا پُرا بہہ رہا ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ گذشتہ ۲۵ سال سے اپنے بہترین تخلیقی دور سے گذر رہے ہیں۔ ان کے پاس کہنے کے لیے بھی ہے اور کہنے کا سلیقہ و شعور بھی ہے۔ وہ اس عظیم روایت زبان، اور اس مخصوص نوری لہجے کے وارث ہیں جس نے میرؔ، جانِ جاناں اور غالبؔ جیسے شاعروں کی صورت گری کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے لہجے میں زور، ان کے اظہار میں توانائی اور بیان میں وہ تنومندی ہے کہ ان کی شاعری ہمارے باطن کے نہاں خانوں میں اتر جاتی ہے۔ میں اس بات کو آج پھر کہنا چاہتا ہوں کہ اگر صبا صاحب اکبر آبادی نہ ہوتے تو ایسی شاعری ہرگز نہیں کر سکتے تھے جیسی انھوں نے کی ہے۔ اور اس بات کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اکبر آباد، جو تاج محل کا مسکن ہے اور جسے عرفِ عام میں آگرہ کہتے ہیں، برعظیم کی دو قدیم زبانوں کے دریائے اثر کے سنگم پر واقع ہے۔ وہ دریا جو دلی میں بہتا ہے وہی دریا آگرے میں بھی بہتا ہے۔ اس کے راستے میں ایک مقام پر سنگِ سرخ کا بنا ہوا دہلی کا قلعۂ معلیٰ ایستادہ ہے اور تقریباً دو سو میل کی مسافت کے بعد ایک اور مقام پر سنگِ مرمر کا تاج محل سینۂ کائنات بن کر اہلِ نظر کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے۔ اکبر آباد کا مزاج سنگِ سرخ اور سنگِ سفید کے امتزاج سے

بنا ہے۔ یہ علاقہ ایک طرف گوپیوں والے کرشن کنھیا کی موسیقانہ لے کا وارث ہے اور دوسری طرف برج بھاشا کی شیرینی کا بھی حامل ہے۔ ساتھ ساتھ کھڑی بولی کی ترقی یافتہ صورت یعنی اُردو زبان کا ایک اہم مرکز بھی ہے اور اسی لیے اس کی تہذیبی ولسانی اہمیت ہمیشہ باقی رہی ہے اور اسی لیے اہلِ اکبر آباد ہمیشہ احساسِ افتخار سے سرشار رہے ہیں۔ دو زبانوں کا تہذیبی سنگم ہونے کی وجہ سے اہلِ اکبر آباد کی زبان بھی دوسرے علاقوں کی زبان سے زیادہ دل کش اور موثر رہی ہے۔ اگر محمد تقی میر اکبر آبادی نہ ہوتے تو وہ ایک طرف اپنی شاعری کی زبان کو وہ مزاج نہیں دے سکتے تھے جو انھوں نے دیا اور دوسری طرف وہ لہجہ وجود میں نہیں آسکتا تھا جو میر کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان کی زبان کے لہجے میں برج بھاشا اور اودھی کا وہ لوچ، وہ موسیقیت اور وہ تاثیر اسی طرح از خود ملی ہوئی ہے جس طرح پانی میں آکسیجن موجود ہوتی ہے۔ یہی اثر آپ غالب کی شاعری کے آہنگ میں محسوس کر سکتے ہیں اور یہی اثر نظیر اکبر آبادی کی شاعری کے لہجے اور آہنگ میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہی اثر مجھے صبا اکبر آبادی کے ہاں واضح طور پر محسوس ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ان کی شاعری کا آہنگ و لہجہ اردو شاعری کی عظیم روایت کا حصہ ہے۔ ان لسانی و تہذیبی اثرات کے شعور کے بغیر آپ صبا اکبر آبادی کی شاعری کی انفرادیت سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ان کی زبان سادہ ہے لیکن اس سادگی میں جو پُرکاری ہے اور اس سادگی و پرکاری سے جو لہجہ بنا ہے وہ اکبر آباد کے لسانی و تہذیبی مزاج ہی کی دین ہے۔ یہ بات جو میں نے کہی ہے دراصل ذرا سی وضاحت چاہتی ہے اور اس وضاحت کے لیے میں آپ کو صبا صاحب کے دو چار شعر سنانا چاہتا ہوں:

ماہیت پر کسی کی غور نہ کر
جو نظر آئے بس وہی ہے میاں

موت وہ ڈھیٹ بھکارن ہے کہ جان لینے کو
لاکھ چاہیں کہ نہیں آئے مگر آتی ہے

کیا مدتِ ہجر دو گھڑی ہے
یہ قبر کی رات سے بڑی ہے

جیتے جی تک شغلِ پیہم تھا یہی
مرتے مرتے نام تیرا ہی لیا

اُس بارگاہِ ناز کا اعجاز دیکھنا
میں چُپ رہا تو دستِ دعا بولنے لگا

ملتے کہاں ہیں ایسے محبت رسیدہ لوگ
کرتے رہو ہماری زیارت کبھی کبھی

ابھی تو قافلۂ خاک و خوں بھی گذرے گا
ابھی تو صرف چمن سے بہار گذری ہے

کسی بندے کی خدائی ہو تو اُس سے پوچھیں
کتنے دن لگتے ہیں بندے کو خدا ہونے تک

دل آئینہ تجلیٔ محبوب آئینہ
کھویا ہے عکس سلسلۂ انعکاس میں

بھیڑ تنہائیوں کا میلہ ہے
آدمی ۔ آدمی اکیلا ہے

بظاہر اس سادہ لہجے میں فقیرانہ بے نیازی کی ایک نرم سی کیفیت کے ساتھ ایک ایسی تیزی بھی چھپی ہوئی موجود ہے جو دل میں اُتر جاتی ہے۔ نرمی اور تیزی کے اسی امتزاج سے وہ لہجہ بنا ہے جو صبا صاحب سے مخصوص ہے۔ یہی لہجہ ان کی شناخت ہے۔

صبا صاحب نے اردو غزل کی تاریخ میں جو کچھ کیا ہے وہ اردو غزل کی روایت سے پوری طرح وابستہ رہ کر کیا ہے۔ انھوں نے بعض شاعروں کی طرح روایت سے دامن بچانے کی کوشش نہیں کی بلکہ روایت میں عصرِ حاضر کے مزاج کو شامل کر کے اسے بدلا بھی ہے اور وسیع بھی کیا ہے۔ اس میں نئی حسّیت کو سمویا بھی ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسی لیے صبا صاحب کی غزل ایک باشعور شاعر کے احساسِ زیست کا زندہ اظہار ہے اور اسی لیے ان کے شعر ہمارے دلوں کی ترجمانی کر کے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ ان کی غزل میں ماضی بھی محفوظ ہے اور حال بھی لیکن حال ماضی بن کر نہیں بلکہ ماضی حال بن کر محفوظ ہوا ہے۔

اردو غزل کی روایت میں لاتعداد شاعروں نے شعر کہے ہیں لیکن کتنے شاعر ہیں جنھوں نے اس روایت کو آگے بھی بڑھایا ہے اور میرا خیال ہے کہ صبا اکبرآبادی دورِ حاضر کے غزل گویوں میں اسی لیے ممتاز ہیں اور اسی لیے وہ ہماری ادبی تاریخ کا حصّہ ہیں:

اے ناقدانِ عیب و ہنر احتیاط سے
میری متاعِ عیب ہی جنسِ ہنر نہ ہو

(۱۴ر فروری ۱۹۸۵ء)

فارسی رُباعیاتِ غالبؔ کا اُردو ترجمہ

اب تو ہواؤں کا رُخ بدل گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب فارسی زبان ہمارا اوڑھنا بچھونا تھی۔ بچوں کی تعلیم کا آغاز جیک اینڈ جل وینٹ اپ دی ہل کے بجائے گلستان بوستان سے ہوتا تھا۔ لوگ شوق سے فارسی پڑھتے تھے۔ فارسی اشعار اور فارسی ضرب الامثال چشمۂ شیریں کی طرح زبان سے رواں تھیں۔ برعظیم پاک و ہند کی مسلم تاریخ، اور کم و بیش ساری علمی و ادبی میراث اسی زبان میں محفوظ تھی اور آج بھی محفوظ ہے لیکن فارسی زبان کے عدم رواج نے اس میراث کو ہمارے لیے بے معنی بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم آج اپنی تاریخ کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہیں۔ جو انگریزوں نے لکھ دیا ہمارے لیے مستند ہو گیا اور آج انھیں حوالوں سے ہم اپنی تاریخ کو پہچانتے ہیں اور اسے بے مایہ و حقیر جانتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمیں اپنی چیزیں کم تر اور اپنی میراث بے وقعت نظر آتی ہے۔ غور کیجیے کہ اٹھارویں صدی عیسوی تک ہمارا جو کچھ ادبی، علمی، تہذیبی و تاریخی سرمایہ تھا وہ زیادہ تر فارسی زبان میں تھا اور آج ہم فارسی زبان سے کم و بیش ناواقف ہیں۔ ماضی سے ہمارا رشتہ کمزور ہو گیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری جڑیں کھوکھلی ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہی صورت حال رہی تو مجھے یقین ہے کہ ہم اسی طرح تیسرے بلکہ چوتھے درجے کی قوم بن کر راہِ حیات کو طے کرتے رہیں گے۔ بہر حال جب میری قوم نے یہ طے کر لیا ہے کہ اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنی میراث کو ترک کر کے بیرونی تہذیب کو اپنائے گی تو پھر میں اور آپ کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ بقول اکبرؔ ؎

نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

حضرت صباؔ اکبرآبادی کو بھی میری طرح یہی خلش تھی اور اسی لیے انھوں نے

غالبؔ کی فارسی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کیا تاکہ بند چشمے کا مُنہ کھول دیں اور اہلِ ذوق کی تشنگی دور کرنے کا سامان مہیا کر دیں۔ غالبؔ ہمارا اعظیم شاعر ہے۔ ایک ایسا شاعر جو مسلم تہذیب کی علامت بن گیا ہے۔ وہ آج بھی ہمارا ایسا شاعر ہے جو مختلف موڑوں پر، زندگی کے مختلف تجربات کے دوراہوں پر ہمارے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر کے ہمیں تازہ دم کر دیتا ہے۔ غالبؔ کا اردو کلام بلا شبہ لافانی ہے لیکن اس کا فارسی کلام بھی اردو ہی کی طرح لافانی اور بے مثل ہے۔ اس کا اپنا لہجہ اور اس کا اپنا رس ہے لیکن ہم فارسی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر اس سے لطف اٹھانے کی اہلیت ہی گنوا بیٹھے ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے علمی، ادبی، تہذیبی و تاریخی سرمائے کو اردو میں منتقل کریں تاکہ بند قلعے کا دروازہ کھل جائے اور ہم اپنے ماضی کی میراث سے اپنا حقیقی تہذیبی رشتہ قائم کر سکیں۔ حضرت صبا اکبر آبادی نے کئی سال پہلے عمر خیام کی رباعیات کا اردو ترجمہ کیا تھا اور ایسا کیا تھا کہ ترجمے سُن کر روح کی کلی کھل اٹھتی تھی اور اب غالبؔ کی ۱۰۴ رباعیات کا اردو ترجمہ کر کے ایک اہم اور وقیع کام کیا ہے۔ غالبؔ نے فارسی میں ۱۲۷ رباعیات لکھیں جن میں سے ۱۰۴ کا ترجمہ اردو زبان میں اس طور پر ہوا ہے کہ اگر غالبؔ اپنی رباعیوں کا اردو میں ترجمہ کرتے تو میرا خیال ہے کہ وہ ایسا ہی ترجمہ کرتے جیسا حضرت صباؔ نے کیا ہے۔ ترجموں کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف غالبؔ کے لہجے، غالبؔ کی شاعری کے رس، غالبؔ کی فکری لطافتوں کے راز داں ہیں بلکہ انھیں اردو زبان، اس کے اسالیب، اس کے مختلف لہجوں اور اظہار و بیان پر پوری قدرت بھی حاصل ہے۔ یہ کام ہمارے دور میں حضرت صبا اکبر آبادی ہی کر سکتے تھے اور خوشی کی بات ہے کہ یہ کام انھوں نے ہی کیا ہے۔ صباؔ صاحب نے غالبؔ کی فارسی رباعیات اور اپنے ترجموں کو ساتھ ساتھ شائع کیا ہے اور اہلِ نظر دیکھ سکتے ہیں کہ ان ترجموں میں وہ تخلیقی شان موجود ہے جو غالبؔ کی فارسی رباعیوں میں نظر آتی ہے۔ یہ کام کر کے انھوں نے فارسی گو غالبؔ کو ہماری تہذیب کے آنگن میں لا کھڑا کیا ہے اور اس موقع

پر اگر میں حضرت صبا سے یہ فرمائش بھی کر بیٹھوں تو بے جا نہ ہوگا کہ حضرت صبا! فارسی کا چلن ہمارے دور میں بہت کم ہو گیا ہے۔ آنے والے زمانوں میں یہ چلن اور کم ہو جائے گا۔ اس لیے اگر وہ غالبؔ کی فارسی غزلوں کا اردو میں ترجمہ کر دیں تو نہ صرف اردو زبان پر احسان ہوگا بلکہ ہماری تہذیب کے چمن میں بہار آجائے گی۔ یہ بہت بڑا کام ہے لیکن سارے ملک میں اس کام کو صبا صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

غالبؔ نے خود کہا تھا:

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

آپ خود سوچیے کہ جب غالبؔ کا اُردو کلام جسے اس نے "بے رنگ من است" کہا ہے اتنا بول رہا ہے تو وہ فارسی کلام جسے غالبؔ نے "نقشہائے رنگ رنگ" کہا ہے ہماری تہذیبی زندگی میں کیسے کیسے نئے رنگ نہ گھولے گا! حضرت غالبؔ بھی جناب صبا سے اس رباعی میں شاید یہی کہہ رہے ہیں:

مائل بہ کرم عالم ایجاد رہے ۔۔۔ شاید مرا غم خانہ بھی آباد رہے
مجھ سے تو وہی مطربِ خوش خو اچھا ۔۔۔ جو دوسروں کے گیت پہ دل شاد رہے

(ہم کلام ص ۱۱۱)

اب دو چار رباعیاں اور سن لیجیے اور اندازہ کیجیے کہ حضرت صبا نے کیا خوبصورت ترجمہ کیا ہے:

شب کیا ہے سویدائے دلِ اہلِ کمال ۔۔۔ بڑھ جاتا ہے اور حسن کا زلف وخط وخال
معراجِ رسولؐ بھی ہوئی تھی شب میں ۔۔۔ اس سے بہتر نہیں تھا کوئی ہنگامِ وصال

اک روز شراب چھوڑنا ہے غالبؔ ۔۔۔ پھر ساقی کے ہاتھ جوڑنا ہے غالبؔ
کیا فائدہ یہ ہوائی توبہ کر کے ۔۔۔ رُخ دونوں طرف جو موڑنا ہے غالبؔ

افلاس کے عالم میں ہوئی تلخ حیات
طاعت بھی نہیں ہوتی بہ امید نجات
لے کاش نماز اور روزہ ہوتے
مشروط بہ مال جیسے حج اور زکوٰت

زاہد جنت میں کیوں قلانچیں نہ بھریں
اب تک نہ کیے تھے جو مزے کیوں نہ کریں
ان کا ہے وہی حال ز روئے تشبیہہ
چوپائے ہرے کھیت کو جس طرح چریں

غالبؔ تیرا سخن میں ہمسر تو نہیں
پھر بھی تو حدِ ہوش سے باہر تو نہیں
مے چاہتا ہے مفت نفیس اور بے حد
یہ پیرِ مغاں ساقئ کوثر تو نہیں

شادی جو کرے گا ہو گا دانا کیسے
افکار سے پھر جان بچانا کیسے
گھر ساری خدائی میں ہے گھر والی نہیں
پھر میرا خدا نہ ہو تو آنا کیسے

(۱۹ر مارچ ۱۹۸۷ء)

ضیا جالندھری کی شاعری

ضیا جالندھری چالیس پینتالیس سال سے شعر کہہ رہے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام "سرِشام" کے نام سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جب انھیں شاعری کرتے ہوئے چودہ پندرہ سال ہو چکے تھے۔ دوسرا مجموعۂ کلام تیرہ سال بعد "نارسا" کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا اور اس کے سترہ سال بعد ان کا تیسرا مجموعۂ کلام "خواب سراب" کے نام سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے ہر قسم کی ملازمت کی اور اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے مگر شاعری کا ہمزاد زندگی کی دھوپ چھاؤں میں سائے کی طرح ہمیشہ ان کے ساتھ رہا۔ ضیا جالندھری مجھے عزیز ہیں۔ عزیز اس لیے ہیں کہ ان میں شرافت اور وضع داری کی وہ خوشبو پائی جاتی ہے جو مجھے اچھی لگتی ہے۔ پھر اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میرے دو عزیز دوستوں کے عزیز دوست رہے ہیں۔ ایک میرے ہمجولی سلیم احمد اور دوسرے میرے بزرگ دوست، جنھیں میں محبت سے بڑا بھائی کہتا تھا، ابوالفضل صدیقی۔ اب دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اور میں ان دونوں کو ضیا جالندھری میں دیکھ کر خاموشی سے یاد کر لیتا ہوں۔ ضیا جالندھری کو عزیز رکھنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ وہ میراجی کے عاشق ہیں۔ میراجی نے جن لوگوں کی ادبی طور پر نگہداشت کی ان میں قیوم نظر، یوسف ظفر، الطاف گوہر اور مختار صدیقی کے علاوہ ضیا جالندھری بھی شامل تھے۔ ضیا جالندھری میراجی کی باتیں تفصیل اور جزئیات کے ساتھ اس طرح سناتے ہیں کہ اس دور کی تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ باتیں ایسے کرتے ہیں کہ آدمی سنتا رہے۔ ان میں رس بھی ہوتا ہے اور لطفِ زیست بھی۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ شاعر نثر لکھنے سے بھاگتا ہے۔ ضیا جالندھری نے زندگی میں جو کچھ دیکھا جن لوگوں سے

ملے اور جو باتیں اور ملاقاتوں کی کہانیاں ان کے حافظے میں محفوظ ہیں اگر لکھ نہیں سکتے تو بول کر ریکارڈ کرا دیں تو گذشتہ چالیس سال کا ادبی دور محفوظ ہو جائے گا۔

"خواب سراب" جب میں نے پڑھا تو یوں محسوس ہوا کہ "سرِ شام" اور "نارسا" کے خالق ضیا جالندھری تخلیقی سطح پر آج بھی اسی طرح تازہ دم ہیں جیسے پہلے تھے۔ اب ان کی شاعری میں وہ گہرائی اور ان کے اظہار میں وہ توانائی آ گئی ہے جو پڑھنے والے کی روح میں اتر کر اُسے شادکام کر دیتی ہے۔ اس مجموعے میں مجھے ایک بنیادی تبدیلی تو یہ محسوس ہوئی کہ اب وہ زندگی کے باطن میں اُتر کر اس کے تجربوں کو بیان کر رہے ہیں اور اس بیان میں زندگی کا گہرا شعور، فلسفہ و فکر کے روپ میں اُبھرتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ خارج اور باطن کے تجربوں کی آمیزش سے انھوں نے ایک نئی شاعرانہ بصیرت حاصل کر لی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اپنے پورے سیاسی، معاشرتی شعور کے باوجود ان کا لہجہ بہت کشادہ ہے۔ اس مجموعۂ کلام کی شاعری سے امکانات کے نئے دَر وا ہوتے ہیں۔

شاعری کے تیسرے مجموعے میں، جو چالیس سال شاعری کرنے کے بعد شائع ہوا ہوا ہے، اُنھوں نے شاعری کے نئے امکان کو دریافت کر لیا ہے۔ یہ مجموعہ ضیا جالندھری کی شاعری کے نئے مستقبل کی نوید دے رہا ہے۔

اپنی شاعری کے آغاز ہی سے وہ فطرت کے گوناگوں عوامل کو علامت کے طور پر استعمال کرتے اور انسانی جذبات کے ابلاغ کے لیے نئے نئے پیکر تراشتے رہے ہیں، اسی لیے ان کی شاعری توجہ چاہتی ہے۔ وہ توجہ جس سے شاعری کا طلسم اور اس کی تہیں کھلتی ہیں اور شاعری سے وہ حقیقی لطف میسر آتا ہے جو باذوق قاری کا اصل سرمایہ ہے۔ "خواب سراب" تک پہنچتے پہنچتے جب وہ باطن میں اُتر کر انسانی زندگی اور حیات و کائنات کو دیکھتے ہیں تو اعتبار پر اعتبار نہیں آتا۔ ابدی سچائی میں بہار اور خزاں ساتھ نظر آتی ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے اعتباری ہی اعتبار کی منزل ہے۔ برہنہ تہی دست شاخیں سیاہ ہو کر نئی کلیوں کی شمعیں روشن کر کے بہاروں کا پیغام دیتی ہیں۔ یہ ایک ابدی سچائی ہے مگر سچائی اور اعتبار کے باوجود:

بار ہا ہم نے دیکھا

بہاروں کے آنے سے پہلے

بہاریں اُجاڑی گئیں

اب کے پھر آرہی ہے بہار

پھر بشارت سے ڈرتا ہے دل

غنچے! کھول آنکھ رُک رُک کے کھول

کھِل پہ آہستہ آہستہ کِھل (بشارت)

یہ وہ نظر ہے جو ضیا جالندھری کے ہاں ایک نئے لہجے کو جنم دیتی ہے۔ یہی ژرف نگاہی اُن کی نظموں — معزول، بڑا شہر اور ہابیل میں نظر آتی ہے۔ اب وہ تجربے کو ساری زندگی کی ابدی سچائیوں پر پھیلا کر دیکھتے ہیں۔ ہابیل میں اس تجربے کی صورت یہ بنتی ہے:

اور قابیل سے ارشاد کیا تھا تُو نے

خونِ ہابیل کی ان ذرّوں سے بُو آتی ہے

پھیل کر اب وہی بُو سارے جہاں پر ہے محیط

کیا یہ بُو تا بہ ابد میرا مُقدّر ہو گی

کیا ترے اِذن سے قابیل کی خُو قائم ہے

کیا یہ خُو تا بہ ابد میرا مُقدّر ہو گی (ہابیل)

یہ لمحۂ موجود کو ابدی سچائیوں تک پھیلانے کا وہ تخلیقی عمل ہے جو صوفیا کا شیوہ رہا ہے:

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

"معزول" اور "بڑا شہر" میں بھی لمحۂ موجود کے اسی تجربے کو حیات و کائنات پر پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی صورت ہمیں اُن کی طویل نظم "بگولے" میں ملتی ہے۔

اس انداز کی طویل نظموں کو ضیا جالندھری ہی نے اُردو میں متعارف کرایا ہے۔ ان کے پہلے مجموعوں میں پانچ طویل نظمیں شائع ہو چکی ہیں۔ پہلی نظم "زمستان کی شام" جب

۱۹۴۷ء میں شائع ہوئی تو کچھ نقادوں نے کہا کہ یہ ایک نہیں بلکہ پانچ نظمیں ہیں جن کو یکجا کر کے ایک عنوان دے دیا گیا ہے مگر ذرا توجہ سے پڑھنے سے اس کے اندرونی رشتے واضح ہو جاتے ہیں۔ ان طویل نظموں میں ضیا جالندھری فطرت کی علامتوں کے ذریعے یا تو ایک ہی حقیقت پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے ہیں جس سے اس حقیقت کی کئی تہیں سامنے آتی ہیں یا پھر وہ تضاد کے اندر اُتر کر اصلیت کی تلاش کرتے ہیں۔ یہ نظمیں عمل، ردِعمل اور امتزاج کی منزلوں سے گذرتی ہیں اور یقیناً اُردو شاعری میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مجموعے میں طویل نظم "بگولے" بھی اس کی مثال ہے۔ اس نظم میں ضیا جالندھری نے چار بنیادی عناصر ــــ آگ، پانی، ہوا اور مٹی کو علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ یہاں آگ سورج کے روپ میں آتی ہے۔ یہ نظم ۱۹۶۹ء میں لکھی گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایوب خاں کا مارشل لا ختم ہوا تھا اور یحییٰ خاں کے مارشل لا کا آغاز ہوا تھا۔ مارشل لا کے بعد مارشل لا قوم کے لیے ایک مایوس کن مرحلہ تھا۔ یہی مایوسی اس نظم کا موضوع ہے۔ سورج یہاں آمر کی علامت بن گیا ہے جو اپنے جبر سے دشت و صحرا ہی کو نہیں شہر اور بستی کو بھی تباہ کر رہا ہے۔ اس کے مسلسل ظلم سے تنگ آ کر مٹی یعنی بسنے والے لوگ اور جبر کے شکار عوام بغاوت کر دیتے ہیں اور اس بغاوت کو ہوا (جذبات کی علامت) سے تقویت ملتی ہے۔ ہر چند یہ بغاوت کامیاب ہو جاتی ہے لیکن پانی (محبت، شعور، اظہارِ خیال کی آزادی) نہ ہونے کی وجہ سے پھر ناکامی کا منہ دیکھتی ہے اور خاک، جو آخر خاک تھی، دوبارہ جبر کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر شاعر پھر "پانی" (شعور اور اظہار کی آزادی) کے خواب دیکھنے لگتا ہے، جسے وہ محبت سے بھی زیادہ اہم سمجھتا ہے۔ اس نظم سے ایک طرح سے میرا ذاتی تعلق بھی ہے۔ یہ نظم دوسرے مارشل لا کے زمانے میں پہلی بار سہ ماہی "نیا دور" میں شائع ہوئی تھی۔ بات اگرچہ علامتوں کے ذریعے کہی گئی تھی مگر علامات بہت واضح تھیں۔ میرے نزدیک اس نظم کو شائع کرنے کا جواز یہ تھا کہ یہ علامات کسی ایک وقت یا ایک عہد کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمیشہ سے

ہوتا آیا ہے اور ہمیشہ ہوتا رہے گا کہ انسان اُمیدیں باندھتے ہیں، کوشش اور جد و جہد کرتے ہیں اور پھر ناکامیوں کا مُنھ دیکھتے ہیں۔ تاریخ کا یہ عمل خود ضیا جالندھری کی شاعری کا خاص موضوع ہے :

دل کہ ہے اسرار کا محرم یہ کہتا ہے
کہ ہے آزادیٔ حرف و بیان
موجِ محبت بھی سراب

میرے خواب
بادلوں میں بھیگتی برساتوں کے خواب

میرے خواب
پیار سے پُر آب آنکھوں
مدھ بھری راتوں، ملاقاتوں کے خواب

میرے خواب
خواب کے ذرّوں کے ہونٹوں پر
نڈر باتوں کے خواب (بگولے)

بگولے کے علاوہ جن نظموں نے مجھے خاص طور پر متاثر کیا وہ "سرد موسموں کا سورج"، "بشارت" اور "بڑا شہر" ہیں اور یقیناً منفرد شاعری کی ممتاز مثال ہیں۔ میں نے یہاں ضیا جالندھری کی غزلوں کی بات نہیں کی ہے۔ وہ پھر سہی۔

(۱۹۸۶ء)

قمر جمیل کے بارے میں

قمر احمد فاروقی جنھیں دنیائے ادب قمر جمیل کے نام سے جانتی ہے، ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جو دُنیوی امتیازات کے ساتھ ساتھ تصوف کا بھی اہم گھرانا رہا ہے۔ دائرۂ شاہ اجمل کے نام سے ہم سب ہی واقف ہیں۔ قمر جمیل اسی خاندان کے فرد ہیں۔ اس اعتبار سے ان کا خاص تعلق ایک طرف حضرت آسی غازی پوری سے ہے اور دوسری طرف ان کا تعلق، مسلم سیاست کے اہم رکن مولانا شاہد فاخری سے ہے۔ قمر جمیل نے الہ آباد یونی ورسٹی میں تعلیم پائی جہاں ان کا شمار یونی ورسٹی کے ذہین اور باصلاحیت طلبہ میں ہوتا تھا۔ قمر جمیل نے پاکستان آکر سنٹرل سپیریئر سروسز کا امتحان دیا۔ اس میں کامیاب بھی ہوئے لیکن پھر کیا ہوا اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بعد انھوں نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کرلی اور دورانِ ملازمت ایک طویل غیر حاضری کے بعد پھر اس سے وابستہ ہو گئے اور آج تک ریڈیو پاکستان ہی سے وابستہ ہیں۔

قمر جمیل اپنے طالب علم ساتھیوں میں اس اعتبار سے بھی منفرد تھے کہ وہ ابتدا ہی سے شاعری کا جوہر رکھتے تھے۔ حسّاس اور ایک بے چین و مضطرب شخصیت کے مالک۔ ان کے مزاج میں ان ہی خصوصیات کی وجہ سے ہمیشہ تلوّن رہا ہے۔ وہ کبھی ایک جگہ نہیں رُکے اور ذہنی ارتقار کے ساتھ ان کی شاعری کے موسم بھی بدلتے رہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں میں یکساں تخلیقی صلاحیت کے مالک ہیں۔ نثر بھی لکھتے ہیں اور تنقید بھی۔ تنقید میں بھی ان کا اسلوب ان کی شاعرانہ شخصیت کے زیر اثر رہتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت اور ذہنی فضا کئی پہلو رکھتی ہے۔ اس فضا میں تصادم

عناصر کا کردار نمایاں نظر آتا ہے۔ وہ بیک وقت ایک حساس شاعر اور روحانی حسیات کے مالک ہیں۔ وہ صوفی نہیں ہیں لیکن صوفیوں کی وارداتِ قلب سے آشنا ہیں۔ یہ سب عناصر ان کی شاعری اور نثر میں واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن ان کی ذات میں پوری طرح جذب ہو کر ایک اکائی نہیں بن سکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت متصادم و متضاد عناصر کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔

یہ سب باتیں میں نے اس لیے بیان کی ہیں تاکہ اس بات کا پتا چل سکے کہ قمر جمیل نے مختلف ادوار میں مختلف اسالیب کیوں اختیار کیے؟۔ ان کا ابتدائی کلام ایک بیانیہ انداز بلکہ خطیبانہ لہجہ رکھتا ہے۔ اس میں ایک جوش، ایک اندرونی اضطراب اور دوسروں سے براہِ راست مخاطب ہونے کی تڑپ ملتی ہے۔ وہ انسانی تاریخ کے بعض اہم لمحوں، قبائلی زندگی کے پُرجوش اور توانا جذبوں، قدیم تہذیبوں کے خوب صورت رنگوں کو اپنے اس انداز و لہجہ میں سمو کر ایک مخصوص تاثر پیدا کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ ان کا دوسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ قدرت سے ہم کلامی اور اس سے اپنی ذات کو وابستہ کرنے کا ایک خاص اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں فطرت سے ان کا تعلق گہرا اور بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کا تیسرا رنگ ان نظموں میں نظر آتا ہے جہاں وہ نرم لہجہ اور گداز کیفیات کو نئی شاعری کے بعض تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کرتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظموں میں گہری تاثیر اور جذبے کی صداقت موجود ہے۔

قمر جمیل نے بعض شعری تجربے بھی کیے ہیں مثلاً تین تین مصرعوں کی نظم کا تجربہ یا نثری نظموں کا تجربہ۔ تین تین مصرعوں کی نظم کے وہ اولین معمار اور اردو میں نثری نظم کی تحریک کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ "چہار خواب" اور "دریائے نیل کے سیلاب" سے لے کر نثری نظم تک قمر جمیل کا شعری سفر ایک خاص مطالعہ چاہتا ہے جو اس وقت ممکن نہیں ہے۔ میں تو یہاں قمر جمیل کی شاعری و شخصیت کے چند مختلف پہلوؤں کو سامنے لا کر ان کی حقیقی تخلیقی صلاحیتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں تاکہ جب آپ "چہار خواب" کا مطالعہ کریں تو اس سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ یہ ہمارے دور کے ایک اہم شاعر

کا ایک اہم اور قابلِ ذکر مجموعۂ کلام ہے۔

قمر جمیل کی نظموں میں قدیم خواب، اساطیر، تاریخ اور انسانی ارتقا کی جھلکیوں کے ساتھ موجودہ عہد کی بے چین فکر اور مضطرب حیاتِ انسانی ایک عجیب تناظر کو سامنے لاتی ہیں۔ گذشتہ دس سال کی شاعری میں قمر جمیل نے موجودہ عہد اور موجودہ انسان کے مسائل کو جس خوبصورتی اور فن کارانہ چابک دستی سے گرفت میں لیا ہے وہ اُن کی سچی شاعرانہ صلاحیتوں کی دلیل ہے۔ اسی لیے وہ ایک اہم جدید شاعر ہیں۔

قمر جمیل نے نظموں کے ساتھ غزلوں پر بھی پوری توجہ دی ہے۔ ابتدا میں ان کی غزلوں میں فطرت نگاری، اور انسانی فکر کے چند ایسے پہلوؤں، کی آمیزش ملتی ہے جو ان کی غزلوں کو ہماری روایتی غزل یا غزل کے خاص اسلوب سے مختلف بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ناصر کاظمی کے بعد سب سے زیادہ مسلسل غزل کہی ہے۔ قمر جمیل نے اِدھر جو غزلیں لکھی ہیں ان میں بعض غزلیں بڑی موثر اور غزل کے خاص اور نئے عناصر پر مشتمل ہیں۔ بیشتر غزلوں میں انھوں نے اپنے ذہنی وفکری تجربات کو اس طرح شامل کر دیا ہے کہ ہم ان کو نثری نظم کی مانند، ایک طرح کی نثری غزلیں کہہ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیے:

خواب میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کا دکھانا مشکل ہے
آئینے میں پھول کھلا ہے ہاتھ لگانا مشکل ہے
اس کے قدم سے پھول کھلے ہیں میں نے سُنا ہے چار طرف
ویسے اس ویران سرا میں پھول کھلانا مشکل ہے

غزل نے ہر دور میں اپنی تخلیقی وسعت اور امکانات کا ثبوت دیا ہے مگر اس کے لیے شاعری کا جوہر ضروری ہے۔ قمر جمیل نے بعض غزلوں میں جدید حسیت اور جن تجربات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے ان سے ایک نیا امکان اور ایک نیا راستہ کھل رہا ہے۔ ان غزلوں میں نیا پن اتنا اہم نہیں ہے جتنا بعض تجربات اور جدید حسیت کو غزل کے خاص مزاج کا حصّہ بنانے کی کوشش قابلِ توجہ ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں کہ چند ہی غزلیں ایک ایسا نیا راستہ دکھا دیتی ہیں جس سے آنے والی غزل اپنی توانائی حاصل کرتی ہے۔ "چہار خواب" کی ایسی غزلیں

جدید شاعروں کو یقیناً دعوتِ فکر دیتی ہیں:

شہر میں سب کی غیبتیں مجلسوں میں لڑاکری
پھر بھی مرے لہو میں ہے ایک عجب قلندری
چاند میں جیسے فاختہ شاخ پہ جیسے چشم نم
غم ہے عجیب کھو کھلا رات عجیب مسخری
رات بہشت میں مجھے اپنا خدا بھی مل گیا
میں نے اسی کو سونپ دی اپنی کلاہِ کمتری
اس کی گلی سے آئے ہیں لوگ یہ سوچتے ہوئے
آنکھ میں ہفت آسماں ہاتھ میں اک کبوتری

چلے آئے بات کرنے وہ سیاست جہاں پر
کہ سمندر دل میں جیسے کوئی پھینکتا ہو پتھر

ترے دل کے سائباں میں گرا میں عجب اچانک
کوئی سگ گزیدہ جیسے گرے اپنے گھر میں آکر

اپنے گھر کے آنگن میں جب بہار آتی ہے
لڑکیاں نکلتی ہیں سائبان سے آگے

آکے میری کھڑکی میں لامکاں ٹھہرتا ہے
عشق رقص کرتا ہے ہر گمان سے آگے

قمر جمیل نے "خواب نما" سے لے کر "چہار خواب" تک جو شعری سفر کیا ہے وہ

اپنے تمام تضادات کے باوجود اتنا متنوع اور ہمہ رنگ ہے کہ ہمیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قمر جمیل میں اس عہد کے بنیادی تصادم، تضاد اور تقاضوں کو طرح طرح کے اسالیب میں بیان کرنے کا جوہر موجود ہے۔ "چہار خواب" دراصل ان کے شعری سفر کا ایک انتخاب ہے جس میں انھوں نے ہر رنگ کے بہترین کلام کو شامل کر لیا ہے لیکن "چہار خواب" میں ان کی موجودہ نظمیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں جن میں قمر جمیل نے اس عہد کے خوابوں کو مقید کرنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے اور اسی وجہ سے "چہار خواب" ہماری جدید شاعری کا ایک اہم مجموعہ ہے۔

جہاں تک قمر جمیل کی شاعرانہ حیثیت کا تعلق ہے وہ اس عہد کے اُن گنے چنے شاعروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے ایک طویل تخلیقی سفر کیا ہے اور اس سفر میں انھوں نے متنوع اسالیب اور اصناف کو وسیلۂ اظہار بنایا ہے اور ان کا ہر وسیلۂ اظہار اپنا اعتبار رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جدید تجربات کو جس طرح شاعری میں سمویا ہے اور اس سے جو تنوع پیدا ہوا ہے وہ کسی ایک نئے شاعر کے ہاں مشکل سے نظر آتا ہے۔ ان کا تازہ کلام دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فطری شاعر ابھی تھکا نہیں ہے اور ہمیں ان کے مزید شعری کارناموں کا انتظار کرنا چاہیے کیونکہ ایک تخلیقی شاعر آخری لمحہ تک تخلیقی شاعر رہتا ہے اور اس کا سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ میں اپنی بات کو قمر جمیل کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

ابھی تو مٹی پہ چل رہے ہو
ستارہ بن کر نکل نہ جانا

(۲۳ راگست ۱۹۸۷ء)

صمد انصاری کی غزل

کتابوں کی تعارفی تقریب کا مقصد عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کم فرصتی کے شکار، ابلاغِ عامہ کے اس دورِ پُرشور میں، جب ہر شخص صرف اپنی روزی کمانے میں مگن ہے اور شہرِ زمانہ نقار خانے میں روایتی طوطی کی صدا سننے کو آمادہ نہیں ہے، تعارفی تقریب کی وجہ سے کچھ اچھے لوگ بنفسِ نفیس جلسے میں شریک ہو کر کتاب کے بارے میں کلماتِ خیر سُن لیتے ہیں اور بہت سے دوسرے اخباروں میں تقریب کی خبر پڑھ کر یا ریڈیو سے اس کی روداد سُن کر مصنف و کتاب کے نام سے متعارف ہو جاتے ہیں اور یہ کتاب اگر کہیں اتفاق سے انھیں نظر آجائے تو اس تقریب کی بھولی بسری یاد انھیں اس کتاب کو خریدنے کی ترغیب دیتی ہے حالانکہ میرا خیال ہے کہ ایسا شاید کم ہوتا ہے۔ ایسی تقریبوں کا ایک فائدہ اور بھی ہے — ہمارے زمانے میں جب لوگ عام طور پر صرف اپنے معیارِ زندگی کو خوب سے خوب تر کرنے میں مصروف ہیں اور نہ کسی کے پاس وقت ہے اور نہ دماغ کہ اپنی اور اپنے دور کی روح کا مطالعہ کرے جو صرف ادب و شعر میں ظاہر ہوتی ہے تو ایسی صورت میں تعارفی تقریب سے لکھنے والے کی اتنی حوصلہ افزائی ضرور ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بارے میں کلماتِ خیر سُن کر تازہ دم ہو جائے اور ادب کے کام کو کارِ بے کاراں سمجھ کر خیرباد نہ کہے۔ اس طرح ادب کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ ایسی تقریبوں کا یہ وہ مثبت پہلو ہے کہ میں ذاتی طور پر ان تقریبوں کا حامی ہوں۔

صمد انصاری صاحب، جن کے نئے اور تیسرے مجموعۂ کلام "قوسین" کی تقریب رونمائی کے سلسلے میں آج ہم جمع ہوئے ہیں، ادب و شعر کے سچے عاشق ہیں۔ سائنس کی اعلیٰ

تعلیم پانے کے باوجود ادب کی دنیا میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ آئے ہیں۔ شاعری ان کا میڈیم ہے اور صنف غزل ان کا ذریعۂ اظہار ہے۔ سائنس کی تعلیم اور ذہنی تربیت کی وجہ سے اُن کا ذہن جن خطوط پر سوچتا ہے، وہ اس ذہن سے بہت مختلف ہے جو آج غزل کی شاعری میں اپنا خونِ جگر صرف کر رہا ہے۔ صمد انصاری کا کلام پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ غزل کی روایتی علامات و رمزیات کو ایک نئی وسعت دے رہے ہیں اور خدا، کائنات اور انسان کو اس نظر سے دیکھ رہے ہیں جہاں لاانتہاؤں میں مسلسل بڑھتی پھیلتی کائنات ہر دم بدل رہی ہے۔ آج جب سائنس انسان کا ذہن، اس کی سوچ اور اس کا رُخ بدل رہی ہے اور ہم سب چیخنے چلاّنے اور واویلا کرنے کے باوجود رفتہ رفتہ اس کے آغوشِ حُسن میں آ رہے ہیں، صمد انصاری کی شاعری ہمیں اس تبدیلی کا شعور عطا کر کے ہمارے ذہن کے بند دریچوں کو کھول رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ان کا یہ مجموعۂ کلام پڑھا تو مجھے تازہ ہوا کے جھونکے نے تازہ دم کر دیا۔ صمد انصاری نے اس تبدیلی کو محسوس کیا اور غزل جیسی ظالم روایتی صنف کے ذریعے سائنسی فکر کو جذبہ و احساس بنا کر شاعری کا روپ دے دیا۔ تبدیلی کائنات کا بنیادی عمل ہے اور اسی لیے زندگی پل پل بدل رہی ہے۔

بدل رہی ہیں شب و روز صورتیں کیا کیا
دوام کو بھی نہ حاصل کبھی دوام ہوا

وہ لوگ جنھوں نے صمد انصاری کا دوسرا مجموعۂ کلام، جو "ہدف" کے نام سے ۱۹۸۱ء شائع ہوا تھا، پڑھا ہے جانتے ہیں کہ اس مجموعے میں انھوں نے اسی سمت میں اپنا سفرِ تخلیق اختیار کیا تھا۔ یہی سفر ان کے تیسرے مجموعۂ کلام "توسین" میں جاری ہے۔ فکر کی اسی مخصوص سمت کی وجہ سے صمد انصاری کی غزل، آج کی غزل سے، خیالات، احساسات اور لہجہ و آہنگ کے اعتبار سے مختلف ہے۔ ان کا کلام پڑھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ذہن مروجہ سچائیوں اور خیالات سے بار بار ٹکرا رہا ہے۔ اسی آویزش سے ان کی شاعری کی چنگاری روشنی دیتی ہے۔ وہ شعور کو وجدان پر فوقیت دیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ عقل کے فتور کو بھی دیکھتے ہیں۔ اسی عمل سے زندگی آگے بڑھتی ہے اور سویا ہوا منجمد ذہن

بیدار ہوسکتا ہے۔ یہی بیداری بنی آدم کا شرف اور اس کا جوہرِ ذات ہے۔

جواز مجھ سے ملا ہے تری بلندی کو
ترے کمال میں میرے قصور کتنے ہیں

جیسا کہ صمد انصاری نے اس کتاب کے "انتساب" میں بتایا ہے کہ شرف بنی آدم اس مجموعۂ کلام کا بنیادی موضوع ہے لیکن مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی صمد انصاری صاحب کے بتائے ہوئے راستے پر آنکھ میچ کر نہ چلیں بلکہ یہ دیکھیں کہ وہ کیا روپ ہے جو ان کی غزل میں سامنے آیا ہے۔ شرف بنی آدم کا موضوع اس مجموعے کی غزلوں میں آیا ہے اور خوب آیا ہے لیکن ان کی غزلوں میں اس موضوع کے علاوہ بھی وہ تنوع اور رنگا رنگی ہے جو ہمارے دامن دل کو حضرت زلیخا کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے۔ شرف بنی آدم کی طرف اپنے قاری کی ساری توجہ مبذول کر کے انھوں نے "قوسین" کے ساتھ خود انصاف نہیں کیا ہے۔ نظم ایک موضوع تک محدود ہو سکتی ہے۔ مسلسل غزل میں بھی ایک موضوع ایک فضا یا رنگ کو نبھایا جاسکتا ہے لیکن کوئی سارے مجموعۂ غزلیات کو صرف ایک موضوع کا پابند کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔ یہی تو غزل کی ادا ہے۔ میں اپنی بات وضاحت کے لیے آپ کے سامنے اِدھر اُدھر سے چند شعر پڑھتا ہوں:

بس گیا جسم میں آخر در و دیوار کا حبس
لوگ گھبرا کے بہت شام کو گھر سے نکلے

شاید کہ خوشگوار ہوں قربت کی تلخیاں — ان فاصلوں کو آؤ ذرا اور کم کریں

ایسے گھروں میں کون بسے گا جہاں صمدؔ
دیوار و در کے ساتھ لب و گوش بھی ہوئے

ہے مرے گھر تک مرے گھر کی اذاں — میری مسجد ہے مری محراب تک

طلسم ٹوٹ گیا آرزو کے موسم کا
کوئی خیال نہ آیا ترے خیال کے بعد

لچک جاتی ہے شاخِ بے ثمر بھی
ہے قامت منحصر حسنِ ادا پر

گونج ہے کس کے بدن کی مری دیواروں میں
گھر مرے کون ہے گلیوں کی ہوا کیا جانے

کون کاٹے گا مرے پاؤں کی زنجیروں کو
کس کے ہمراہ مرا زادِ سفر جائے گا

شباہتوں سے عیاں فکر و فن نہیں ہوتے
ہیں سانپ ایسے بہت جن کے پھن نہیں ہوتے

قدم کی چاپ میں رہتی ہیں رہ گذاریں بھی
سوادِ عمر میں عہدِ شباب شامل ہے

اپنے بدن کا بوجھ اٹھانا پڑے گا خود
اس شہر میں تو اب کوئی مزدور بھی نہیں

قدم قدم پہ لڑے ہیں نئی شکستوں سے
وہ لوگ جن کو فقط ایک مات کافی تھی

اگر چراغ پر اتنے اُتر گئے ہوتے
حرم کے طاق ستاروں سے بھر گئے ہوتے

دستِ دعا اٹھے ہیں سبھی آسماں کی سمت
نکلے تھے جو زمیں سے وہ انبار کیا ہوئے

کس کا بدن اٹھائے امانت وجود کی　　بندہ خدا کا ملکِ خدا سے نکل گیا

جس کے لیے رگوں میں اُتار آگیا لہو　　وہ روشنی بدن کی سیاہی کے ساتھ ہے

فریبِ سنگ میں اصنام ہیں کہ پتھر سے　　نئے بدن کی کبھی جستجو نہیں جاتی

بجھ جاتے ہیں سورج بھی اندھیروں کے سفر میں
مغرب سے کبھی دن کو نکلتے نہیں دیکھا

یہ اشعار آپ نے سُنے اور یہ وہ اشعار ہیں جو "قوسین" میں شامل ہیں۔ ان میں وہ تنوع ہے جو غزل کی دین ہے، جن میں ایک جدید ذہن زندگی کو اپنے رُخ، اپنے زاویے سے دیکھ رہا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ شرف بنی آدم کے موضوع پر، جیسا کہ میں نے ابھی کہا، اس مجموعہ میں بہت سے اشعار موجود ہیں لیکن سارا مجموعہ صرف اسی ایک موضوع تک محدود نہیں ہے بلکہ اس مجموعے میں ایک ایسی رنگا رنگی ہے کہ میں اس مجموعے کو پڑھ کر صمد انصاری کا قائل ہو گیا۔ "قوسین" یقیناً اس دور کا ایک "منفرد" مجموعہ ہے۔

رسوا سرِ بازارِ غزل کر گیا مجھ کو
تھا خوف بہت جس کو مری پردہ دری کا

آخر میں ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ صمد انصاری صاحب نے بہت غزلیں کہیں اور انشاء اللہ اور کہیں گے لیکن اگر وہ ساتھ ساتھ "نظم" کی طرف بھی توجہ دیا تو پھر دیکھیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے!! میرے کہنے سے وہ ذرا یہ بھی کر دیکھیں۔

(۴؍ جون ۱۹۸۳ء)

پرتو روہیلہ اور اُن کی شاعری

یہ آج سے ۲۱-۲۲ سال پہلے کی بات ہے کہ ایک گبرو جوان مجھ سے ملنے آیا۔ دراز قد، نشیلی آنکھیں، ورق سے ہونٹ، دبی مسکراہٹ لیے، کھڑی ناک، خاندان کا پتہ دیتی ہوئی، گورا چٹّا رنگ، رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئیں، چہرے پر بھولپن، جیسے صبح ہو رہی ہو۔ سر پر قراقلی ٹوپی، کتھئی رنگ کا کوٹ، خوش پوش بھی اور خوش گفتار بھی۔ کھلنڈرا بھی اور سنجیدہ بھی۔ قہقہے لگاتا تو رات جاگ جاتی۔ خاموش ہوتا تو دن سونے لگتا۔ تعارف کرایا تو مختار علی خان نام بتایا اور کھُلے تو پتہ چلا کہ شاعر ہیں، پرتو تخلص کرتے ہیں اور لفظ روہیلہ خاندان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ حافظ رحمت خان کی اولاد ہیں۔ وہی حافظ رحمت خان جنھوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کے ایک حصّے کو دادِ شجاعت دے کر فتح کیا اور روہیل کھنڈ نام رکھ کر اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی اور پھر وہیں کے ہو رہے۔ پاکستان وجود میں آیا تو حافظ رحمت خان کے خاندان کا یہ حصّہ اپنے وطن لوٹ آیا۔ مختار علی خان یہیں آباد ہو گئے اور شادی بیاہ کر کے یہیں کے ہو رہے۔ بیوی صوابی کے ممتاز خاندان کی چشم و چراغ۔ آغوش وا کر کے مختار علی خان کو ایسا اپنایا کہ من و تو ایک ہو گئے۔ ایک جان دو قالب۔ یہی وہ حقیقی یک جہتی تھی پاکستان کو جس کی ضرورت تھی اور جس کا عملی اظہار مختار علی خان نے کیا۔ پاکستان محبت کے اسی رشتے کی تلاش کے لیے وجود میں آیا تھا اور محبت کا یہی رشتہ آج بھی ہماری ضرورت ہے۔

مختار علی خان پرتو روہیلہ نے اس علاقے کی روح کو قومی روح میں جذب کرنے

کے لیے پشتو ٹپے کو اردو میں منتقل کر کے قومی کلچر کے دریا کو پاٹ دار بنانے کا وہ عمل کیا جو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ پاکستان مختار علی خان کا خواب تھا جس کی تعبیر آج بھی ان کی حسرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وطن پرستی اور حبِ وطن ان کی شاعری کا محبوب موضوع ہے اور ان کی شاعری کے خمیر میں اس طرح شامل ہے جس طرح روح جسم میں شامل ہو کر زندگی کا پیغام دیتی ہے۔ پرتو روہیلہ کے اب تک "ٹپے" کے علاوہ تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ غزلوں کا "پرتوِ شب" کے نام سے، دوسرا مجموعہ دوہوں کا "رین اجیارا" کے نام سے اور تیسرا مجموعہ نظموں، غزلوں کا "نوائے شب" کے نام سے۔ ان سب مجموعوں میں آپ کو ایک ارتقاء کا احساس ہوگا اور آپ محسوس کریں گے کہ پرتو روہیلہ کے ہاں اب تک خود کو دہرانے کا عمل شروع نہیں ہوا ہے بلکہ وہ تخلیقی سطح پر مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں۔ اتفاق سے ان کے پہلے دو مجموعوں پر پیش لفظ میرے لکھے ہوئے ہیں۔ جب "پرتوِ شب" شائع ہوا تو میں نے اس کے پیش لفظ میں لکھا تھا اور یہ بات ۱۹۷۴ء کی ہے کہ اگر پرتو روہیلہ اپنے اس مجموعے کو آج سے دس سال پہلے شائع کرا دیتے تو اہلِ ذوق کو معلوم ہوتا کہ یہ شاعر اپنے رنگِ سخن کے اعتبار سے اپنے دور کے شاعروں سے کتنا آگے تھا۔ ۱۹۶۶ء کی غزل کا یہ شعر دیکھیے۔

کبھی جو ماضی کے پیرہن، میں نے یاد کی الگنی پہ ڈالے
تو ملگجی ریشمی تہوں میں گلوں کی خوشبو بسی ملی ہے

یا یہ شعر سنیئے!

رات بھر دوست یہ احساس رہا   کوئی سرہانے کھڑا ہو جیسے

یہ وہ رنگِ سخن ہے جو روایت سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی اس سے الگ ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پرتو روہیلہ نے نئے رنگ اور نئی خوشبو سے اردو شاعری کے صحن کو معمور کر دیا ہے۔ "پرتوِ شب" میں مجھے ایک بات یہ بھی شدت سے محسوس ہوئی تھی کہ پرتو کی غزل میں ہیئت تو غزل کی ہے لیکن مزاج اور لفظیات پر دوہے کا رنگ غالب ہے اور میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر وہ دوہے کی طرف توجہ کریں تو نیا چمن آباد کرنے کا

پورا امکان موجود ہے۔ پرتو نے "دوہے" کی طرف پوری توجہ کی اور ان کا دوسرا مجموعۂ کلام "رین اُجیارا" صرف دوہوں پر مشتمل تھا۔ اہلِ ذوق جانتے ہیں کہ پرتو نے دوہے کہہ کر اردو شاعری کی جدید تاریخ میں اپنا مقام بنالیا ہے اور بہت آگے نکل گئے ہیں۔ دوہوں میں انھوں نے اپنے چاروں طرف بکھرے ہوئے تہذیبی پیکروں اور تمثالوں کو عام زندگی سے لے کر شاعری کے ہار میں عجیب کیف کے ساتھ گوندھ دیا ہے۔ یہ وہ تخلیقی وتہذیبی عمل ہے کہ اس سطح پر کوئی ان کو نہیں پہنچتا۔ اُن کی شاعری کو دیکھ کر جوش ملیح آبادی نے کہا تھا کہ

"ان کی آواز دھیمی، رسیلی اور شبنمی ہے جس کے سایہ میں مور ناچ رہے ہیں۔ بولوں میں ہندی کا لوچ اور پنگھٹ کی گراریوں کی ناچتی ہوئی بھیرویاں ہیں۔"

ایک دوہا اس موقع پر آپ بھی سُن لیجیے:

ساگر سے جب کوئی ابھاگن بوند الگ ہوجائے
سورج تاپے، بھاپ بنے، پھر برسے، تب مل پائے

یہی زندگی کا تخلیقی وتہذیبی عمل ہے۔ یہی توحید ہے۔ یہی یک جہتی ہے۔ یہی فصل سے ہٹ کر وصل کا راستہ ہے۔ یعنی دوپنے سے ایک پنے کی طرف۔ جس نے سمجھا ایک ہوگیا۔ جس نے نہ سمجھا مٹ گیا۔

"نوائے شب" اسی شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جو ایک لمبا سفر طے کرکے یہاں تک پہنچا ہے۔ جس نے تضاد میں ہم آہنگی پیدا کرکے ایک نئے رنگِ سخن کی داغ بیل ڈالی ہے۔ یہاں قومی مسائل کو وہ جس تخلیقی شان کے ساتھ سامنے لاتا ہے وہ نئی شاعری کے لیے ایک کھلا راستہ ہے۔ میں یہاں ان کی دو نظموں "وارستگی" اور "پن گُشن" کا حوالہ دوں گا جن میں معاشرتی مسائل حبِ وطن کے ساتھ مل کر ایک نئے امتزاج کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ نظم "وارستگی" میں آپ کو بھی سنانا چاہتا ہوں تاکہ نئی شاعری کا نیا رنگ جس میں ماضی اور حال مل کر مستقبل کے سامنے نئے سوالوں کو جنم دے رہے ہیں، آپ کے سامنے آجائے:

وارستگی

یہ بس ایک میدان تھا جس میں سرِ شام ہم خوش نصیبوں کا لُوٹا ہوا

قافلہ آ کے اُترا

کوئی جسم ایسا نہ تھا جس پہ زخموں نے تحریر چھوڑی نہ ہو

مگر پھر بھی ہر شخص خوش تھا کہ کھویا ہوا راستہ مل گیا ہے

یہیں پر ہمارے قبیلہ کے سردار نے یہ کہا تھا

یہ میداں تمہارا ہے

تم اس کے حق دار ہو

اس میں خیمے لگاؤ

کُھلا آسماں اب تمہارا ہے

چمکتی ہوئی دھوپ کا اب تمہارے سوا کوئی مالک نہیں

تو وہ ہی لُٹا قافلہ اپنے گھاؤ بُھلا کر نئے عزم سے کِھل اُٹھا تھا

مگر آج خیموں کے چاروں طرف کوہ آسا فصیلوں نے جب

دھوپ بھی روک دی ہے

ہواؤں کو بھی کوئی رستہ نہیں ہے

تو میرا جواں ہوتا بیٹا عجب طنز سے پوچھتا ہے

بتاؤ تو بابا

تمہارے قبیلے کے سردار نے کیا کہا تھا

پرتو روہیلہ کی شاعری ماضی کے ٹمٹماتے چراغ، احساس کے صحرا، شکستِ خواب،

سماجی مسائل کے شعور اور حقائق سے آنکھیں چار کرنے کی شاعری ہے جس نے ان کی

شاعری میں غم کی لے کو اس طور پر جنم دیا ہے کہ وہ ان کی شاعری میں بجلی کی رَو کی طرح بہہ رہی ہے لیکن غم کی یہ لے ڈھا دینے والی لے نہیں ہے بلکہ قلب میں نرمی اور گدا ختگی پیدا کر کے شعر کو پُر اثر بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے ان کا تخلیقی سفر اسی طرح جاری رہے گا اور وہ جدید شاعری پر اپنا گہرا نقش چھوڑیں گے جس کے سارے امکانات ان کی شاعری کے ان تینوں مجموعوں میں موجود ہیں اور یہ بات جیسا کہ آپ جانتے ہیں سب شاعروں کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی:

دل کی اندھی دھڑکنوں کو کب ملے گی روشنی
میرے نابینا خیالوں پر جلا کب آئے گی

(۳ر مارچ ۱۹۸۸ء)

راشد مفتی کی شاعری

سب سے پہلے تو میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جن معدودے چند شاعروں کی تخلیقات سے مجھے گہری دلچسپی ہے ان میں راشد مفتی کا نام شامل ہے۔ آج سے سترہ اٹھارہ سال پہلے سکھر سے ایک نوجوان شاعر کا کلام "نیا دور" میں اشاعت کے لیے آیا۔ صاف ستھرا مسودہ خوش خط لکھا ہوا۔ سلیقے سے تہ کیا ہوا۔ میں نے کھولا اور پڑھا تو دل باغ باغ ہو گیا۔ راشد مفتی کا وہ کلام جو اب تک نیا دور میں شائع ہوا اس میں سے پانچ سات غزلیں ان کے اس پہلے مجموعۂ کلام میں بھی شامل ہیں۔ "واسوخت" کی پہلی غزل بھی وہی ہے جو تیرہ چودہ سال پہلے نیا دور میں شائع ہوئی تھی اور جس میں راشد مفتی نے خود کو اردو غزل کی روایت سے وابستہ کرتے ہوئے اپنی انفرادیت کا اظہار کیا تھا۔ شاعری راشد مفتی کے لیے وہ باطنی مجبوری ہے جس کا اظہار ضروری ہے۔ یہ احساس و شعور کا وہ قرض ہے جس کا اُتارنا فرض ہے۔ اندھوں اور بہروں کے اس معاشرے میں آج کا دانشور، آج کا شاعر اس لیے تنہا رہ گیا ہے کہ اس کی بات کوئی توجہ سے نہیں سنتا۔ اسی معاشرتی صورتِ حال کے پیشِ نظر راشد مفتی نے اپنے اس مجموعے کی پہلی غزل میں اپنی شاعری، اپنے لائحۂ عمل اور اپنے رویوں کا اعلان کر دیا ہے:

جو قرض مجھ پہ ہے وہ بوجھ اُتارتا جاؤں
کوئی سُنے نہ سُنے میں پکارتا جاؤں
نہ جانے میرے تعاقب میں کون کون آئے
میں اپنے نقشِ کفِ پا ابھارتا جاؤں

راشد مفتی کا زیرِ نظر مجموعۂ کلام" واسوخت" قرض اُتارنے اور وقت کی ریت پر اپنے نقشِ کفِ پا اُبھارنے کا تخلیقی عمل ہے۔ یہاں میں ایک سوال آپ کے سامنے اور اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر راشد مفتی نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "واسوخت" کیوں رکھا؟۔ واسوخت ایک صنفِ سخن ہے جس میں شاعر اپنے محبوب کی بے وفائیوں سے تنگ آکر اسے جلی کٹی سُناتا ہے اور اُسے چھوڑ کر کسی اور سے دل لگانے کا اظہار کرتا ہے۔ اس اعتبار سے راشد مفتی نے" واسوخت" کی صنف کو تو یقیناً استعمال نہیں کیا لیکن واسوخت کے مزاج کو اپنی غزل میں جذب کرکے اسے ایک نیا رنگ دیا ہے۔ یہاں ان کا ایک محبوب معاشرتی شعور اور اجتماعی احساس ہے۔ یہی تخلیقی عمل ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ سلیم احمد مرحوم نے اپنی غزل میں اُبھارا تھا۔ سلیم احمد کی غزل کے مزاج پر" ہجو" کا رنگ غالب تھا۔ یہ غزل کا ایک نیا لہجہ تھا جس کے امکانات سب سے پہلے انشاء اللہ خان انشا کی غزل میں اُبھرے تھے اور جو آج تک اپنے امکانات کی تکمیل کے لیے کسی بڑے شاعر کا منتظر ہے۔ بہر حال راشد مفتی کی غزل کا لہجہ اسی لیے نیا ہے کہ انھوں نے واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب کرکے اسے ایک نئی صورت دی ہے جس میں معاشرتی مزاج اور روحِ عصر نے ایک نیا رنگ گھولا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری اجتماعی مسائل اور معاشرتی صورتِ حال سے وابستہ ہے اور اس کے ردِ عمل سے ان کا وہ لہجہ جنم لیتا ہے جس میں شائستہ انداز میں جلی کٹی سنانے کا غم و غصہ والا لہجہ شامل ہے:

جھیلے ہیں اپنی جان پہ ہم نے وہ حادثے
دل مانتا نہیں کہ قیامت بھی آئے گی

خود کو کہتے ہیں جو فرزندِ زمیں
ہاتھ ڈالیں گے وہ کب مٹی میں

غزل کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ غزل اپنے اسلوب و ہیئت کے لحاظ سے تو بالکل نئی نہیں ہو سکتی اور نہ اس میں انفرادیت مکمل انقلابی انداز یا مسلسل روایت شکنی

سے پیدا کی جا سکتی ہے بلکہ اس میں ایک ایسا سلیقہ درکار ہے جس سے روحِ عصر کی ترجمانی کے ذریعے اسے اپنے عہد کا آئینہ بنایا جا سکتا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری میں یہ سلیقہ ملتا ہے اسی لیے ان کی غزل میں انفرادیت کے خد و خال نمایاں ہیں۔ یہ چند شعر سُنیے :

اب تو سارے گِلے زمین سے ہیں
آگے شاکی تھے آسمان سے لوگ

نکل کے جا نہ سکا جب کسی طرف کو میں
تو بڑھ کے چیر گیا دشمنوں کی صف کو میں

یہی کہ قید ہوئے اپنی اپنی خلوت میں
تمہی کہو کہ ہمیں کیا ملا محبت میں

راشد مفتی کی شاعری میں بعض اہم واقعات کے اشارے بھی ملتے ہیں جن میں جذبے کی شدت نمایاں ہے لیکن انھوں نے اپنی شاعری میں روزمرہ زندگی، عمومی تجربات اور معاشرتی صورتِ حال کو بیان کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری انفرادی سچائی اور واقعیت کا روپ دھار لیتی ہے مثلاً یہ شعر دیکھیے۔

گھر میں کون سا سُکھ ہے راشد
دل گرفتہ جو میں دفتر میں رہوں

در و دیوار پہ تحریر نظر آتی ہے
اطلاعات جو اخبار نہیں دے سکتا

جب بھی مقتل میں پکارا جاؤں
گھر کی دہلیز پہ مارا جاؤں

ہر شاعر اپنے معاصروں کے اثرات قبول بھی کرتا ہے اور ان کو متاثر بھی کرتا ہے۔ راشد مفتی کی شاعری میں اس عہد کے قابل ذکر شعراء کے اثرات گھلے ملے نظر آتے ہیں جن میں فیض، ناصر کاظمی، سلیم احمد اور منیر نیازی کا ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن ان سب میں سلیم احمد کا اثر سب سے زیادہ ہے اور اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر میں نے ابھی آپ کے سامنے کیا تھا کہ سلیم احمد نے بھی اپنی غزل کا نیا لہجہ ہجو اور واسوخت کے مزاج کو غزل میں جذب کر کے بنایا تھا اور یہی عمل راشد مفتی نے بھی کیا ہے۔ عمومی تجربات اور معاشرتی حوالے دونوں کی شاعری کا مزاج ہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ اثر سے یہ مراد نہیں ہے کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کی نقالی کر رہا ہے۔ اثر سے میری مراد یہ ہے کہ راشد مفتی نے سلیم احمد کے لہجے سے اپنا مخصوص لہجہ بنانے میں اثر قبول کیا ہے۔ ابھی سلیم احمد کی آواز فضا میں گونج رہی ہے۔ اس آواز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اب آپ راشد مفتی کے یہ چند شعر سنیے:

بخشش میں ملی تھیں چند کلیاں
تاوان میں باغ دے رہا ہوں

اسی انبوہ سے نسبت رکھوں
اسی ہارے ہوئے لشکر میں رہوں

اب تو دیوار گرانی ہو گی
میرے قامت سے یہ در چھوٹا ہے

چاہتے ہیں جو مجھ سے قربانی
کبھی خود بھی کریں کوئی ایثار

بھلا ہوا کہ بہت دن یہ سلسلہ نہ رہا
میں خود کو بھول چلا تھا تری محبت میں

یہ کوئی مقالہ نہیں جس میں تفصیل کے ساتھ میں راشد مفتی کی شاعری کا تجزیہ کروں۔ اس وقت تو اتنا ہی کافی ہے کہ میں یہ بتاؤں کہ راشد مفتی اس دور کے قابلِ ذکر اور ممتاز شاعروں میں شامل ہیں جنھوں نے غزل میں اپنے مخصوص لہجے کو نمایاں کرکے اپنی حیثیت منوائی ہے۔ اب ان کا پہلا مجموعۂ کلام شائع ہو گیا ہے اور اس کی اشاعت سے ان کی شہرت اور ان کے تخلیقی سفر کا ایک نیا باب شروع ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنے دوسرے مجموعۂ کلام کی بھی جلد بنیاد ڈالیں گے تاکہ وقت کی ریت پر اپنے نقشِ کفِ پا ابھارنے کا عمل جاری رہ سکے۔ آج کے نقار خانے میں طوطی کی صدا کوئی سُنے نہ سُنے لیکن اسے بلند رکھنا سب سے اہم کام ہے۔ راشد مفتی نے یہ اعلان اپنے مجموعے واسوخت کے پہلے شعر میں ہی کر دیا ہے ع

کوئی سُنے نہ سُنے میں پُکارتا جاؤں

یہی اس دور کا المیہ ہے اور یہی مردانِ حق کا رویہ ہونا چاہیے۔

(۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء)

صادق نسیم کی غزل

میں صادق نسیم صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتا لیکن ان کی شاعری کے واسطے سے انھیں پہچانتا ہوں۔ شاعری اگر شخصیت کا اظہار ہے تو آپ شاعر کو ذاتی طور پر جانے بغیر بھی بخوبی جان سکتے ہیں، اس کے باطن کی گہرائیوں میں جھانک سکتے ہیں اس کے مزاج کی تہ لے سکتے ہیں اور جب وہ آپ سے ملے تو یوں معلوم ہو کہ آپ تو اس شخص سے پوری طرح واقف ہیں۔ لیکن یہ عمل اسی وقت ہو سکتا ہے جب شاعر نے محض روایتی شاعری نہ کی ہو بلکہ زندگی کے تپتے ہوئے صحرا میں چلتے ہوئے جھکڑ کے تجربوں کو اپنی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو۔ صادق نسیم کی شاعری میں ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ سچی شاعری ہے اور اس میں حقیقی تجربوں نے زندگی کا رنگ و نور بھرا ہے۔ ان کے اشعار اسی لیے ہمارے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں۔

"ریگِ رواں" کسی نوعمر یا نئے شاعر کا کلام نہیں۔ یہ ایک ایسے پختہ ذہن شاعر کا کلام ہے جو برسوں سے شعر کہہ رہا ہے، جس نے شعر و ادب کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ جسے زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے اور جو اپنے تجربوں کو موزوں ترین لفظوں میں ڈھالنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ صادق نسیم غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی روایت بڑی ظالم چیز ہے۔ کوئی غزل گو شاعر اس سے دامن بچا کر نہیں گذر سکتا لیکن اگر وہ روایت کے جنگل میں پھنس گیا تو پھر انھیں باتوں کو دہرانے لگے گا جو اس سے بہتر طریقے پر پرانی نسل کے شعرا کہہ چکے ہیں۔ ہمارے سامنے ایسے لاتعداد شعرا ہیں جو مسلسل غزل کہہ رہے ہیں لیکن ان کی غزل سن کر یا پڑھ کر نہ صرف طبیعت مکدر ہو جاتی ہے بلکہ

غزل کے باسی پن سے کفن و کافور کی بُو آتی ہے۔ برخلاف اس کے وہ غزل گو جو روایت کا شعور حاصل کر کے اُسے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی کے تجربات سے ہم کنار کر دیتے ہیں ان کی غزل کی جاذبیت سننے والوں کو پُر کیف کر دیتی ہے۔ صادق نسیم اسی قسم کے غزل گو ہیں۔ "ریگِ رواں" کا مطالعہ کرتے ہوئے اسی لیے دو باتیں ہمیں خاص طور پر متاثر کرتی ہیں : ایک یہ کہ صادق نسیم کو غزل کی روایت کا گہرا شعور ہے اور وہ اس روایت میں بدلتی زندگی کے نئے طرزِ احساس کو شامل کر کے اُردو غزل کی روایت کا حصّہ بنانے کی قدرت رکھتے ہیں، دوسرے یہ کہ اُن کی شاعری میں دل اور دماغ دونوں شریک ہیں۔ اُردو غزل کی یہی وہ روایت ہے جسے غالب نے دوام بخشا تھا۔ صادق نسیم کے ہاں دل کی بستی پوری گھما گھمی کے ساتھ آباد ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ باہر کی دنیا سے بھی اس کا رشتہ قائم ہے۔ اسی لیے اُن کی غزل میں ایک انبساط، ایک سرخوشی اور کیف و نشاط کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے ہاں غم گھُن بن کر نہیں چاٹتا بلکہ نشتر بن کر ایک نیا حوصلہ دیتا ہے۔ یہاں غم درد تو ہے ہی لیکن ساتھ ساتھ دوا بھی ہے۔ تیرگی اُن کے ہاں مشعلیں جلاتی ہے اور درمیان کے فاصلے مٹا دیتی ہے۔ غمِ عشق اور غمِ زمانہ دونوں بیک وقت زندگی کا حصہ بن کر سامنے آتے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اُن کی تنہائی میں اہلِ محفل شامل ہیں لیکن محفل میں تنہائی کا احساس بھی موجود ہے۔ زندگی کا یہی حقیقی تضاد ایک نئے آہنگ کے ساتھ ان کی شاعری میں اُبھرا ہے اور اسی لیے اُن کی شاعری میں سکوت کی بجائے کلام، جمود کی بجائے حرکت اور قیام کے بجائے سفر کا احساس اُبھرتا ہے۔ "سفر" صادق نسیم کی شاعری میں زندگی کا استعارہ ہے اور بار بار طرح طرح سے خواجہ میر درد کی طرح اُن کی شاعری میں آیا ہے۔ "ریگِ رواں" بھی اسی سفر کا اشارہ ہے :

نہ جانے کیسے سفر کی ہے آرزو دل میں
میں اپنے گھر میں ہوں صادق مسافروں کی طرح

تمام دن کی مسافت گذار کر ہر شب
لگے جو آنکھ تو خوابوں میں بھی سفر دیکھوں

گرداب ہوں گردش مری تقدیر ہے صادق
میں گھر میں بھی ہوتا ہوں تو رہتا ہوں سفر میں

ہر قدم پر یہی ہوا محسوس　　　زندگی بھر سفر کیا جیسے

موج در موج سفر ہے اپنا　　　اور تا حدِ نظر دریا ہے

اسی سفر نے صادق نسیم کی شاعری میں تنوع کا کیف اور رنگارنگی پیدا کر کے ان کی شاعری کو یکسانیت کی اداسی اور تھکن سے بچا لیا ہے۔ اس احساسِ سفر نے اُن کے تجربوں کو وسعت دی ہے، ان کے احساس کو پھیلاؤ دیا ہے، اُن کے جذبات میں نئے نئے رنگ بھرے ہیں، ان کے شعور کو وہ حوصلہ دیا ہے جہاں ہر چھوٹی بڑی بات بامعنی نظر آنے لگتی ہے۔ اُن کی غزل کی تازگی کا یہی راز ہے۔

صادق نسیم کے ہاں ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ اپنے جذبہ و احساس کو خارجی منظر سے ملا کر اس طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ یہ منظر اس مخصوص احساس یا جذبے کا حصہ بن کر اثر کا جادو جگا دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل اُن کے اظہار کا اہم وسیلہ ہے:

ہر روز ڈھونڈتا ہوں تیری یاد کا اُفق
میں آفتابِ شام کی صورت تھکا ہوا

وہ تو ہے تیرے سایۂ مژگاں میں خیمہ زن
گویا جلو میں شام کے منظر سحر کا ہے

یہ خواب خواب سا منظر یہ کھوئی کھوئی فضا
کہ جیسے کوئی فسانہ سُنا رہی ہو ہوا

رقصاں ہے غنچہ غنچہ رگِ شاخ شاخ میں
مینا میں جیسے موجۂ صہبا دکھائی دے

صادق نسیم اپنے احساس و جذبہ کو خارجی منظر کے حوالے سے اس طور پر بیان کرتے ہیں کہ یہ احساس و جذبہ پڑھنے یا سننے والے تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی وہ فنی خوبی ہے جسے ٹی۔ ایس ایلیٹ "معروضی تلازمات" کا نام دیتا ہے۔ ابلاغ صادق نسیم کے ہاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک باشعور شاعر ہمیشہ سے کرتا آیا ہے۔ اُن کے مصرعوں کی سجاوٹ، لفظوں کا انتخاب اور جماؤ، بات کو پورے طور پر بیان کرنے کی کوشش نے ان کی شاعری میں وہ قوت پیدا کر دی ہے کہ وہ پُراثر ہوگئی ہے۔ اُن کے لہجے میں گھلاوٹ ہے اور خوش آہنگی بھی۔ اُن کے اظہار میں رس ہے اور توانائی بھی اور ساتھ ساتھ وہ ایسا صاف ستھرا، واضح لہجہ ہے جسے ہم صادق نسیم کی شاعری سے واقف ہو کر آسانی سے پہچان سکتے ہیں اور یہ ایسی بات ہے کہ ہم اس دور کے بہت کم غزل گوؤں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، اسی لیے میں صادق نسیم کو جدید اُردو غزل کا ممتاز شاعر اور "ریگِ رواں" کو ایک قابلِ قدر مجموعہ سمجھتا ہوں۔

جیسے مرے اسلاف تھے ویسا تو نہیں میں
مجھ سا بھی مگر کوئی یہاں کون رہا ہے

صادق نسیم کی غزل میں اور بھی کئی باتیں قابلِ ذکر ہیں جنھیں ان کے اشعار کے حوالے سے واضح کیا جا سکتا ہے مثلاً ان کی غزل کے مزاج اور لہجے میں فراق گورکھپوری کی آواز بول رہی ہے جسے اپنانا ہما شما کے بس کا روگ نہیں ہے۔ پھر انھوں نے روایتی علامتوں کے ذریعے نئے مضامین باندھے ہیں اور اپنے دور کے کرب کو بھی سمو لیا ہے۔

کیسے رہ سکتی ہیں جنت کی فضائیں شفاف
خاک اُڑانے کو یہی لوگ وہاں بھی ہوں گے

جس شخص کو بھی دیکھیے طالب ثمر کا ہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ جسے غم شجر کا ہے

تھا میرؔ جی کا دور غنیمت کہ اُن دنوں
دستار ہی کا ڈر تھا مگر اب تو سر کا ہے

یا وہ گہرے احساس کو سامنے کے لفظوں میں یوں آسانی سے بیان کر دیتے ہیں:

دیکھتے ہی مجھے محسوس ہوا جیسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے
دیکھتے ہی دیکھتے ہر اک چہرہ تیرے چہرے میں بدل جاتا ہے

جب بھی تری قربت کے کچھ امکاں نظر آئے
ہم خوش ہوئے اتنے کہ پریشاں نظر آئے

یہ اور کئی ایسی باتوں کا اور بھی ذکر کیا جا سکتا ہے لیکن میں تو اُن کی شاعری کو آپ سے صرف متعارف کرا رہا ہوں، اسی لیے میں نے یہاں صرف چند بنیادی باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اسی لیے میں نے اُن کے اچھے اشعار کا انتخاب بھی یہاں جان بوجھ کر نہیں دیا ہے۔

(۱۵ر جنوری ۱۹۷۹ء)

پیش لفظ جو کتاب میں شائع نہ ہو سکا۔

افسر ماہ پوری کی غزل

میں نے افسر ماہ پوری کو پہلی بار ڈھاکہ میں دیکھا تھا۔ یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہوگی۔ یہی وضع قطع تھی جو آج ہے۔ فرق اتنا تھا کہ پہلے وہ بہت چاق و چوبند تھے اب قدرے کم ہیں۔ ادب کے رسیا اس وقت بھی تھے اور آج اس سے بھی زیادہ ہیں۔ پہلے ہوائے مخالف میں چراغ جلاتے تھے اور اب ہوائے موافق میں دل جلاتے ہیں۔ جلنے اور جلانے کا مشغلہ پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے۔ یہی شاید ادیب، شاعر اور دانشور کا مقدر ہے۔ اُن سے ملیے تو ان کے خلوص کی خوشبو اور فکر و فن کی چاندنی دل کو موہ لیتی ہے۔ بے نیازی میں سلیقہ اور نیازمندی میں رکھ رکھاؤ ایسا کہ جو ملے گرویدہ ہو جائے۔ ادب اور اختیار میں شاید اللہ واسطے کا بیر ہے۔ صاحبِ اختیار کبھی نہیں تھے لیکن صاحبِ ادب پہلے بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ یہی ان کی شناخت اور یہی ان کا امتیاز ہے۔ میں نے ان کے مضامین بھی پڑھے ہیں اور شاعری بھی۔ اپنے مضامین میں انھوں نے مشرقی پاکستان کی تہذیبی روح کو اُردو کلچر میں منتقل کیا۔ قاضی نذر الاسلام کی ۲۵ اسلامی نظموں کے منظوم تراجم کیے۔ اُردو ادب کو بنگالی ادب سے اور بنگالی ادب کو اُردو ادب سے روشناس کرایا۔ یہ عمل بغیر سیاست کے انصاف کے ساتھ اگر معاشرتی و معاشی سطح پر جاری رہتا تو آج بھی دونوں ایک ہوتے۔ ناانصافیاں شبِ وصل کو شامِ فصل میں بدل دیتی ہیں۔ یہ سبق نہ ہم نے اُس وقت سیکھا تھا اور نہ آج اُسے سیکھ رہے ہیں۔ تاریخ ہمارا علم رہا ہے۔ دُنیا زمانے نے ہم سے سیکھا تھا لیکن ہم گذشتہ کئی سو سال سے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھتے۔ روشنی ہو جائے تو اللہ کی دین ہے۔ اندھیرا چھا جائے تو رضائے الٰہی ہے۔

نہ کچھ کرتے ہیں۔ نہ کرنے دیتے ہیں۔ یہی ہمارا حال ہے۔ ماضی کبھی شاندار تھا۔ مستقبل اللہ بہتر کرے تاکہ ہماری آنے والی نسلیں پوتوں پھلیں اور سدا آباد رہیں۔

جناب افسر ماہ پوری شاعر بھی ہیں اور نقاد و افسانہ نگار بھی۔ ادب اُن کا مقصدِ حیات ہے۔ ساری عمر اسی میں لگے رہے اور ساری عمر اسی میں لگادی۔ ہماری نسل کا یہ دستور تھا کہ ساری عمر تخلیقِ ادب کے کام میں لگی رہتی تھی۔ شہرت برسوں کے ریاض کے بعد آہستہ آہستہ پھیلتی تھی۔ شہرت کام سے تھی۔ کام پہلے مشہور ہوتا تھا اور نام کی باری اس کے بعد آتی تھی۔ آج صورتِ حال ذرا دوسری ہے۔ کام پیچھے اور نام آگے۔ اسی لیے کام کوئی نہیں کرتا نام کو شب و روز مانجھتے رہتے ہیں۔ چلت پھرت، رشتے ناتے، ٹی وی، ریڈیو، اخبار، جلسے۔ یہی تخلیقِ ادب کا راستہ ہے اور یہی منزل۔ کسی سے ملیے اخبار، ٹی وی کی بات کرے گا۔ کتاب کی بات اب کوئی نہیں کرتا۔ کون سی نئی کتاب آئی، کون سی آنے والی ہے۔ اب شاید یہ ہمارا مسئلہ ہی نہیں رہا۔ تاشا باجا رہ گیا ہے۔ یہ ماشاء اللہ خوب بج رہا ہے۔

جناب افسر ماہ پوری نے آج سے چالیس بیالیس سال پہلے لکھنا شروع کیا تھا اور اب ۱۹۸۶ء کے اواخر میں ان کی پہلی کتاب یعنی شاعری کا پہلا مجموعہ شائع ہوا ہے۔ یہ کام اگر پہلے ہو جاتا تو اچھا ہوتا لیکن دیر آید درست آید کے مصداق آج بھی غنیمت ہے۔ ان کا مجموعۂ کلام "غبارِ ماہ" پڑھ کر یوں محسوس ہوا کہ جھلسا دینے والی گرمی میں تازہ ہوا کے جھونکے نے تازہ دم کر دیا ہے۔ سلیقے سے جڑے ہوئے الفاظ اور اُن میں احساس و جذبات کی خوشبو، بہت سے شعر دل میں اُتر گئے۔ چند شعر آپ بھی سُن لیجیے:

ہمیں کبھی تو نظر آئے گا ترا چہرہ
اسی خیال سے پتھر کو صاف کرتے ہیں

اسیرانِ قفس کو کیا خبر ہوگی بہاراں کی
نسیمِ صبح اب گلشن میں بھی مشکل سے آتی ہے

ہم تو وفا بھی کر کے خطا وار ہی رہے
تم خود بتاؤ کوئی طریقہ نباہ کا

پھیلی ہوئی ہے بزم میں ایسی بھی داستاں
ہم نے ابھی کہی نہیں، تم نے ابھی سُنی نہیں

ان اشعار میں روحِ عصر بھی ہے۔ وہ روحِ عصر جس میں آپ بیتی جگ بیتی بن جاتی ہے اور وہ سلیقۂ اظہار بھی جس میں لہجے کا دھیما پن سادگی بن کر دل میں اُتر جاتا ہے۔ نہ وہ شدتِ غلو کہ جذبات کے پرنالے بہنے لگیں اور نہ وہ اختلاطِ جذبات کہ اظہار اُلجھ کر رہ جائے اور شاعر کی بات قاری تک نہ پہنچے۔ ان کے اشعار میں جذبہ آئینہ کی طرح شفاف اور احساس چاندنی کی طرح دلفریب ہے۔ اسی تخلیقی عمل سے ان کا لہجہ بنتا ہے جو شعر کو پُراثر بنا دیتا ہے:

یاد آتے ہیں کبھی وہ تو پتا چلتا ہے
بیت جاتے ہیں گھڑی بھر میں زمانے کتنے

دیکھنا یہ ہے کہ محفل میں محبّت کے دیئے
کتنے انساں نے بجھائے ہیں، ہوا نے کتنے

میں افسر ماہ پوری کی شاعری کے بارے میں کچھ اور باتیں بھی کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ تو وہ ہیں جو آپ پہلے ہی سُن چکے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو "غبار ماہ" میں آپ پڑھ چکے ہیں اس لیے ان کو دہرانے کا جُرم میں نہیں کرنا چاہتا۔ البتہ ایک بات یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ آپ اس مجموعۂ کلام کو خود بھی پڑھیے آپ کی داستانِ حیات اس میں رقم کی گئی ہے۔ وہ داستانِ حیات

جو آپ کی ضرور ہے لیکن ہم سب کا مشترک ورثہ ہے اور اس کے داستان گو حضرت افسر ماہ پوری ہیں :

دیکھ کے مجھ کو یہ اندازہ لگا لو افسر
رنج کتنا ہے زمانے میں، خوشی ہے کتنی

(۴؍جون ۱۹۸۷ء)

جمیل عظیم آبادی کی غزل

کتاب کی تعارفی تقریب کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ حاضرین کے دل میں نئی کتاب پڑھنے کا جذبہ بیدار کیا جائے اور مصنف کی اتنی حوصلہ افزائی ضرور کی جائے کہ وہ اس دورِ پُر آشوب میں لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھ سکے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جو زر پرستی کی وبائی بیماری میں شدت سے مبتلا ہے اور ذہنی و تخلیقی سطح پر ایک لق ودق صحرا بن کر رہ گیا ہے پوری آواز سے اذان دینا کارِ ثواب بھی ہے اور تقاضائے وقت بھی۔ کتاب کی تعارفی تقریب دراصل اندھوں اور بہروں کی بستی میں زور زور سے بولنے کی ایک ایک ایسی کوشش ہے تاکہ بات ان تک بھی پہنچ جائے جو دیکھنے سے گریز اور سننے سے احتراز کر رہے ہیں۔ اسی لیے جمیل عظیم آبادی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے وقت کی تیز آندھیوں میں تخلیق کا دیا روشن رکھا اور شاعری سے نہ صرف اپنا تزکیہ نفس کیا بلکہ معاشرے کے جذبات واحساسات کی بھی ترجمانی کی جمیل عظیم آبادی کا کلام پڑھتے ہوئے اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ میرے دل کی بات اپنی زبان سے کہہ رہے ہیں۔ اسی لیے ان کے شعر دل پر اثر کرتے ہیں۔ وہ ایک دل درد مند رکھتے ہیں۔ انھیں اپنی ذات سے پیار ہے لیکن اس سے زیادہ ان لوگوں سے پیار ہے جو ان کے ارد گرد چل پھر رہے ہیں۔ جن کی زندگی مسائل کا شکار ہوتے ہوئے بھی ایک جہت رکھتی ہے۔ وہ پیارے لوگ جو آفت زدگی میں بھی اپنے عقائد اور اپنے وطن کا پرچم بلند رکھتے ہیں۔ جن کی زبانیں بند ہیں لیکن جو آنکھ سے وہ سب کچھ کہہ رہے ہیں جو زبان سے کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں، جو جمیل عظیم آبادی کے مخاطب ہیں اور اسی وجہ سے وہ اپنی بات ایسے صاف ستھرے، سادہ

اور واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ ان کی بات آسانی سے ابلاغ کرتی ہے۔ یہی ان کا فن ہے اور اسی میں ان کی شاعری کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔

جمیل عظیم آبادی کی شاعری کا تعلق براہِ راست زندگی سے قائم ہے۔ وہ اسی زندگی سے، جسے وہ بسر کر رہے ہیں، تجربوں کے جگنو شاعری کے رومال میں پکڑتے ہیں اور پھر ان سے فضا کو روشن کر دیتے ہیں۔ زندہ تجربوں کے یہی جگنو ان کی شاعری کو حسن عطا کرتے ہیں۔ اظہار کو روشن کرتے ہیں اور لہجے کو پھوار کی سی نرمی عطا کرتے ہیں۔ جمیل عظیم آبادی سچائی کے شاعر ہیں۔ وہ سچائی جس کی قسم تو سب کھاتے ہیں لیکن بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں اسی لیے ہمیں ایک جہت ملتی ہے ــــ وہ جہت جو منزل کا راستہ دکھاتی ہے۔ جذبہ و احساس کو نکھارتی ہے اور انسان کو کندن بنانے میں مدد کرتی ہے۔ جمیل عظیم آبادی کی شاعری میں ہمیں وہ معاشرتی شعور بھی ملتا ہے جس سے شاعری بامعنی ہو جاتی ہے اور تخلیق بے مقصدیت سے بچ کر جذبوں کی تطہیر اور تہذیب کا کام انجام دیتی ہے۔

دوہری ہجرت کا آشوب جمیل عظیم آبادی کی شاعری کی روح میں رنگ کی مانند گھُلا ہوا ہے۔ یہ تجربہ ان کا انفرادی تجربہ بھی ہے اور اجتماعی تجربہ بھی۔ ایسا تجربہ جس کا گہرا اثر ان کی شاعری میں موجود ہے۔

غریبِ شہر ہوں، یارب کہیں امان تو دے
جو دی ہے دھوپ تو پھر سر پہ سائبان تو دے

راس آئی نہ فصلِ بہاراں ہمیں
تم وہاں کھو گئے، میں یہاں کھو گیا

سب کچھ لٹا کے راہِ وفا میں ہیں مطمئن
ہم اہلِ دل کا جذبۂ ایثار دیکھنا

ہنستا ہوا یہ شہر سرِ شام سو گیا
سیلِ بلا کے ہوں نہ یہ آثار دیکھنا

صحرا کے خار و خس کو بھی ایک زندگی ملی
جب رنگ و بو کے قافلے گلزار سے چلے

دوہری ہجرت کا یہ تجربہ جمیل عظیم آبادی کی شاعری کا بنیادی تجربہ ہے اور اسی لیے "دل کی کتاب" پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتی ہے۔

(۲۷ اکتوبر ۱۹۸۵ء)

غنی دہلوی کی غزل

آج ہم جس کتاب کی تقریب رونمائی میں جمع ہوئے ہیں وہ ایک ایسے شاعر کا مجموعۂ کلام ہے جس نے اپنی ساری عمر ادب و شعر کی خدمت میں بسر کی ہے۔ جناب غنی دہلوی ہم میں سے اکثر سے عمر میں بڑے ہیں۔ بعض تو ان سے اتنے چھوٹے ہیں کہ ان کی شعر گوئی کی عمر بھی ان سے بڑی ہے۔ جناب غنی دہلوی نے شاعری کو ایک ایسی سنجیدہ تخلیقی سرگرمی کے طور پر اپنایا ہے کہ اپنی ساری عمر اس کے فروغ کے لیے وقف کر دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قادر الکلام پرگو شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلیں بھی کہی ہیں اور رباعیاں بھی، گیت بھی کہے ہیں اور دوہے بھی لیکن ان کا کلام ابھی تک شائع ہو کر لوگوں تک نہیں پہنچا۔ یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو "شاخسار" کے نام سے شائع ہوا ہے اور اس میں بھی وہ ساری غزلیں شامل نہیں ہیں جو وہ کہہ چکے ہیں۔ وہ دولت مند آدمی نہیں ہیں اور ہمارے معاشرے کو زرپرستی کی دوڑ میں اتنی فرصت نہیں کہ وہ اپنے شاعروں کا خیال کرے، ان کی حوصلہ افزائی کرے، ان کی سرپرستی کرے اور ان کے کلام کو منظر عام پر لائے تاکہ معاشرہ اپنی دھڑکنوں کی صدا سن سکے۔ ہمارے معاشرے میں جو گھٹن ہے، مسموم فضا ہے جو وہ مرجھا گیا ہے، بے سکونی اور بے چینی کی کیفیت میں جو وہ مبتلا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشرے نے شعر سے لطف لینے اور اپنے دل کی کیفیات و جذبات کو شعر کی زبان میں سننے کا عمل بند کر دیا ہے۔ اب سے دس سال پہلے تک گھر گھر مشاعرے ہوتے تھے، شعر و سخن کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں اور جو کچھ معاشرے میں ہوتا تھا اس کے تاثرات کو شعر کی زبان میں سن کر ہم اپنی بے لطفی، بے کیفی اور بے چینی کے جذبات کو غسل دے لیتے تھے اور پھول کی طرح ہلکے ہو کر اپنا تزکیہ کر لیتے

تھے۔ یہ میرا تجربہ ہے اور آپ بھی یہ تجربہ کر کے دیکھئے کہ جو کچھ آپ کے چاروں طرف ہوتا ہے یا ہورہا ہے شاعر اس کیفیت کو اپنے شعر میں اس طور پر سمو دیتا ہے کہ اس میں تاثیر کا رنگ جاگ اٹھتا ہے۔ آج بھی کسی مشاعرے میں جائیے تو لوگ ان اشعار پر داد دیں گے جن میں معاشرے میں چلنے والی ہواؤں کا جادو جاگ رہا ہے۔ آپ سامعین کی داد سے آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آج معاشرہ کیا سوچ رہا ہے' اس کے دل میں کن چیزوں نے گھر کر رکھا ہے اور اب آنے والے زمانوں میں ہوا کیا رُخ اختیار کرے گی۔

وہ معاشرے برف کی طرح ٹھنڈے اور منجمد ہونے لگتے ہیں' جو شعر سے بے نیاز ہو جاتے ہیں' جن کی زندگی پر شاعری اثر انداز ہونا بند ہو جاتی ہے۔ آپ شعر سنیے' شعر پڑھیے' محفل شعر و سخن منعقد کیجیے شاعروں کو اہمیت دیجیے' ان کی سرپرستی کیجیے تو آپ خود اس تبدیلی کو محسوس کریں گے جو نتیجے کے طور پر ظہور میں آئے گی۔ یہ سفاکی' یہ بہیمیت' یہ درندگی جو اس وقت ہم اپنے چاروں طرف دیکھ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جذبات میں بھرے ہوئے ہیں اور تزکیۂ جذبات کا عمل' جو شعر کے ذریعے یا دوسرے فنون لطیفہ کے ذریعے ہوتا ہے' بند ہو گیا ہے۔

ہماری صحت مند زندگی کے لیے شعر ویسا ہی ضروری ہے جیسے صاف ہوا جسم انسانی کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ حضرت غنی دہلوی نے ایسے ہی شعر کہہ کر ہمارے جذبات کی تطہیر اور تزکیہ کا بندوبست کیا ہے۔ آپ ان کے شعر سنیئے یا پڑھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ ہمارے دل کی بات' اپنی صاف ستھری' کوثر و تسنیم سے دُھلی زبان میں اس طور پر کہہ رہے ہیں کہ ان کے شعر ہماری زبان پر چڑھ کر ہمارے جذبات اور ہماری دلی کیفیات کے ترجمان بن جاتے ہیں۔ آپ اس مجموعۂ کلام کو کہیں سے پڑھ لیجیے غنی دہلوی آپ کے دل سے دل کی بات کرتے سُنائی دیں گے۔ یہ کہہ کر جب میں ان کا مجموعۂ کلام کھولتا ہوں تو یہ شعر سامنے آتے ہیں۔ دیکھیے یہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں:

رفتہ رفتہ لٹ گیا شمع فروزاں کا سہاگ
صرف پروانوں کے دم تک تھی بہارِ انجمن

دیکھیے یہ ہاتھ کس کا ہے گلوں کے شوق میں

رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے جانبِ شاخِ چمن

اے غنی اب تم کرو صحرا نشینوں کی تلاش

ایسے لوگوں سے ملو جن کا نہ ہو کوئی وطن

ان اشعار میں رموز و کنایات وہی ہیں جو اردو غزل میں عام طور پر استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن غنی دہلوی کے ہاں یہ کنائے ہمارے دور کا اشارہ بن کر ہمارے دلوں کی ترجمانی کر رہے ہیں، پختہ کلام، موزوں لفظوں کے موتی شاعری کی مانگ میں سلیقے سے جڑے ہوئے ۔ یہ غنی دہلوی کا کلام ہے ۔

غنی دہلوی نے ہجرت کا دکھ اٹھایا ہے ۱۹۴۷ء میں اپنے سارے خاندان کے افراد کے بہیمانہ قتل کے سانحے سے دوچار ہوئے ہیں ۔ اگر وہ شاعری نہ کرتے تو یقیناً پاگل ہو جاتے یا کلیجہ پھاڑ کر مر جاتے ۔ انھوں نے یہ پہاڑ جیسا غم اور اس کے تجربوں کی سفاکی کو شاعری کے وسیلے ہی سے برداشت کیا ہے ۔ ان کی شاعری میں تجربے کے بے شمار پہلو سامنے آ کر ان کے دل کی اور ہمارے جذبات کی تصویر بن گئے ہیں :

اس شہرِ جنوں میں کس کس کو مفہوم خرد سمجھاؤ گے

ہر شخص یہاں دیوانہ ہے زنجیر کسے پہناؤ گے

دو ایک شعر اور سنتے چلیے :

جو ترے غم کے کل تک تھے دشت و جبل

وہ مرے گھر کے دیوار و در ہو گئے

محسوس یہ ہوتا ہے روشام و سحر میں

میں ٹھہر گیا ہوں مری منزل ہے سفر میں

وہ ایک سانس جسے میں نے زندگی سمجھا

وہ ایک سانس بھی سینہ فگار گذری ہے

حرم ہو، شہر نگاراں ہو، میکدہ کہ چمن
کہاں کہاں سے تری رہ گذار گذری ہے

غزل کا لہجہ۔ غزل کا چھب آج بدل گیا ہے لیکن غزل کا قدیم لہجہ آج بھی لطف دیتا ہے اور ہمارے دلوں میں اُتر جاتا ہے۔ غنی دہلوی اس لہجے کے محافظ، اسی انداز کے داعی اور اسی چھب کے شیدائی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے بقیہ کلام کو بھی اشاعت سے ہم کنار کر دیں گے ورنہ اس دور ناپرسان میں معلوم نہیں سیلاب بلا پھر کہاں جائے اور کس طرف جائے۔

۱۸ر جنوری ۱۹۸۰ء

صابر ظفر کی غزل

کتابوں کی رونمائی ویسے تو اب ایک عام سی بات ہوگئی ہے لیکن اچھی کتاب جب بھی رونما ہوتی ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ قوم کی ذہنی و فکری دنیا میں ایک اہم واقعہ کی نوید ہوتی ہے۔ اس نوید میں کوئی سنسنی تو ہرگز نہیں ہوتی لیکن اچھی کتاب اپنے سے پہلے لکھی جانے والی کتابوں کی موجود ترتیب کو بدل کر خود اپنی جگہ بنالیتی ہے۔ "دھواں اور پھول" صابر ظفر کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور جس میں چار پانچ شعر کی ۸۸ غزلیں اور ۱۶ متفرق اشعار شامل ہیں لیکن شاعری کے اعتبار سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے کہ بہت جلد دورِ حاضر میں موجود مجموعہ ہائے کلام میں اپنا مقام پیدا کرلے گا۔ یہ بات میں نے اس لیے کہی کہ اس دور میں جب شعری مجموعے کثرت سے شائع ہو رہے ہیں، بہت کم مجموعے ایسے ہیں جو شاعری، شاعرانہ لہجے اور احساس کی لطافت و تازگی کے اعتبار سے صابر ظفر کے اس مجموعے کو پہنچتے ہیں۔ اس مجموعے کو پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا کہ لچھمی دیوی تو صابر ظفر پر مہربان نہیں ہے لیکن سرسوتی صابر ظفر پر یقیناً مہربان ہے اور اس وقت سے مہربان ہے جب ۱۹۶۷/ ۱۹۶۸ء میں صابر ظفر نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نیا دور کی ڈاک میں جب بھی کسی معروف لکھنے والے کی کوئی تحریر آتی تو میں اسے الگ کرلیتا اور جلدی سے پڑھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرلیتا لیکن غیر معروف اور نئے لکھنے والوں کی چیزیں ایک فائل میں رکھ دیتا کہ پہلی فرصت میں انھیں توجہ سے پڑھوں گا۔ پھر یہ پہلی فرصت اتنی دیر سے میسر آتی کہ اکثر نئے لکھنے والوں کی تحریریں باسی ہو جاتیں۔ ایک دن میں ایسے ہی لکھنے والوں کا کلام دیکھ رہا تھا کہ سینکڑوں غزلوں کے انبار میں ایک غزل سامنے آئی۔ شاعر کا نام "صابر

ظفر والی" تھا۔ یہ نام میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنا تھا اور پھر صابر کے ساتھ ظفر والی کی ترکیب کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے مدیرانہ دیانت کے پیش نظر پوری غزل پڑھی اور غزل پڑھ کر روح تازہ ہوگئی۔ مطلع تھا:

حد سے کوئی شخص اگر بڑھا ہے
ماحول نے قید کر لیا ہے

میں نے غزل پڑھی اور اسے نیا دور کے لیے منتخب کر لیا جو نیا دور کے شمارہ ۵۵/۵۶ میں شائع ہوگئی۔ اس کے بعد صابر ظفر والی نے اور غزلیں بھی بھیجیں جو "نیا دور" میں وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں لیکن میں نے ان کے نام میں ان کی اجازت کے بغیر اور اپنی پسند کے عین مطابق یہ ترمیم و تنسیخ کر دی کہ ان کے نام سے والی کا لفظ نکال دیا اور صرف صابر ظفر شاعر کا نام رکھ دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام خود شاعر کو بھی پسند آیا اور اس نے اسے نہ صرف قبول کر لیا بلکہ صابر تخلص کے بجائے ظفر تخلص اختیار کر لیا۔ اس طرح صابر ظفر والی صابر ظفر بن گئے اور "دھواں اور پھول" میں اب ہر مقطع میں انھوں نے ظفر تخلص ہی استعمال کیا ہے۔

صابر کو میں اُسی وقت سے جانتا ہوں۔ میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف ہوں جس کی الگ داستان ہے جو میں اس وقت لکھوں گا جب صابر ظفر اردو زبان کا ممتاز ترین شاعر بن جائے گا۔ اس نے اب تک جو سفر کیا ہے وہ صرف خداداد شاعرانہ جوہر کی سواری پر کیا ہے۔ اس کے پاس نہ دولت ہے۔ نہ گھر در ہے کہ کسی کو بلائے۔ نہ سماجی مرتبہ ہے۔ نہ تعلقات عامہ کی گاڑی ہے۔ بس لے دے کر شاعری ہی اس کی زندگی ہے۔ یہی اس کی پونجی ہے۔ لیکن اس دور میں جب پیسہ خدا بن گیا ہے، شاعر یا شاعری کو کون پوچھتا ہے؟ پھر صابر ظفر گلوکار شاعر بھی نہیں ہے کہ مشاعروں سے پیٹ کو روزی فراہم کر سکے۔ اس صورتِ حال میں جب وہ ۳۶ سال کا ہوگیا ہے۔ دس بچوں کا باپ ہے۔ ۴ فوت ہوگئے ہیں اور ۶ ماشاءاللہ بقید حیات ہیں۔ اس پر کیا گذرتی ہوگی اور وہ کس طرح اپنے شب و روز بسر کرتا ہوگا آج تک اس سفاک معاشرے نے کبھی نہیں سوچا اور

اس سفاک معاشرے میں حسن اتفاق سے آپ بھی شامل ہیں اور میں بھی۔

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں جئیں
چراغ ہو تو جلائیں ، لباس ہو تو سئیں

اپنے ہونہار سپوتوں کو یہ معاشرہ یہی دیتا ہے اور شاید یہی دے سکتا ہے۔ صابر ظفر کے یہ چار شعر سُنیے اور دیکھیے کہ ان میں ذات اور زمانے کا کرب کتنی تازگی اور کتنی شدت کے ساتھ ہم سے کس منفرد لہجے میں مخاطب ہے۔

چاہیئے اب تو اے خدا، اور ہی مہرباں مجھے
غیر تو خیر غیر ہیں بھول گئی ہے ماں مجھے
بے خبری یہاں خبر، بے ہنری یہاں ہنر
تونے بہ ایں شعورِ فن بھیج دیا کہاں مجھے
اس نے مرے نصیب میں لکھ دیا خشک و تر کا کرب
بخش کے شہرِ اشک میں قطعہ جاں مجھے
دھوپ میں اس کا روپ تو یاد نہیں رہا مگر
ابر کی ٹکڑیاں ظفر لگتی تھیں چھتریاں مجھے

اس موقع پر میں، جو صابر ظفر کی شاعری کو پسند کرتا ہوں، صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس شاعر کے کلام کو ذرا توجہ سے پڑھیے اور دیکھیے کہ وہ کس سلیقے سے شاعری کر رہا ہے اور کس سادہ سی زبان میں کیسے منفرد لہجے کو جنم دے رہا ہے۔ میں آج کی محفل میں اس کی شاعرانہ خصوصیات اور اس کی انفرادیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا لیکن اس کی شاعری کی طرف آپ سب کی توجہ خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

آتشِ کبر نکلتی ہی نہ تھی دل سے ظفر
چوبِ منبر کو جلایا تو یہ کافر نکلی

گذارتا ہوں جو شب، عشقِ بے معاش کے ساتھ
تو صبح اشک مرے ناشتے پہ گرتے ہیں

(۹/ اپریل ۱۹۸۶ء)

"بے جواز" کے حوالے سے

ہر تقریب میں صدر جلسہ کے ساتھ مشکل یہ آپڑتی ہے کہ کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا وہ کہا جاچکا ہوتا ہے اور صدر جلسہ کو رسم صدارت کی لاج رکھنے کے لیے اس بات سے بے نیاز ہو کر کہ لوگ کتنی توجہ سے سُن رہے ہیں یا نہیں سُن رہے ہیں، کلماتِ صدر بہر طور ادا کرنے پڑتے ہیں۔ میں بھی فی الحال رسم ہوشربا کی اسی منزل میں ہوں۔ اس لمحۂ موجود میں آپ اور میں یعنی ہم دونوں مجبور ہیں۔ یہاں میں "جبر" کے ساتھ "استحصال" کا لفظ عمداً اس لیے استعمال نہیں کر رہا ہوں کہ صدیوں سے ہم اس کے عادی ہو چکے ہیں کہ اس کے بغیر نہ عوام بے چارے پُرسکون زندگی گذار سکتے ہیں اور نہ خواص چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ حیات خوش اسلوبی سے چل رہا ہے۔ بارش ہو جاتی ہے تو فصلیں تیار ہو جاتی ہیں اور بارش نہیں ہوتی تو فصلیں سوکھ جاتی ہیں اور خدا بھلا کرے ترقی یافتہ ممالک کا کہ ہم حسب ضرورت اناج درآمد کر لیتے ہیں اور زندگی اسی طرح کہ جیسی تھی، آرام سے گذر جاتی ہے۔ اس عمل سے شاعر اور اس کے مصرع کی تردید بھی ہو جاتی ہے جس نے کہا تھا: ؎

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں

آرام خواص کے حصے میں آتا ہے اور جہانِ خراب عوام کے حصے میں اور عوام میں ہمارے ملک کے دانشور، ادیب، مفکر اور شاعر سب ہی شامل ہیں اور اسی مثالی توازن کی وجہ سے ہمارا معاشرہ اور اس کے آسیب، شاہدِ عینی کے طور پر، گواہی دیں گے کہ بحرانوں سے پاک کتنے آرام سے سفرِ حیات طے کر رہا ہے۔ اس آرام میں نہ سوچنے کی ضرورت پڑتی ہے

اور نہ مسئلے مسائل پر غور و فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ زر پرستی جیساکہ ہمارے ہاں حل ہو رہے ہیں سارے مسائل خود حل کر دیتی ہے۔ یہی منزل ہے اور یہی مقصدِ حیات ہے۔ شعر و شاعری، ادب و فلسفہ، تفکر و تدبر، علوم و فنون کارِ بے کاراں ہیں جس کے معنی وہ اخراجات ہیں جن سے نہ کار خریدی جا سکتی ہے اور نہ پیٹ پالا جا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے نے یہ بات برسوں ہوئے طے کر دی تھی اور ایسے طے کر دی تھی گویا اب یہ ہمارا مقدر ہے۔ ایسے میں جب ادب و شعر کی یا فلسفہ و فکر کی کوئی کتاب چھپ کر منظر عام پر آتی ہے تو میں اس ادیب یا شاعر، فلسفی یا مفکر کو صدقِ دل سے دادِ بیداد دیتا ہوں جس نے اس دورِ نا پُرساں میں یہ کارِ بے کاراں کیا ہے اور ادب و فن کو سرخرو کیا ہے۔ اسی وجہ سے آج میں اس بھری محفل میں حضرت حامد سروش کو دلی مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اس زر پرست معاشرے میں زر پرستی پر تُف بھیج کر شاعری کی دیوی کو تازہ پھولوں کے گجرے پہنائے ہیں اور دو دعائیں بھی کی ہیں۔ ایک یہ :

ٹوٹے سکوت قصۂ مہر و وفا چلے
دَم گھٹ رہا ہے دوستو! ٹھنڈی ہوا چلے

اور دوسری یہ :

کب سے ہیں جانماز پہ اس انتظار میں
مقبول ہوں دعائیں تو سجدے ادا کریں

یہی وہ دعائیں اور آرزوئیں ہیں جن کے خواب شاعر دیکھتا ہے تاکہ دھوپ کی جھلسا دینے والی گرمی سے نجات ملے۔ اسی لیے دھوپ اور سایہ وہ دو بنیادی اشارے ہیں جن کے حوالے سے حامد سروش نے اپنے کرب، اپنے دکھوں اور ناانصافیوں کی داستان سنائی ہے۔ آگ اور پیڑ کی علامتیں بھی یہی تخلیقی عمل کرتی ہیں۔ آگ دھوپ ہے اور سایہ پیڑ ہے۔ سایہ اردو شاعری کی روایت کا حصہ ہے لیکن اس روایت میں حامد سروش نے یہ تبدیلی کی کہ اسے دیوار کے سائے سے ہٹا کر پیڑ کے سائے میں لا کھڑا کیا۔ اب وہ میری طرح :

ع ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ

یا شہرت بخاری کی طرح :

ع سورج کا اثر سایۂ دیوار کرے ہے

نہیں کہتے بلکہ خواجہ حیدر علی آتش کے شجرِ سایہ دار کی روایت کو ملا کر ایک کر دیتے ہیں اور اسے یہ صورت عطا کرتے ہیں :

چھنتی تھی دھوپ پتوں سے چھَن چھَن کے جسم میں
سایہ ملا تو وہ بھی سُلگتا ہوا ملا

دھوپ ہو تم کبھی ، کبھی چھاؤں
کتنے بے گانے ، کس قدر اپنے

جو دن کی تیز دھوپ سے بچ کر نکل گئے
جب نخلِ شب کے سائے میں پہنچے تو راکھ تھے

دھوپ اور چھاؤں ، سایہ اور دھوپ ، پیڑ اور سورج کے کنایوں کو حامد سروش نے بار بار استعمال کیا ہے لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ہر بار اس طور پر استعمال کیا ہے کہ ان اشاروں میں تنوع اور زندگی کے تجربات و مشاہدات کا پھیلاؤ باقی رہتا ہے اور ساتھ ساتھ چنبیلی اور چمپا کے پھولوں کی تازگی ، اپنی خوشبوؤں کے ساتھ ، اُن کے کلام میں محسوس ہوتی ہے ۔ یہی تنوع اور تازگی ان کی شاعری کی جان ہے ۔ میں اس بات کا یہاں خاص طور پر اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ حامد سروش کے باطن میں ایک سچا اور بڑا شاعر چُھپا ہوا موجود ہے جس کا پہلا اظہار انھوں نے " بے جواز " میں کیا ہے اور جس کا مزید بھر پور اظہار وہ یقیناً اپنے دوسرے مجموعے میں کریں گے ۔ گذشتہ پانچ سال میں متعدد مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں اور حامد سروش کا مجموعۂ " بے جواز " ان مجموعوں میں ایک قابلِ توجہ مجموعہ ہے اور یہی اس مجموعے کی اشاعت کا ٹھوس جواز ہے ۔ جس نقاد نے یہ کہا تھا یقیناً صحیح نہیں کہا تھا کہ میرؔ

غالب اور فیض کے بعد کسی شاعر اور کسی شاعری کے مجموعے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ معلوم نہیں وہ صاحب نقد کون تھے ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب ہزاروں شاعر کسی دور میں شاعری کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا کر شعر کہتے ہیں تو پھر نرگس کے اس کھیت میں برسوں میں جا کر ایک شاعر پیدا ہوتا ہے جسے آپ دیدہ ور کہتے ہیں۔ وہ دیدہ ور کون ہوگا اس کا فیصلہ ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ جب آپ سب نوجوان شعر کہیں گے اور کہتے رہیں گے اور اپنے معاشرے کی روح کو اپنے تجربات کی بھٹی میں پکا کر شعر کے روپ میں کندن بنائیں گے تو پھر ایک شاعر ان کے درمیان سے ایسا پیدا ہوگا جسے کبھی آپ حافظ کہیں گے، کبھی سعدی کہیں گے اور کبھی میر، غالب یا اقبال کہیں گے۔ ہمیں اس وقت شکایت اپنے اس سفاک معاشرے سے ہے جو لکھنے والوں کا نہ احترام کرتا ہے، نہ انھیں عزت دیتا ہے اور نہ ان کے تخلیقی کاموں کو اہمیت دیتا ہے۔ جب معاشرے تخلیقی عمل کو اہمیت دینے لگتے ہیں تو وہ نہ صرف خود زندہ ہو جاتے ہیں بلکہ اس کے شاعر، اس کے ادیب، اس کے مفکر اسے دنیا میں سرخرو اور قابلِ ذکر بنا دیتے ہیں:

وہ پیڑ کاٹ کے، لکڑی کو بیچ کر خوش تھا
پھر اس کے بعد کڑی دوپہر میں جلتا تھا

(۸؍ جنوری ۱۹۸۸ء)

بات سے بات: نصراللہ خاں

جب مجھے یہ بتایا گیا کہ حضرت قبلہ محترم نصراللہ خان صاحب کی سال گرہ جلسۂ عام میں منائی جا رہی ہے اور اس جلسۂ سالگرہ کی صدارت اس حقیر فقیر پُر تقصیر کو کرنی ہے تو معاً مجھے خیال آیا کہ میں نصراللہ خان صاحب کی تسبیحِ عمر کا دانہ دانہ شمار کروں لیکن پھر خیال آیا کہ ماضی کو شمار کرنا تو اب لاحاصل ہے اس لیے گذشت انچہ گذشت پر عمل کرنا چاہیے۔ ہاں تقاضائے دانشمندی یہ ہے کہ مستقبل کا حساب رکھنا ضرور چاہیے کہ یہی حاصلِ کائنات ہے۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں ہے کہ آپ نصراللہ خان صاحب کی کون سی سالگرہ منا رہے ہیں لیکن میری اتنی خواہش ضرور ہے کہ آپ بغیر کسی حساب کتاب کے ہر سال اسی طرح ان کی سالگرہ مناتے رہیں۔ حسابِ دوستاں در دل کے آپ بھی قائل ہیں اور میں تو سدا سے اسی پر عمل پیرا ہوں۔ اس میں خود غرضی کا پہلو یہ ہے کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نصراللہ خان اسی طرح برسوں باتوں کے پھول بکھیرتے رہیں اور ان کے پڑھنے والے اپنی زندگی کی اُداسیوں کو ان کی تحریروں کو پڑھ کر ہمیشہ مسرتوں سے بدلتے رہیں۔

میں نصراللہ خان صاحب کو اُس وقت سے جانتا ہوں جب وہ واقعی بوڑھے تھے۔ پیٹ میں آنت، نہ منہ میں دانت۔ حسنِ اتفاق سے جو دو چار دانت رہ گئے تھے وہ بھی گل افشانیٔ گفتار کے جھکڑ سے جھڑ کر برابر ہو گئے تھے لیکن ایک بات جو اس وقت تھی، وہ آج بھی بحمداللہ جوں کی توں باقی ہے۔ اس وقت بھی وہ بہت دلچسپ باتیں کرتے تھے اور بہت کرتے تھے اور آج بھی ان کا صدقۂ جاریہ کا یہ دریا اسی طرح موجزن ہے۔ جب وہ بات چیت شروع کرتے تو بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے گھنٹوں گذر جاتے اور پھر جب شام کے

سائے طویل ہونے لگتے تو پتا چلتا کہ خدا کے فضل و کرم سے بُرا وقت گذر گیا ہے۔ ان ہی باتوں سے ان کی زندگی عبارت تھی اور یہی باتیں ان کا مقصدِ حیات تھیں۔ تیز ترک گامزن منزلِ ما دور نیست۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھیں دُنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ یہ محض باتیں کرنے کے لیے دُنیا میں بھیجے گئے ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا اور قیامت کا ذکر چھیڑ کر میری اور آپ کی جراتی تک بات کو پہنچا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار وہ تقریباً دو گھنٹے پروفیسر حسن عسکری کو موضوعِ گفتگو بنا کر گل افشانیاں کرتے رہے تھے اور طرح طرح کے واقعات اور دلائل سے یہ جتا رہے تھے کہ اے ایم قریشی نے حسن عسکری کو پوسٹر لکھنے پر مقرر کر دیا ہے۔ یہ سب باتیں اپنے مخصوص انداز میں وہ کچھ اس طور پر میرے ذہن میں انڈیل رہے تھے کہ میں حالتِ نشہ میں آکر ان پر ایمان بھی لے آیا تھا۔ نصراللہ خان صاحب ایسی خوب صورتی سے جھوٹ بولتے کہ سچ معلوم ہوتا۔ ایسے واقعات تخلیق کرتے جن کا وجود فرش تا عرش کہیں نہ ہوتا اور ایسے لطیفے گھڑتے کہ بس وحی سے ایک ہی درجہ کم معلوم ہوتے۔ ایک دن شاہد احمد دہلوی مرحوم سے ان کا ذکر آیا تو مجھے سمجھانے بجھانے کے سے انداز میں کہنے لگے ''میاں ابھی نوجوان ہو۔ اُن کے چکر میں پڑ گئے تو کہیں کے نہ رہو گے۔'' میں سوچ میں پڑ گیا۔ یا اللہ! نصراللہ خان تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ کیسی پُر از معلومات باتیں کرتے ہیں۔ کیسے کیسے واقعات بیان کرتے ہیں۔ ادب کی عظیم شخصیتوں کے بارے میں کیسے کیسے لطیفے سُناتے ہیں۔ کیا یہ سب باتیں ہی باتیں ہوتی ہیں؟ اس وقت میں طالب علم تھا اور ادیبوں سے ملنے اور ادب کی دنیا میں داخل ہونے کے جوش اور ولولے سے دل و دماغ منور تھا۔ ایک دن نصراللہ خان صاحب پھر مل گئے اور ایک رسالے کے مدیرِ اعلیٰ کے بارے میں چند ایسے واقعات سُنائے کہ میں ششدر رہ گیا۔ ان مدیرِ اعلیٰ صاحب کی شخصیت کا یہ ایک ایسا رُخ تھا جس سے میں اب تک بالکل ناواقف تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب ان مدیرِ اعلیٰ سے میری ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو ان کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں اور غصے سے کم و بیش لال پیلے ہو گئے۔ فوراً کہنے

لگے کہ نصراللہ خان ہوں گے۔ یہ شرارت وہی کر سکتے ہیں۔ جب نصراللہ خان صاحب سے ملاقات ہوئی اور میں نے ان سے دریافت کیا تو کمال بے نیازی اور انتہائی معصومیت کے ساتھ فرمانے لگے، "بھائی! یہ تو پرسوں کی باتیں تھیں۔ رات گئی۔ بات گئی۔ آج کی تازہ باتیں الگ ہیں۔" میں کچھ دیر حیرت سے ان کا منہ تکتا رہا اور اس عرصے میں یہ بسم اللہ کہے بغیر شروع ہو گئے، اور ایسے شروع ہوئے کہ بارش میں وہ بھی بھیگتے رہے اور میں بھی لیکن باتوں کا سلسلہ اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہا۔ یہی باتیں ان کا فن ہے اور اسی فن کی مناسبت سے انھوں نے اپنی دوشیزہ کتاب کا نام بھی "بات سے بات" رکھا ہے۔

روزنامہ "حریت" کی اشاعت کے وقت جب مجھے معلوم ہوا کہ نصراللہ خان صاحب اب اس میں فکاہیہ کالم لکھا کریں گے تو مجھے اس لیے بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ اب ان کی زبانی جمع خرچ والی باتیں صرف ہوا میں تحلیل نہیں ہوں گی اور ان کی ذہانت کا دہکتا ہوا کوئلہ باتوں کی تیز ہوا سے صرف راکھ نہیں بنے گا بلکہ اب ان کی گل افشانی گفتار محفوظ بھی ہو جائے گی۔ باتیں کرنا، باتیں لکھنا اور بات سے بات نکالنا یہی نصراللہ خان صاحب کا فن ہے اور اس فن میں اردو صحافت میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ابن انشا نے ایک راہ نکالی تھی اور گلابی اردو کو جدید اسلوب میں ڈھال کر اپنا ایک انداز تحریر بنایا تھا۔ ابن انشا کی تحریروں کی خوبی یہ تھی کہ آپ اُسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہ رہیں گے اور آخر میں جب ختم کریں گے تو صرف مزے کا احساس باقی رہ جائے گا۔ نصراللہ خان کی تحریر کی خوبی یہ ہے کہ آپ اسے شروع کریں گے تو ختم کیے بغیر نہیں رہیں گے لیکن آخر میں مزے کے احساس کے علاوہ چند فقرے اور باتوں کے چند نئے پہلو بھی آپ کے ذہن میں محفوظ رہ جائیں گے۔ اس سطح پر نصراللہ خان ابن انشا سے آگے ہیں۔ ان کے انداز بیان میں اُردو زبان کی روایت بولتی ہے، ان کے اظہار میں بات چیت کا عام لہجہ پورے زور کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے اور ہم بڑی سے بڑی بات کو ان کے مخصوص شگفتہ و مزاحیہ انداز میں ہضم کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں زور زور سے چہک چہک کر باتیں کرنے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کی تحریر میں خاموشی نہیں بلکہ شور اور قہقہے لگانے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پڑھنے والے

کو سونے نہیں دیتے بلکہ اپنی ہنسی سے، اپنی اونچی آواز سے، اپنے برجستہ فقروں سے اسے جگائے رکھتے ہیں۔ پھر پُر لطف بات یہ ہے کہ ان کے ہاں ذاتیات بالکل نہیں ہوتی بلکہ کسی کی ذات اگر ان کے قلم کی زد میں آتی ہے تو ذات کو بات میں لپیٹ کر اس طور پر چھپا لیتے ہیں کہ بات بھی کہہ جاتے ہیں اور زیرِ قلم ذات بھی زخمی نہیں ہوتی۔ ان کے کالم خالص مزاح کی خوب صورت مثال ہیں۔

پھر ایک بات اور وہ روز کالم لکھتے ہیں لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ ان کا قلم تھک گیا ہے یا وہ بالجبر لکھ رہے ہیں۔ پہلے دن سے لے کر آج تک ان کے قلم سے ویسے ہی پھول جھڑ رہے ہیں۔ ان کے کالموں میں معیار کی ایسی یکسانیت ہے کہ بہت کم کالم نویسوں کے ہاں ملتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نصراللہ خان صاحب اپنے مخصوص انداز کی کالم نویسی میں آج ملک کے سب سے بڑے کالم نویس ہیں۔ وہ جو میں نے شروع میں کہا تھا کہ نصراللہ خان صاحب باتوں کے بادشاہ ہیں اور بات سے بات ایسے نکالتے ہیں جیسے ہم آپ مکھن سے بال نکالتے ہیں یا دودھ میں سے مکھی نکالتے ہیں تو اس کی مثال میں ان کے متعدد کالم پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ لکھ کر میں یونہی کتاب کھولتا ہوں اور میری نظر "کراچی اور موسم" کے عنوان پر جاتی ہے۔ دیکھیے اب بات شروع ہوتی ہے۔

> "موسمیات کے ماہرین سے اب تک یہ نہ ہوا کہ جو موسم یہ چاہتے وہ ملک میں رائج کرا دیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو پولیس کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ نہ کہیں لاٹھی چلتی اور نہ کہیں آنسو گیس اور گولیوں کی ضرورت پڑتی۔ ایسے موقعوں پر محکمۂ موسمیات بس یہ اعلان کر دیتا کہ جلسے جلوسوں اور ہڑتالیں نہیں ہوں گی۔ اگر کوئی سیاسی پارٹی ایسا کرے گی تو ہم اولے برسا دیں گے؛ لُو چلا دیں گے یا ستر میل فی گھنٹے کی رفتار سے آندھی چھوڑ دیں گے۔ ایسی صورت میں اخباروں میں کچھ اس طرح کی خبریں شائع ہوا کریں گی۔

آج حزب اختلاف اور سرکاری پارٹی میں نشتر پارک میں
بڑی زور کی جھڑپ ہوئی۔ سرکاری پارٹی کے کچھ عناصر نے حزب
اختلاف کے اجلاس پر اولے برسائے تو جماعت اسلامی نے
سخت گرمی دکھائی۔ جمعیت علمائے پاکستان نے لُو چلا دی۔
پیپلز گارڈ سیلاب لے آئے۔ سردار شوکت حیات خان کی پارٹی
نے جھکڑ چھوڑا۔ پولیس نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے
بذریعہ آلاتِ تنبیہ عوام پر قابو پالیا۔ حکومت نے اعلان کیا ہے
کہ جو تماشائی سیلاب سے تباہ ہوئے ہیں یا جنھیں سیاسی لُو لگی ہے
یا جو سردار شوکت حیات کے جھکّڑ کی نذر ہو گئے ہیں ان سب کو
حوصلہ افزائی کے ضمن میں (شاباشی) انعامات یعنی کنسولیشن پرائز
دیئے جائیں گے"۔

یہ شوخی، یہ چُہل، یہ مزاح، یہ بے باکی، اُن کے کالموں کا ایسا وصف ہے کہ پڑھنے والا ان کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ نصراللہ خان صاحب کے قلم کی سیاہی نے، فقروں کی گرمی نے، زبان وبیان کے حُسن نے مزاح کی شگفتگی نے طنز کی حدّت نے یقیناً عام آدمی کے شعور میں اضافہ کیا ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ہم نصراللہ خان صاحب کو مبارک باد دیئے بغیر یونہی سرسری طور سے گذر جائیں۔ ان کی تحریر میں ایک ایسی ادبیت ہے جو ان کے کالموں کو زندہ رکھے گی۔ زبان وبیان پر جیسی قدرت نصراللہ خان صاحب کو حاصل ہے وہ اس رنگ کے کسی صحافی کو حاصل نہیں ہے۔ وہ لفظوں سے نئی نئی وضع اور نئے نئے ذائقے کی روٹیاں کالم کے تنور میں پکا کر اپنے پڑھنے والوں کی ضیافتِ طبع کے لیے ہر روز دسترخوان پر سجاتے ہیں۔

آخر میں مَیں نصراللہ خان صاحب کو مسلسل اچھے کالم لکھنے پر دلی مبارکباد

پیش کرتا ہوں۔ اسی کے ساتھ ساتھ جلسۂ سالگرہ کے منتظمین سے میری یہ گذارش ہے کہ وہ سالگرہ تو اسی طرح ضرور مناتے رہیں لیکن یہ ہرگز نہ پوچھیں اور نہ بتائیں کہ ان کی کون سی سالگرہ ہے۔ جب آدمی پچاس سے آگے بڑھتا ہے تو پھر عمر کا حساب بے معنی ہو جاتا ہے اور انسان پھر ساری عمر کے لیے ۲۴ سال کا ہو جاتا ہے اور خواتین و حضرات ہمارے نصر اللہ خان صاحب بھی اب ماشاء اللہ مستقل طور پر چوبیس سال کے ہو گئے ہیں۔ معلوم نہیں اس عمرِ پُر بہار میں وہ اب کیا کیا گُل کھلائیں گے۔ خدا ان کو وہ عمرِ دراز عطا فرمائے جس کے ہر برس میں پچاس ہزار دن ہوتے ہیں۔

۱۹۸۶ء

خطبۂ صدارت

تاریخ ادب انگریزی: احسن فاروقی

پروفیسر ڈاکٹر محمد احسن فاروقی نہ صرف اردو ادب کے بڑے نقاد، بڑے افسانہ نگار اور بڑے ناول نگار تھے بلکہ برعظیم پاک و ہند میں انگریزی ادب کے ایک ایسے استاد بھی تھے جو اپنے وسعتِ علم، کثرتِ مطالعہ اور دل نشیں انداز درس و تدریس کی وجہ سے شہرت رکھتے تھے۔ اتنے پڑھے لکھے لوگ ہمارے دور میں اتنے کم ہیں کہ انھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر احسن فاروقی اردو، انگریزی، فارسی، عربی کے علاوہ فرانسیسی، جرمن، لاطینی و یونانی زبانوں سے بھی واقف تھے۔ میں نے انھیں ہمیشہ پڑھتے لکھتے اور بحثوں میں الجھتے دیکھا۔ وہ پاکستان میں دانشوری کی روایت کے صحیح معنی میں منفرد نمائندہ تھے۔ انھوں نے ساری عمر درس و تدریس اور علم و ادب کی خدمت میں گذار دی اور کراچی سے کوئٹہ جاتے ہوئے فروری ۱۹۷۸ء میں دل کا دورہ پڑنے سے وفات پائی۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی بہت سی تحریریں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے سینکڑوں مضامین، افسانے اور انشائیے مختلف رسائل و جرائد میں بکھرے پڑے ہیں۔ "تاریخ ادب انگریزی" کا غیر مطبوعہ مسودہ بھی میرے پاس محفوظ تھا جسے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ شائع کر رہا ہے۔

گذشتہ دو سو سال سے انگریزی زبان و ادب برعظیم پاک و ہند کی درس گاہوں میں

پڑھائے جارہے ہیں لیکن اب تک اردو زبان میں انگریزی ادب کی کوئی ایسی تاریخ نہیں لکھی گئی جسے مستند کہا جا سکے۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر احسن فاروقی کی زیرِ نظر کتاب "تاریخ ادب انگریزی" پہلی تاریخ ہے جسے انگریزی ادب کے ایک راز داں نے اردو زبان میں لکھا ہے۔ اس کتاب میں جو مواد اور زاویۂ نظر پیش کیا گیا ہے وہ فاروقی صاحب کے پچاس سال کے گہرے مطالعے اور درس و تدریس کے وسیع تجربے کا نچوڑ ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ انگریزی زبان، ادب اور کلچر نے ہمارے زبان و ادب اور تہذیبی سانچوں کو شدت سے متاثر کر کے انھیں تبدیل کیا ہے۔ اردو کا جدید سرمایۂ ادب، جس کی روایت سرسید و حالی سے شروع ہوتی ہے، انگریزی ادب اور انگریزی زبان کے ذریعے مغربی ادبیات سے متاثر ہوا ہے۔ جدید اردو ادب، نظم و نثر کی مختلف اصناف اور تخلیقی عوامل سے لے کر تنقید اور اصولِ تنقید تک مغرب کے گہرے اثرات کا غماز ہے۔ نثر میں ناول، افسانہ، ناولٹ، طویل مختصر کہانی، رپورتاژ، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، ادبی و فکری تنقید اور شاعری میں جدید موضوعات و اسالیب کی نظموں سے لے کر نظم آزاد، نظم معریٰ، نثری نظم وغیرہ تک جس طور پر اردو میں برتے گئے ہیں، اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریزی، مغربی ادب کی مختلف تحریکوں نے جس طرح اردو ادب کو متاثر کیا ہے، وہ بھی سب ہمارے سامنے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو انھیں اثرات کے تحت سرسیّد سے پہلے اور بعد کا اردو ادب، طرزِ احساس اور اصنافِ ادب، دونوں کے اعتبار سے، بالکل بدل چکا ہے۔ اس پہلو سے دیکھیں تو تعجب ہوتا ہے کہ اب تک انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں کیوں نہیں لکھی گئی؟ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انگریزی ادب کی تدریس چونکہ انگریزی زبان کے ذریعے ہوئی اور طلبہ و اساتذہ نے اسی زبان میں پڑھ کر اپنا مقصد پورا کر لیا اس لیے اہلِ علم کو اردو زبان میں انگریزی ادب کی تاریخ لکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ دنیا کے سب متمدن ممالک میں ان کی اپنی زبانیں درس و تدریس کا ذریعہ ہیں۔ انگریز اگر فرانسیسی، جرمن یا روسی زبان سیکھتا ہے تو اپنی زبان انگریزی ہی کے ذریعے سیکھتا ہے۔ اگر اردو زبان سیکھتا ہے تو وہ بھی انگریزی زبان ہی کے ذریعے سیکھتا ہے۔

ان کی اپنی زبان میں وجود میں آتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں صورت حال یہ ہے کہ ہم ہر علم انگریزی زبان کے ذریعے سیکھتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہماری تخلیقی صلاحیتیں اور اختراعی قوتیں کم زور ہو کر کم و بیش ناکارہ ہو جاتی ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم کے اس قومی احساس کی وجہ سے انگریزی ادب کی تاریخ اردو زبان میں لکھی جا سکی۔ یہ "تاریخ" یقیناً ایک ایسا کارنامہ ہے جس سے طلبہ و اساتذہ سے لے کر عام قاری تک سب مستفید ہوں گے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کی یہ تصنیف اردو ادب کے طلبہ، اساتذہ اور قارئین کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے جدید اردو ادب کا پس منظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔ وہ ادب جو مغرب سے استفادہ کر کے سر سید سے لے کر اب تک لکھا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کا ارتقا، رفتار اور بنیادی پس منظر بھی مربوط انداز میں پڑھنے والے پر واضح ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کو لکھتے ہوئے ڈاکٹر فاروقی نے اختصار لیکن جامعیت سے کام لیا ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو اپنی افادیت اور زاویۂ نظر کے باعث مقبول ہو گی۔

(۵ اپریل ۱۹۸۶)

عمر گذشتہ کی کتاب

میں آج اس بات کا انکشاف کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے آگرہ بہت پسند ہے اور اسی لیے مرزا ظفر الحسن صاحب بھی بہت پسند ہیں۔ ممکن ہے یہ بات سُن کر آپ کے ذہن کے دریچے سے "ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ" کی کہاوت جھانکنے لگی ہو لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بات اتنی انمل بے جوڑ نہیں ہے جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔ اس لیے آپ کی الجھن میں مزید اضافہ کیے بغیر پہلے یہ بتا دوں کہ مجھے آگرہ کیوں پسند ہے۔ آگرہ کی پسندیدگی کی ایک وجہ تو وہی ہے جسے آپ بھی جانتے ہیں اور جس کا اظہار اگر نہ بھی کیا جائے تو بات آپ تک یقیناً پہنچ چکی ہوگی لیکن آگرہ کی پسندیدگی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھے آگرہ والیاں بہت پسند ہیں — اُن کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ جب بولتی ہیں تو پھول جھڑتے ہیں۔ لہجے میں ایسی گھلاوٹ، آواز میں ایسی میٹھی تیزی، بیان میں ایسی رچاوٹ کہ آدمی دیکھتا رہے، سنتا رہے۔ آگرہ والیوں کی یہی خصوصیت چونکہ مرزا ظفر الحسن صاحب میں بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اسی لیے میں انھیں بھی دل سے چاہتا ہوں۔ بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ تیز دھار کی قینچی کمخواب کو کاٹتی چلی جا رہی ہے اور جب لکھتے ہیں تو یہی خصوصیت ان کی تحریریں میں رنگ بھرتی ہے۔ "ذکرِ یار چلے" میں تو ان کے قلم کی قینچی ایسی چلی ہے کہ کپڑا پیچھے رہ گیا اور قینچی آگے نکل گئی۔ مرزا ظفر الحسن صاحب سے مل کر اور پھر ان کی تحریریں پڑھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں ہے۔ وہ

ویسے ہی ہیں جیسے وہ نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس بھری محفل میں ایک خاتون ایسی بھی ہوں جو مجھ سے اختلاف کریں لیکن خواتین و حضرات! ایک خاتون کی ذاتی رائے رائے عامہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ بہر حال مرزا صاحب کی زبان نے زبانی بھی اور قلم سے بھی سارے ملک کے طول و عرض میں ایک کہرام مچا دیا ہے اور پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں تو انھوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا ہے جو اس شہر کے نام کے ساتھ ویسے ہی ذہن میں آتا ہے جیسے بندر روڈ اور کیماڑی ذہن میں آتے ہیں۔ یہ مرزا صاحب کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ بے لوثی کے ساتھ "ادارۂ یادگارِ غالب" کو جنم دے کر ایک ایسا لافانی کام کیا ہے جو اس شہر کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گا اور اسی کے ساتھ مرزا ظفر الحسن کا نام نامی بھی۔ اس دور میں جب ساری قوم صرف پیسہ کمانے کی مہلک بیماری میں مبتلا ہے، جب ساری قوم کا خدا اور اس کا رسول پیسہ علیہ السلام بن کر رہ گیا ہے جس کے باعث قومِ نوح اور قومِ عاد و ثمود کی ساری برائیاں ہم میں سرائیت کر گئی ہیں، اچھی قدریں ٹوٹ پھوٹ کر ڈھیر ہو گئی ہیں اور ہم اندھے، بہرے ہو کر گہرے گڑھے کی طرف بڑھ رہے ہیں، مرزا صاحب کی یہ بے لوث خدمت، یقیناً ایسی ہے جس کا ہمیں بار بار اعتراف کرنا چاہیے اور آج میں بھری محفل میں مرزا صاحب کو اس بے لوث خدمت پر سلام کرتا ہوں۔

میں یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ مجھے تو "عمرِ گذشتہ کی کتاب" کی تعارفی تقریب میں کتاب کے بارے میں کچھ کہنا تھا لیکن مرزا صاحب کا ذکر میں نے اس لیے پہلے کیا کہ کتاب تو خود مصنف کی ذات اور صفات کا مظہر ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کتاب سے پہلے صاحبِ کتاب کا ذکر ہو جائے تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ لیکن، مرزا صاحب سے معذرت کے ساتھ، میں کتاب کا ذکر اختلاف سے شروع کروں گا۔ اس کتاب میں مرزا صاحب نے فیض احمد فیض اور مخدوم محی الدین کو موضوع بنایا ہے اور ان کی زندگی و تخلیقات کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے جس کی وجہ سے دونوں کی تصویریں پوری طرح ابھر کر نہیں آ سکی ہیں۔ اگر اس کتاب کے دو حصے الگ الگ ہو جاتے۔ ایک فیض پر، ایک مخدوم پر تو میرا

خیال ہے کہ مرزا صاحب زیادہ بہتر طریقے سے اپنے تعلقات اور اپنی محبتوں کا قرض اُتار سکتے تھے۔ فیض اور مخدوم دونوں مختلف شخصیتیں ہیں اور دونوں الگ الگ مطالعہ کی متقاضی تھیں۔ خیر یہ تو میری ذاتی رائے تھی۔ ضروری نہیں ہے کہ مرزا صاحب اس وقت، جب کتاب چھپ کر بازار میں آگئی ہے، اس بات کو کوئی اہمیت دیں۔ لیکن ایک اختلاف اس سلسلے میں "بین الاقوامی" نوعیت کا ہے۔ مرزا صاحب نے صفحہ ۱۴۴-۱۴۵ پر لکھا ہے کہ "اگر فیض کی شادی ایلس کے بجائے اس برصغیر کی کسی خاتون سے ہوتی تو میرا ایقان ہے کہ فیض بحیثیت شاعر اور انسان آج سے بالکل مختلف ہوتے۔" ایلس کی صلاحیت اور سمجھ داری کی داد برصغیر کی عورت کی تحقیر کیے بغیر بھی دی جا سکتی تھی لیکن کلیہ بنا کر برصغیر کی عورت کو، جس کا پتی ورتا ہونا دنیا زمانے میں مشہور ہے، اس طرح رد کرنا مرزا صاحب جیسے انصاف پسند شریف النفس انسان کو یقیناً زیب نہیں دیتا۔ اسی صفحے پر آگے چل کر مرزا صاحب خود مخدوم محی الدین کی بیوی کے بارے میں نصرت محی الدین کے حوالہ سے، یہ لکھتے ہیں کہ

> "امی کے ایثار اور ان کی قربانیوں کا وہ (مخدوم) اکثر ذکر کرتے اور ہم سے کہتے اس خاتون کی جتنی عزت کر سکتے ہو کرو کیونکہ اس نے میرے اور تمہارے لیے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔"
>
> (ص ۷۵)

واضح رہے کہ یہ خاتون برصغیر کی خاتون تھیں۔ اس کے برخلاف مرزا صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے جس میں بتایا ہے کہ فیض صاحب ایک بار، بغیر اطلاع دیے مرزا صاحب کو لاہور سے اپنے گھر اسلام آباد لے گئے۔ مرزا صاحب کے الفاظ میں اس واقعہ کی تفصیل سنیے:

> "ایلس نے مجھے دیکھ کر فیض سے شکایت کی کہ میرے لائے جانے کی اطلاع لاہور سے کیوں نہیں بھیجی۔ فیض نے پوچھا اگر تمہیں مطلع کر دیتا تو تم کیا کرتیں؟ ایلس نے جواب دیا خوشی میں کم از کم

ایک دُنبہ تو ذبح کرتی اور پہلے سے ان کا کمرہ ٹھیک کرتی اور شاید
ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر استقبال کرتی ۔"

(ص ۷۳)

پھر ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ

"فیض اپنے گھر میں مہمان کی طرح رہتے ہیں اور رہر مہمان
اُن کے گھر میں میزبان کی طرح نہ رہے تو اس کا بور ہونا
یقینی ہے ۔" (ص ۷۵)

بہر حال برصغیر کی عورت کے بارے میں مرزا صاحب نے جو کلیہ بنایا ہے
وہ چونکہ صحیح نہیں ہے اس لیے مجھے اختلاف ہے ۔ لیکن مجھے ان سے ایک اور
بات پر بھی اختلاف ہے ۔ فیض صاحب کی محبت میں ایک آدھ جگہ انھوں نے ایسی
متضاد باتیں بیان کی ہیں جن کو ذہن قبول نہیں کرتا مثلاً ایک جگہ انھوں نے
لکھا ہے کہ فیض کو :

"بی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو سے ملازمت
کی پیش کش ملی ۔ انگریزوں کی نوکری ناپسند تھی ۔ قبول نہیں کی ۔"

(ص ۹۳)

لیکن صرف چار سطروں کے بعد یہ جملے ملتے ہیں :

"دلّی میں فوجی ملازمت کے سلسلے میں مقیم تھے تو ٹریڈ
یونین کا کوئی کام نہیں کیا ۔ جنگ کے بے پناہ کام کے علاوہ
دورے کرنے پڑتے تھے اور اس وقت وہ جنگی کام ٹریڈ یونین
کی اعانت سے زیادہ اہم تھے ۔" (ص ۹۳)

اگر بی بی سی لندن اور آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت انگریز کی ملازمت تھی تو فوجی
ملازمت بھی تو کسی قومی حکومت کی ملازمت نہیں تھی ؟

بہر حال اب اختلاف بہت ہو چکا ۔ یہ تو چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں ۔ قینچی چلتے ہوئے بعض

اوقات کپڑا غلط بھی کٹ جاتا ہے لیکن بحیثیتِ مجموعی "عمر گذشتہ کی کتاب" ایک اچھی، دلچسپ اور قابلِ ذکر کتاب ہے جس سے فیض اور مخدوم کے بارے میں ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں مثلاً اس کتاب کو پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ فیض احمد فیض کا نام فیض احمد خان ہے۔ ان کے نانا کا نام عدالت خان اور دادا کا نام صاحبزادہ خان اور پردادا کا نام سربلند خان تھا۔ والد کا نام میں نے اس لیے نہیں لیا کہ ان کے نام سے میں پہلے سے واقف تھا۔ پھر یہ بھی میرے لیے بالکل نئی بات تھی کہ ڈاکٹر تاثیر کا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا تھا اور ان کی شادی کے عہد نامہ کا مسودہ بھی علامہ ہی نے مرتب کیا تھا اور یہی عہد نامہ فیض اور ایلس کے درمیان طے پایا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے نئی تھی کہ فیض کا نکاح شیخ محمد عبداللہ نے پڑھایا تھا۔ پانچ ہزار مہر تھا اور شادی کے اخراجات کے لیے میاں افتخار الدین نے تین سو روپے دیئے تھے اور براتیوں میں جوش ملیح آبادی اور مجاز مرحوم شامل تھے۔ یہ باتیں پڑھ کر میں علامہ اقبال اور شیخ عبداللہ کی صلاحیتِ نکاح خوانی کا بھی قائل ہو گیا اور میرے ذہن میں برجستہ یہ جملہ آیا کہ قاضی ہوں تو ایسے ہوئے ورنہ نہ ہوں۔ غالباً فیض اور ڈاکٹر تاثیر کی کامیاب ازدواجی زندگی میں علامہ کی روحانیت اور شیخ عبداللہ کی بصیرت کو بڑا دخل ہے۔

پاکستان کی شخصیات

ایک زمانہ تھا جب ادب اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ادب سیاستداں[1] کی ذہنی تربیت کا ایک حصّہ تھا جس میں علوم مروجہ کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر قدرت، شامل تھی۔ وہ لکھ بھی سکتا تھا اور تقریر بھی کر سکتا تھا۔ اُسے اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کی زحمت نہیں ہوتی تھی اسی لیے الفاظ غلط فہمی پیدا نہیں کرتے تھے اور سیاست داں کے منھ سے ایسے جملے نہیں نکلتے تھے جن سے سُننے والے منغض ہوں اور موصوف اپنی صفائی پیش کرتے پھریں۔ جس نے سیاست میں قدم رکھا، علم و ادب کے راستے سے رکھا۔ دور کیوں جائیے۔ سر سیّد کو لیجیے۔ مولانا محمد علی، شوکت علی، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی، بہادر یار جنگ کو لیجیے، یہ سب علم و ادب کے راستے سے میدانِ سیاست میں داخل ہوئے اور اپنی اسی صلاحیت و تربیت سے ایسے گہرے اثرات مرتب کیے کہ ان کے نام ہماری جدید تاریخ کا حصّہ ہیں۔ نور الصباح بیگم، جنھوں نے پچاس ساٹھ سال پہلے کے رواجِ زمانہ کے مطابق کسی اسکول، کالج یا یونی ورسٹی میں تعلیم نہیں پائی بلکہ گھر پر ہی اردو فارسی پڑھی اور مطالعے سے اپنی صلاحیتوں کے جوہر نکھارے،

---

[1] وفات: کراچی ۱۵ر جولائی ۱۹۷۸ء

اسی روایت سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ قلم اور زبان دونوں سے اپنے خیالات کا اظہار سگھڑپن اور سلیقے سے کر سکتی ہیں اور ہماری نئی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتی ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مشرقی عورت کی وہ ساری اخلاقی خصوصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے مشرقی عورت ایک اچھی ماں، ایک اچھی بیوی، ایک اچھی انسان اور ایک اچھی راہبر بنتی تھی۔ وہ گھر میں رہی تو اس نے گھر کو جنت بنا دیا۔ بچوں کی ایسی تربیت کی کہ وہ زندگی میں ممتاز ہوئے۔ شوہر کے ساتھ ایسا اچھا سلوک کیا کہ اُس کے چھپے ہوئے جوہر ظاہر ہو گئے۔ گھر میں رہتے ہوئے بھی مشرقی عورت کا ایک مقصدِ حیات ہوتا تھا۔ زندگی کا ایک مشن ہوتا تھا۔ اس کے لیے دولت، عیش و آرام، بنگلہ کوٹھی کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ اگر یہ چیزیں میسر ہیں تو ٹھیک ہے۔ نہیں ہیں تو ان کے حصول کے لیے شرافت و اخلاق کی دیواریں پھلانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ نور الصباح بیگم نے برقع پہن کر، پردے میں رہتے ہوئے، ساری عمر تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ اس کے لیے جس حوصلے، جس کردار اور جس جوشِ مقصد کی ضرورت تھی وہ اُن میں موجود تھا۔ اس عرصے میں وہ کم و بیش ان تمام راہنماؤں سے ملیں جن کا نام ہمارے لیے عزت و محبت کی علامت ہے۔ اس اعتبار سے بھی نور الصباح بیگم اب ان چند خواتین میں سے ایک ہیں جنھیں قائدِ اعظم محمد علی جناح، شہیدِ ملت لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر، نواب محمد اسمٰعیل خان وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔

"پاکستان کی مشہور شخصیتیں میری نظر میں" جس کی تقریبِ رونمائی میں شرکت کے لیے آپ برسات کے موسم میں یہاں تشریف لائے ہیں، نور الصباح بیگم نے ۶۵ مشہور اور معروف سیاسی اور ۲۶ ادبی شخصیتوں کے بارے میں اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ اُن کا نقطۂ نظر، جیسا کہ انھوں نے خود بتایا ہے، یہ ہے کہ "مشہور مرد حضرات کے متعلق ایک خاتون کے خیالات کیا ہیں۔" اس اعتبار سے یہ کتاب ایک انفرادی نظر کی حامل ہے۔ قائدِ اعظم کے بارے میں جو تاثرات نور الصباح بیگم نے پیش کیے ہیں ان میں اتنا خلوص اور عقیدت ہے کہ اس خوب صورت مضمون کو اسکول کی نصابی کتابوں میں شامل کیا جانا

چاہیئے۔

نورالصباح بیگم ۱۹۵۸ء میں مسلم لیگ پر پابندی کے بعد سیاست سے کنارہ کش ہوگئی تھیں اور اب ۱۹۷۷ء میں جیساکہ اخبارات سے پتا چلا کہ وہ بیس سال بعد پھر تحریک استقلال میں شامل ہوگئی ہیں۔ "پاکستان کی مشہور شخصیتیں" ان کی گیارہویں کتاب ہے اور یہ اُس وقت تک گیارہویں کتاب رہے گی جب تک وہ میدانِ سیاست میں سپاہی بنی، دشمنوں کو شکست فاش دینے میں لگی رہیں گی۔ ان کی اس کتاب کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ اتنی دلچسپ کتاب ہے کہ آپ اسے ایک نشست میں پڑھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس کتاب میں نورالصباح بیگم نے، جیساکہ میں نے عرض کیا، مختلف سیاسی و ادبی شخصیتوں کے بارے میں سیدھے سادے رواں اسلوب میں اپنے تاثرات بے باکی و جرأت و خلوص کے ساتھ بیان کیے ہیں۔ یہ تاثرات چونکہ دل سے نکلے ہیں، اسی لیے پڑھنے والے کے دل پر اثر کرتے ہیں۔ یہاں آپ کو کسی قسم کی بناوٹ یا مُبناوٹ نہیں ملے گی۔ سیدھی بات، سیدھے سادے پٹھانی انداز میں لکھ دی گئی ہے۔ ان تاثرات میں اکثر ایسے جملے سامنے آتے ہیں جن سے اس شخصیت کا سارا مزاج اور اس کی روح کی تصویر اُجاگر ہو جاتی ہے۔ یہ وہ شخصیتیں ہیں جن کے آپ نے نام سُنے ہیں، جن کے بارے میں آپ پہلے سے کچھ نہ کچھ جانتے ہیں لیکن اس طور پر یقیناً نہیں جس طور پر نورالصباح بیگم نے دیکھا اور آپ کو دکھایا ہے۔ نورالصباح بیگم نے چودھری خلیق الزماں مرحوم سے پوچھا کہ آپ بھارت سے یہاں کیوں آگئے۔ جواب دیا "ہم گاندھی جی سے بڑے وعدے کر کے آئے تھے کہ جناح سے تمام باتیں منوالیں گے مگر یہاں انھوں نے ہماری ایک بات بھی نہ مانی تو ہم واپس جاکر اُن کو کیا مُنھ دکھاتے۔" اس کے بعد مصنفہ نے لکھا ہے کہ 'یہ نہیں معلوم کہ وہ کون سی باتیں تھیں؟'

ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "میں نے فوراً محمد علی بوگرہ کو فون کیا۔ وہ بولے وقت بہت کم ہے۔ فوراً میرے گھر آجائیے۔ میں ساتھ لے چلوں گا۔ وہاں چودھری خلیق الزماں صدارت کی کرسی پر بیٹھے نظر آئے۔ میں نے برابر بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے پوچھا کہ صدارت ثریا مبین خان کو کرنا تھی۔ انھوں نے بتایا کہ رات بھر میں یہ معاملہ طے ہوگیا۔ کنونشن مسلم لیگ کا

سارا کام یامین خان سے کرا کر ایوب خان قول سے پھر گئے اور چودھری خلیق الزماں صاحب کو تیار کر لیا گیا۔ یہاں پھر چودھری صاحب نے یامین خان کو شکست دی۔"

آیئے اب آپ کو اس دلچسپ کتاب کی چند جھلکیاں دکھاؤں۔ علی محمد راشدی کے بارے میں لکھا ہے کہ " دوست کے انتہائی دوست اور اگر ذرا بھی شبہ ہو جائے کہ ان کے کسی دوست نے ذرا بھی اُن کو دھوکا دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ایسی چال چلنا جانتے ہیں کہ وہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائے۔"

میر رسول بخش تالپور کے بارے میں لکھا ہے کہ " پھر کراچی میں اردو سندھی کا جھگڑا چل نکلا تو ہمیں اور بھی تکلیف ہوئی کیونکہ میر صاحب تو اردو والوں کے بھی اتنے ہی دوست تھے جتنے سندھی والوں کے۔ انھوں نے پیپلز پارٹی کا انتخاب ہی حیدر آباد سے مہاجرین کے ووٹوں سے جیتا تھا۔ آخر انھوں نے گورنری سے استعفا دے دیا۔ بیگم اختر سلیمان کی بیٹی کی شادی میں ملے تو ہم نے کہا۔ " میر صاحب سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ آپ کو مبارک باد دیں یا اظہار افسوس کریں۔ کہنے لگے " بیگم صاحب مبارک باد دیجیے کہ عزت و آبرو سے نکل آیا۔"

غلام محمد کے بارے میں لکھا ہے کہ " جیسے ہی قلی نے میرا بستر کھولا وہ ہماری یوپی وضع کی ایک پاؤر روئی کی نازک سی ریشمی فرد (رضائی) کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اپنے ہاتھ میں لے کر نرم ریشم کو بار بار اپنے گالوں سے لگا کر دیکھا اور بولے کمال ہے، کتنی نرم رضائی ہے، کتنی ہلکی اور کتنی حسین، پھر میری طرف دیکھ کر بولے " آپ کو تو بڑے مزے کی نیند آتی ہو گی ایسی رضائی اوڑھ کر۔" ہمیں ہنسی آ گئی۔

ایوب خان کے بارے میں یہ واقعہ سُنئے۔ " میں نے کہا آئین تو مل گیا مگر کیا آپ نے انتخابات کے لیے کوئی خاص قوانین بنائے ہیں جن کی وجہ سے ووٹ فروخت نہ ہوں۔ ایوب خان بولے ۔" اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا " اشد ضرورت ہے کیونکہ ان لوگوں نے جن کا دولت پر قبضہ ہے انتخاب کی تیاری میں ہزاروں روپے خرچ کرنے کا اعلان کر دیا ہے مگر وہ سب جاہل ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقے کے پاس

پیسے نہیں ہیں۔ اگر ووٹ بکے تو وہ ہی کامیاب ہوں گے اور پھر اس آئین کا خدا ہی حافظ ہے۔ ایوب خان نے کہا "بیگم صاحبہ ان بیچاروں کو اس بہانے پیسہ مل جائے تو کیا حرج ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ پیسہ کسی سے لیں اور ووٹ کسی کو دیں"۔

بھٹو صاحب کے بارے میں بھی چند جملے سنتے چلئے۔" وہ صدر ایوب کے دست راست بنے ہوئے تھے اور اب وہ صدر ایوب کی مسلم لیگ کے سیکریٹری جنرل بھی تھے۔ جس قدر صدر ایوب نامقبول ہوتے جارہے تھے اسی قدر بھٹو صاحب ان کے خاص آدمی بنتے جارہے تھے۔ صدر ایوب کے مقابلے پر محترمہ فاطمہ جناح کھڑی ہوئیں تو ذوالفقار علی بھٹو نے اب بھی صدر ایوب کا ساتھ دیا اور انتخابات میں کامیاب کرایا۔ یہ باتیں مجھے دکھ دیتیں کیونکہ اس انتخاب کی دھاندلیاں سب پر عیاں تھیں۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ بھارت سے چھڑ گئی۔ کئی لوگوں نے وزیر خارجہ کی حیثیت سے بھٹو پر الزام لگایا کہ وہ ہی اس جنگ کا باعث ہیں۔ جنگ بندی کے بعد معاہدۂ تاشقند ہوا اور روس سے واپسی کے کچھ عرصے بعد بھٹو ایوب حکومت سے علیحدہ ہو گئے اور اپنی سیاسی پارٹی بنالی۔ عوامی لیگ کے لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن اگرتلہ سازش کیس میں ملوث ہو کر جیل جا چکے تھے۔ ادھر ایوب خان کی حکومت زبان بندی کرتی رہی۔ ادھر یہ جماعتیں فروغ حاصل کرتی رہیں۔ جب ہنگامہ ہوا تو ایوب خان نے گھبرا کر کانفرنس بلائی۔ سب لیڈروں کے مطالبے پر بھٹو اور مجیب کو جیل سے رہا کر کے کانفرنس میں آنے کی دعوت دی۔ اس دور میں ائر مارشل اصغر خان کی تقاریر نے تہلکہ مچا دیا۔ مجیب و بھٹو، اصغر خان کی تقریر و تحریک سے رہا ہو کر کانفرنس میں مدعو کیے گئے تھے۔ اس کانفرنس میں مجیب شریک ہوئے مگر بھٹو نے شرکت سے انکار کر دیا۔" اسی مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ وہ " اپنے مصاحبین کی رائے پر نہیں چلتے بلکہ ان کے اردگرد کے لوگوں کو ان ہی کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ بعض اوقات میں یہ بھی سوچتی ہوں کہ آخر کسی پر تو بھٹو صاحب کو اعتبار ہوگا مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ان کو صرف خود پر اعتبار ہے۔" ایک اور جگہ لکھا ہے کہ بھٹو صاحب ممتاز علی بھٹو سے (میرے بیٹے) ثمین خان کی قابلیت کی باتیں کرتے رہے کہ

وہ بہت ہی قابل قانون دان ہے۔ تعجب ہے تم اب تک اس سے نہیں ملے۔
چار ماہ بعد ممتاز علی بھٹو کی حکومت نے ثمین خان کو ڈی پی آر کا الزام لگا کر گرفتار
کر لیا۔"

اب چند اہلِ قلم کا بھی حال سُنتے چلیے۔" اس سال مشاعرے کی صدارت کی
درخواست میں نے مولانا قدوسی صاحب سے کی۔ کئی لوگوں کو محض اس وجہ سے
اختلاف تھا کہ وہ لالوکھیت میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا دراصل پڑھے لکھے لوگوں
کا مسکن ہی لالوکھیت ہے کیونکہ ان کے پاس دولتِ علم ہے، زر نہیں ہے"۔
بیگم جوش ملیح آبادی کے بارے میں لکھا " دو ایک بار پھر میں ان کے گھر بھی گئی
محض ان کی بیگم کو دیکھنے کہ اتنے عظیم شاعر کی بیگم کیسی ہیں؟ بیگم بے چاری سیدھی سادی
اور بے حد صاف گو لکھنوی طرز کی نکلیں۔ کہنے لگیں میں تو ان کی شاعری سُنتے سُنتے
تنگ آگئی ہوں۔ میں نے کہا" کبھی آپ کو بھی اچھی لگی ان کی شاعری"۔ بولیں" شروع
شروع اچھی لگتی تھی' اب تو کان پک گئے سُنتے سُنتے اور یہ کہتے کہتے ہمیں ان کی (جوش
صاحب کی) دو نظمیں بتائیں کہ کسی دن آپ اُن سے یہ سُننا۔ بہت ہی مزے کی ہیں"۔
حفیظ جالندھری کے بارے میں لکھا ہے کہ" دوسرے سال مشاعرے کا
دعوت نامہ گیا تو میں نے فون کیا۔ بولے میری تو فیس مقرر ہے اور فیس بھی بتا دی۔
میں نے کہا میری طاقت ہی کہاں ہے۔ میرے گھر تو شوقیہ مشاعرہ ہوتا ہے ٹکٹ
تھوڑی لگتا ہے"۔

جمیل الدین عالیؔ کے بارے میں لکھا کہ" بولے بارہ آدمیوں کا وفد چین جائے گا۔
میں آپ کو بھیجوں گا۔ مگر بعد کو وفد چلا گیا ہمارا نام ہی نہ آیا"۔ دوسرے دن انتخاب
کے بعد گنتی ہوئی تو پتا چلا میرے بیس ووٹ شوکت صدیقی کے پچیس ووٹ۔ تو یہ
ہوا کہ بعد کو ہمیں سوچنا پڑا"۔

جی ایم سید صاحب کے سلسلے میں یہ چند جملے سُنیے۔" سید صاحب کے گھر
پہنچ کر میری ملاقات شیخ مجیب سے ہوئی' جن کو ڈھاکہ سے بلا کر سید صاحب نے

بہت بڑا عصرانہ دیا تھا۔ خیر ہماری کوشش سے وَن یونٹ ٹوٹ گیا۔ میں تو ابتدا، ہی سے وَن یونٹ کے خلاف تھی کیونکہ میں نے جب سے سندھ کی سیاست میں حصّہ لیا خود کو سندھی سمجھنا شروع کر دیا اور وَن یونٹ کو سندھ کے لیے مُضر سمجھ کر سخت مخالف بن گئی۔ اب مرحلہ یہ درپیش تھا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کریں کہ الگ رکھیں۔ کراچی کے لیڈران سے گفت و شنید کرنے کے لیے "محاذ" نے ایک کمیٹی مرتب کی جس میں کھوڑو صاحب، آغا غلام نبی، حاجی صادق علی، قاضی اکبر، میں اور دو اور مہاجر لیڈر تھے۔ تین چار میٹنگز ہوئیں اور ہم لوگوں نے کراچی کے لیڈروں کو اس بات پر متفق کر لیا کہ کراچی کو سندھ میں شامل کیا جائے۔ میرا خیال تھا کہ کراچی کو سندھ سے ملانے سے مہاجر بھی ایک طاقت رہیں گے۔ میرے ساتھی سندھی لیڈر کھوڑو اور قاضی اکبر کے علاوہ باقی، کراچی کو سندھ میں ملانے کے حق میں خود بھی نہیں تھے۔ جب یہ تمام کام سیّد صاحب کی مرضی کے مطابق ہو گیا تو وہ متعصب سندھی بن گئے اور اب "محاذ" نے جئے سندھ کا نعرہ لگایا۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گئی اور خود ہی میں نے محاذ سے استعفاد دے دیا۔"

ابن انشا کے بارے میں لکھا کہ " انشا صاحب عالی کا ذکر اپنے کالم میں کرتے ہیں اور عالی انشا کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں یقین ہوا کہ ہم ہی نہیں سب ہی نے یہ بات محسوس کی ہے اور میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ ابن انشا اس بات کو چھوڑ دیں تو ان کا کالم خالص مزاحیہ ہو جائے۔"

نورالصباح بیگم صاحبہ نے ابن انشا کا جو چہرہ لکھا ہے اس میں ان کا رنگ گورا بتایا ہے۔ میں نے ابن انشا کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھا ہے۔ اگر ابن انشا کا رنگ گورا ہے تو پھر ظلمت و نور کے لیے نئے الفاظ تلاش کرنے پڑیں گے۔ ابن انشا چونکہ میرے بھی دوست ہیں اور اس وقت پردیس میں ہیں اس لیے غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے کتابت کی اس فاحش غلطی کی تصحیح نہایت ضروری ہے۔

یہ میں نے اس کتاب کی چند جھلکیاں آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جسے سب کو پڑھنا چاہیے۔ یہ ایک ایسی خاتون کے تاثرات ہیں جس نے خلوص کے ساتھ سیاست میں حصّہ لے کر اپنی عمرِ عزیز کا بڑا حصہ اس میں لگایا ہے۔

(۱۹۷۷ء)

یادوں کا جشن

کچھ لوگ بڑے ہوتے ہیں لیکن شاعر بُرے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ شاعر بڑے ہوتے ہیں لیکن انسان بُرے ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں اور جو شاذ ہوتے ہیں کہ شاعر بھی اچھے ہوتے ہیں اور انسان بھی اچھے ہوتے ہیں۔ ایسے شاعر انسان جنھیں دیکھ کر محبت کی مہک آنے لگتی ہے اور خلوص کی کلی نسیم سحر سے کھل اٹھتی ہے اور ساری فضا موتیا، چنبیلی اور رات کی رانی کی خوشبو سے مہکنے لگتی ہے۔ برصغیر کے حوالے سے اگر ایسے لوگوں کی فہرست بنائی جائے تو میرا خیال ہے کہ فہرست بنانے والے کو خاصی دشواری پیش آئے گی، لیکن مجھے یقین ہے کہ اس فہرست میں بلکہ سر فہرست جناب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کا نام ضرور شامل ہوگا! ورنہ صرف شامل ہوگا بلکہ ہر کس و ناکس اس نام پر صدقِ دل سے اتفاق بھی کرے گا۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شخصیت میں یقیناً ایک ایسا سحر ہے کہ جو ان سے ملتا ہے وہ ان کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور ساری عمر کے لیے ان کو گلے لگا کر ان کے گلے لگ جاتا ہے۔ بیدی صاحب نے اُن کو بھی ساری عمر نبھایا ہے جو ایک بار گلے لگ کر ان کے گلے پڑ گئے اور ان کو بھی جو نہ کبھی گلے لگے اور نہ گلے پڑے بلکہ صرف انسانی محبت کے رشتے سے انھوں نے اُن کی دل سے مدد کی۔ بیدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو محبت ہے اور

یہی ان کا پیغام ہے۔ محبّت اُن کی زندگی کی سب سے بڑی طاقت ہے اور اسی لیے، خواجہ میر درد کی زبان میں، محبّت گلشنِ دل را بہار است، ان کی زندگی کا راہنما اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی صاحب مجھے عزیز ہیں۔ ایسے عزیز کہ جن کی شخصیت کا جادو پہلی ہی ملاقات میں دل کو موہ لیتا ہے۔ "یادوں کا جشن" پڑھ کر اُن کی شخصیت کے وہ چھپے ہوئے گوشے بھی سامنے آگئے جن سے میں اب تک ناواقف تھا اور میری محبّت کے جذبے میں مزید گہرائی پیدا ہوگئی۔ خدا سحر صاحب کو خوش رکھے اور صحت کے ساتھ بہت لمبی عمر دے تاکہ یہ اپنے جدِ اعلیٰ باباگرونانک کے پیغامِ محبت کو برسوں اسی طرح پھیلاتے اور آگے بڑھاتے رہیں۔

"یادوں کا جشن" ایک اچھے ناول کی طرح ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے کہ جسے آپ شروع کرتے ہیں تو ختم کیے بغیر بند نہیں کرتے۔ میں نے سفرِ لاہور کے دوران اس کا مطالعہ شروع کیا اور سفرِ واپسی تک ۴۲۹ صفحات کی یہ کتاب ختم ہوگئی۔ میں تیز ضرور پڑھتا ہوں لیکن اگر کتاب میں کچھ نہ ہو تو اسے پڑھنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کتاب کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ایک سطر دوسری سطر سے مختلف ہے۔ اس میں اختصار بھی ہے اور بیان کی روانی بھی۔ زندگی کی رنگارنگی کی طرح ایک ایسا تنوع ہے کہ اسے آپ ایک دلچسپ داستان کی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے جس نے کھل کر سچ بولا ہے اور جس نے اپنے آپ کو فرشتہ بنانے کے بجائے پوری طرح انسان رہنے کی کوشش کی ہے۔ وہ شکاری بھی ہیں اور شاعر بھی۔ سرکاری افسر بھی اور بڑے زمیندار بھی۔ وہ گھوڑ سوار بھی ہیں اور بازا ور شکروں کے رسیا بھی۔ غریبوں کے ہمدرد بھی ہیں اور امیروں کے دوست بھی۔ دوسروں کے دکھ درد میں شریک بھی ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنے دکھ درد میں شریک بھی کرتے ہیں۔ وضع داری اور شرافت ان کی زندگی ہے اور دلِ دردمند کی دھڑکن روحِ حیات ہے۔ ۱۹۴۷ء میں جب ہندو مسلم فسادات نے سارے برِّعظیم کو پاگل کر دیا تھا ان کا دل تعصب و نفرت کے جہنم سے پاک تھا۔ دہلی میں رہ کر بیدی صاحب نے جو اس شہر کی خدمت کی اور جس طرح مسلمانوں کو اس نفرت کی آگ سے نکالا وہ مجھ تک قصہ کہانی بن کر پہنچا ہے۔ شاہد احمد دہلوی بھی اس کے

گواہ تھے اور خواجہ حسن نظامی بھی۔ ملّا واحدی بھی اور مولانا رازالخیری بھی۔ اب کوئی نہیں ہے لیکن بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی چراغ نور بنی ہوئی ہے۔ اس موضوع پر بھی انھوں نے "یادوں کا جشن" میں لکھا ہے جس سے اس دور کی بربریت کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ میں یہاں ان سب واقعات کا اعادہ تو نہیں کرسکتا لیکن ایک آدھ واقعے کی طرف آپ کی توجہ ضرور دلاؤں گا۔ بیدی صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "ہری پور گلیر کانگڑہ ضلع میں ایک جاگیردار کا ٹھکانہ ہے۔ وہاں کے ہسپتال میں ایک مسلمان کمپونڈر تھا۔ جب فسادات شروع ہوئے تو اس کے سارے کنبے کو پکڑ لیا گیا۔ اس کی لڑکی بہت خوب صورت تھی۔ اس لڑکی پر ان لوگوں کے درمیان تکرار ہوگئی۔ لڑکی نے کہا کہ جس سے آپ کہیں میں شادی کرنے کو تیار ہوں بشرطیکہ آپ میرے والدین اور دوسرے کنبے کو حفاظت سے رفیوجی کیمپ میں پہنچادیں۔ یہ شرط منظور کرلی گئی اور اس کمپونڈر کو اس کے باقی ماندہ کنبے سمیت رفیوجی کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ مگر لڑکی کے بارے میں یہ فیصلہ نہ ہوسکا کہ اس سے کون شادی کرے جب یہ تکرار ایک خطرناک جھگڑے کی صورت اختیار کرگئی تو ایک شخص اٹھا اور تلوار سے لڑکی کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور کہا کہ لو اب سب ایک ایک ٹکڑا بانٹ لو۔"

کنور مہندر سنگھ بیدی ساری عمر اسی بربریت، حیوانیت اور ظلم کے خلاف صف آرا رہے اور یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو انسانیت پر یقین رکھتا ہو اور تعصب سے اس کا دل پاک ہو۔ اس کتاب میں بے شمار ایسے واقعات ہیں جن سے انسان اپنی زندگی پر نظر ثانی کرسکتا ہے اور بہتر زندگی گذارنے کا سلیقہ سیکھ سکتا ہے۔ ایک بات جس کا ذکر میں ضرور کرنا چاہوں گا وہ جوش ملیح آبادی مرحوم کے سلسلے میں ہے۔ جوش نہ صرف ایک عظیم شاعر تھے بلکہ ایک اچھے انسان بھی تھے۔ جوش کو یہاں جو کچھ بھی نقصان پہنچا وہ ان کے ان دوستوں سے پہنچا جن کے بارے میں غالب نے کہا تھا "ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو"۔ جوش جب آخری بار ہندوستان گئے تو ان کے خلاف یہاں طرح طرح کی خبریں اخباروں میں چھپیں۔ بیدی صاحب ان سب باتوں کے عینی شاہد ہیں۔ انھوں نے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ "آخری بار جب جوش

ہندوستان آئے تو ان کے ایک شاعر دوست بھی ہمراہ تھے۔ وہ سائے کی طرح جوشؔ صاحب کے ساتھ رہتے اور جہاں بھی مشاعروں میں جوشؔ صاحب جاتے وہاں انھیں بھی مدعو کیا جاتا۔ دہلی میں بھی وہ آگرہ ہوٹل میں جوشؔ صاحب کے ساتھ مقیم رہے۔ میری جانب سے ہر روز جوشؔ صاحب کے لیے ایک بوتل شراب اور موتی محل سے کھانا پہنچ جاتا تھا۔ لیکن جب جوشؔ صاحب ملیح آباد وغیرہ اپنے احباب سے ملنے گئے تو ان کے شاعر دوست دہلی میں ہی رہے اور ہر روز شراب کی دوکان سے جوشؔ صاحب کے نام پر ایک بوتل شراب لاکر بازار میں فروخت کرتے رہے۔ جب دوکان دار نے بل پیش کیا تو اس بات کا پتہ چلا مگر میں نے دیدہ و دانستہ جوشؔ صاحب سے اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ دوستوں میں کدورت نہ پیدا ہو جائے۔ اسی دوست نے موقع پاکر بمبئی میں جوشؔ صاحب کی جیب سے چار ہزار روپے نکال لیے۔ اس پر جوشؔ صاحب نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی لیکن جب دہلی واپس آئے تو بسمل سعیدی ٹونکی کی منت سماجت کرنے پر اسے معاف کر دیا۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ اس دوست نے جوشؔ صاحب کے احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ بارڈر عبور کرنے کے فوراً ہی بعد ان سے الگ ہو گیا اور ان کے خلاف حکومت پاکستان سے بے بنیاد اور غلط شکایتیں کیں جن کی بنا پر جوشؔ صاحب کو ملازمت سے الگ کر دیا گیا۔

"جہاں تک مجھے علم ہے جوشؔ صاحب کے خلاف جو شکایتیں کی گئی تھیں ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ انھوں نے بمبئی میں ایک اخباری انٹرویو میں پاکستان کے خلاف زہر اگلا۔ اتفاق سے میں بھی اس وقت موجود تھا اور یہ انٹرویو ظ۔ انصاری نے سید دبھائی کے گھر لیا تھا۔ اس سارے انٹرویو کے دوران میں جوشؔ صاحب نے ہندوستان سے محبت کا ضرور اظہار کیا لیکن پاکستان اور پاکستان کی حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔" (ص ۲۳۶) اس سے ساری صورت حال صاف ہو کر سامنے آجاتی ہے۔

ایک اور واقعہ انھوں نے لکھا ہے کہ "جب وہ سنگرور کے ڈپٹی کمشنر تھے تو جنرل تھمایا کمانڈران چیف وہاں تشریف لائے۔ ضلع والوں نے ان کا شاہانہ استقبال کیا۔ رات کو میرے ہاں کھانا تھا جس میں شمالی ہندوستان کے تمام بڑے فوجی اور سول

افسران موجود تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں ہوتے ہوتے سیاست پر تبصرہ شروع ہو گیا۔ جنرل تھمایا موڈ میں تھے فرمانے لگے کہ ان سیاست دانوں نے اتنے عظیم ملک کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ جی چاہتا کہ یہاں فوجی حکومت قائم کر کے مارشل لاء لگا دیا جائے تاکہ ملک کو سیاستدانوں کی پیدا کی ہوئی گندگی سے پاک کیا جا سکے اور اگر میں ایسا کرنا چاہوں تو دو گھنٹے میں کر سکتا ہوں لیکن میں نے آئین کی وفاداری کا حلف لیا ہوا ہے۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔

سب ان کی اس صاف گوئی پر حیران ہوئے۔"

اسی طرح بسمل شاہجہان پوری کے بارے میں بھی بعض دلچسپ واقعات کہے ہیں جو آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ بیدی صاحب نے لکھا ہے کہ "ساحر ہوشیار پوری، مجھے اور بسمل صاحب کو علی گڑھ مشاعرہ میں شریک ہونا تھا۔ میں ان دنوں سٹی مجسٹریٹ تھا اور بسمل میرے باڈی گارڈ یعنی گن مین لگے ہوئے تھے لیکن اس مشاعرے میں وہ ایک شاعر کی حیثیت سے شریک ہونے جا رہے تھے۔ یہ طے ہوا کہ سب لوگ میری کوٹھی واقع تیس ہزار پر چار بجے شام پہنچ جائیں۔ وہاں سے بھگوان سنگھ ٹیکسی ڈرائیور کی اسٹیشن ویگن میں ہم سب علی گڑھ کے لیے روانہ ہوں گے۔ بسمل کے علاوہ سب وقت مقررہ پر میرے ہاں پہنچ گئے۔ چونکہ ہم لیٹ ہوتے جا رہے تھے اس لیے بسمل صاحب کے گھر پہنچے جو بارہ ہندو راؤ میں تھا۔ جب ہم ان کی گلی کے سامنے پہنچے تو وہ اپنے مکان کے سامنے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے فوراً آنے کے لیے کہا تو ہاتھ سے اشارہ کر کے گھر میں داخل ہو گئے اور دس بارہ منٹ کے بعد برآمد ہوئے۔ ہم سب نے لعن طعن کی اور کہا کہ ہم تو پہلے ہی لیٹ ہو چکے تھے آپ نے اور لیٹ کر دیا تو نہایت سنجیدگی سے فرمانے لگے کہ دراصل معاملہ یہ تھا کہ ہر مسلمان شوہر کا فرض ہے کہ اگر شہر سے کہیں باہر سفر پر جائے تو جانے سے پہلے اپنی بیوی کا "حقِ زوجیت" ادا کر کے جائے۔ ہمیں ہنسی تو بہت آئی مگر ضبط کر کے کہا کہ اگر ایسا ہی تھا تو آپ یہ حق زوجیت پہلے ہی ادا کر دیتے۔ خواہ مخواہ ہمیں لیٹ کر دیا۔ تو فرمانے لگے کہ میری بیوی دوسرے محلے میں گئی ہوئی تھیں۔ میں نے انھیں وہاں سے خاص طور پر

اسی لیے بلوایا کہ وہ حق زوجیت وصول کرلیں لیکن انھوں نے آنے میں دیر کر دی۔ حق زوجیت ادا کرنے میں تو صرف آدھا منٹ لگا باقی وقت غسل کرنے میں لگ گیا۔ تمام راستہ بسمل صاحب سے حق زوجیت کے مسئلے پر مذاق ہوتا رہا۔ وہ مختلف دلائل سے اپنے اس عمل کو جائز بتاتے رہے۔ علی گڑھ تک کا سفر بڑی آسانی سے کٹ گیا۔"

غرض کہ یہ ایک ایسی دلچسپ کتاب ہے جس سے نہ صرف ہمارے ماضی قریب کے حالات پر گہری روشنی پڑتی ہے بلکہ بعض اہم شخصیات سے بھی ہم اس طرح متعارف ہوتے ہیں جس طرح ہم اس سے پہلے نہیں تھے۔

(۲۰ رمئی ۱۹۸۵ء)

طنز و مزاح کی شاعری

آج ہم حضرت شہباز امروہوی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ایک خراج عقیدت ہم نے ۱۵ رمئی ۱۹۸۳ء کو اس وقت پیش کیا تھا جب ان کی کتاب "ط ظ" کی تقریب اجرا کراچی میں ہوئی تھی اور ایک خراج عقیدت ہم آج پیش کر رہے ہیں۔ جب حضرت شہباز اس دنیائے فانی سے لافانی دنیا کے طول طویل سفر پر چلے گئے ہیں۔ اُس سفر پر جو ابد تک جاری رہے گا ــــ آدمی چلا جاتا ہے لیکن اپنے پیچھے اپنے اخلاق، اپنی شرافت اور اپنی تخلیقات کا وہ اعمال نامہ چھوڑ جاتا ہے جس سے ہم اسے تا حیات یاد کرتے رہتے ہیں۔ فروری ۱۹۸۴ء میں جب میرے بزرگ دوست حضرت افسر صدیقی امروہوی اچانک وفات پا گئے تھے اور ان کی میت میرے گھر سے اُٹھی تھی تو میں نے ان کی وفات کی، جن لوگوں کو خط کے ذریعے اطلاع دی تھی ان میں شہباز امروہوی مرحوم و مغفور بھی شامل تھے۔ مجھے یاد ہے کہ فوراً امروہے سے ان کا خط آیا تھا اور خط میں نہ صرف تین قطعات تاریخ وفات درج تھے بلکہ افسر صاحب کی وفات پر انتہائی پُر اثر الفاظ میں اظہار غم بھی کیا تھا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ کتاب کی تقریب اجرا کے بعد جب وہ کراچی سے جانے والے تھے تو اصرار کر کے میرے گھر آئے تھے۔ محبی شعیب احمد عباسی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بہت دیر بیٹھے رہے اور دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ چلے گئے اور امید تھی کہ سال دو سال میں پھر آئیں گے مگر جون ۱۹۸۵ء میں اب ان کے سفر کا رُخ دوسری

سمت مڑ گیا ہے۔ اب ہم منتظر ہی رہیں گے۔ میں بھی اور شعیب احمد عباسی بھی۔ ان کے احباب بھی اور سارے اعزہ بھی۔ خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ بحیثیت انسان وہ شریف النفس، وضع دار اور خوش خلق تھے اور بحیثیت شاعر پر اثر، دل چسپ اور منفرد تھے۔ حضرت شہباز کے ساتھ شاعری کا پورا ایک دبستان اُٹھ گیا، جس کے وہ ہمارے دور میں ممتاز نمائندے تھے۔ مردم خیز امروہہ کا سہاگ بھی ان کی وفات سے اُجڑ گیا ہے۔ اس وقت وہ ان لوگوں میں شامل تھے جو خود امروہہ کی پہچان بن گئے تھے۔ اس موقع پر مجھے ان کا قطعہ یاد آرہا ہے:

بالیقیں تاریخ دہراتی ہے خود کو بار بار
شک نہیں اس بات میں، واقف ہیں اس سے خاص و عام
کل الٰہ آباد میں امرود و اکبر کا تھا شور
آج امروہا میں ہیں مشہور شہباز اور آم

ذرا غور کیجیے کتنے لوگ ہیں جو حضرت شہباز امروہوی کی طرح اپنے وطن کی پہچان بنتے ہیں۔

شہباز صاحب پیدائشی شاعر اور صاحب علم و فضل تھے۔ ساری عمر درس و تدریس کے شاہی پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۴۵ء میں بصارت سے محروم ہوئے تو اپنی شاعری کا رنگ بدل کر مزاحیہ رنگ اختیار کر لیا۔ اس تبدیلی میں ایک جہانِ معنی پوشیدہ تھا۔ بینا نابینا ہو جائے تو شدید احساسِ محرومی کا شکار ہو جاتا ہے، کمزور اعصاب کا انسان ہوا تو معاشرہ سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ حاسد اور مردم بیزار ہو جاتا ہے۔ باشعور ہوا تو زندہ رہنے کا نیا سلیقہ پیدا کرتا ہے تاکہ بینائی کے بغیر بھی ہر دل عزیز بن کر سارے معاشرے کی آنکھ کا تارا بن جائے۔ اردو کے نامور شاعر شیخ قلندر بخش جرأت جب تک سوانکھے تھے میر، درد اور سودا کے رنگِ سخن کے پیرو تھے۔ اندھے ہوئے تو معاملہ بندی کی شاعری کی طرف آگئے اور اس میں اپنے دور کی لکھنوی تہذیب کے مخصوص رنگ میں ایسی شوخی اور چنچلا پن سمویا کہ سارے معاشرے نے انھیں سر پر بٹھا لیا اور وہ سب کی آنکھ کا تارا بن گئے۔ شہباز صاحب نے بھی یہی مثبت رویہ اختیار کیا اور اپنی ظریفانہ شاعری سے نہ صرف اپنے شہر کے خاص و عام میں

مقبول ہوگئے بلکہ سارے برصغیر پاک و ہند کے مشاعروں کی رونق بن گئے۔ ملنے والا اُن سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ شعر سُنتا تو دل کی کلی کھل اٹھتی اور وہ محظوظ ہوتا۔

شہباز صاحب کی شاعری میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی ہے لیکن بنیادی طور پر وہ مزاح نگار تھے۔ ان کے مزاح میں طنز اس طرح شامل ہے جیسے پھول میں خوشبو۔ طنز میں اگر شدت آجائے تو دل آزاری کا سبب ہوتا ہے۔ مزاح میں اگر طنز شامل ہو تو وہ شہد بن جاتا ہے۔ ان کے کلام میں ایسی تازگی و شگفتگی ہے جیسے نورِ ظہور کے وقت کھلے ہوئے گلاب میں ہوتی ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ محدود نہیں ہے۔ انھوں نے کم و بیش ان تمام معاشرتی مذہبی، تہذیبی، معاشی و سیاسی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے جن سے برِعظیم کا معاشرہ دو چار ہے۔ حضرت شہباز نے زندگی کو ایک مخصوص زاویئے سے دیکھا اور اپنی ظریفانہ شاعری میں اسے شگفتگی و مہارت کے ساتھ پیش کر دیا۔ انھیں زبان و بیان پر اُستادانہ قدرت حاصل تھی۔ فن شاعری پر اُن کی گہری نظر تھی۔ صنائع و بدائع کو ایسی خوب صورتی سے برتتے تھے کہ ان کی شاعری پُر اثر ہو جاتی تھی۔

آج حضرت شہباز ہم میں نہیں ہیں لیکن ان کا کلام ہمیں آج کی طرح آنے والے دور میں بھی محظوظ و مسرور کرتا رہے گا۔ یہی انسان کا وہ تخلیقی عمل ہے جو فانی کو لافانی بنا دیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ حضرت شہباز آج بھی زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

(۱۹۸۵ء)

ماحول اور شاعری: نظر حیدرآبادی

زندگی کے سفر میں جب پیچھے مُڑکر دیکھتا ہوں تو بے شمار مناظر اور بے حساب چہرے، کچھ صاف، کچھ دھندلے سے نظر آتے ہیں۔ بہت سے چہرے تو اتنی دور ہیں کہ اب صاف نظر بھی نہیں آتے اور بہت سے مناظر ایسے ہیں جو یادوں کی کہر آلود فضا میں ایسے چھپ گئے ہیں جیسے بادلوں میں چاند چھپ جاتا ہے۔ بس مدھم مدھم سی روشنی چھن چھن کر چاند کے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ زندگی تو مختصر ہے لیکن وقت کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جب ذرا ہوش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وقت گذر گیا اور دم لیکر آگے چلنے کا وقت آپہنچا۔ اسی لیے کم لوگ ہیں جنھیں پیچھے مڑکر دیکھنے کی مہلت سفرِ حیات میں میسر آتی ہے۔ یہ ۱۹۵۰ء ہے۔ کراچی جیل کے قریب جمشید روڈ کے آخری نکڑ پر حیدرآباد کالونی نئی نئی آباد ہوئی ہے۔ اونچے کالر کی شیروانیاں پہنے ہوئے لوگ اس نئی بستی کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ نظام دکن کی مملکت اُجڑی تو یہ پہلی بستی تھی جو سرزمینِ پاکستان پر نمودار ہوئی۔ اسی بستی کی گلیوں میں دکن کی عظیم تہذیب کے سپوت اپنی ممتاز اقدار کو سینے سے لگائے اپنے ماضی کی داستان دہرانے میں مصروف ہیں۔ یہیں نوجوان خواجہ معین الدین نظر آرہے ہیں اور یہیں صمدانی نقوی، حسین احمد اشک، تحسین سروری اور نظر حیدرآبادی نظر آرہے ہیں۔ لگا ہے گا ہے میر لائق علی اور معین نواز جنگ، شاہد حسین رزاقی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیے یہ وحید الدین خان بوزئی ہیں اور یہ جو ذرا زیادہ موٹے تازے

اور سُرخ وسفید سے نوجوان نظر آرہے ہیں اور زور دار قہقہہ لگا رہے ہیں ضیاء الدین خان یوزئی ہیں۔ یہ جو بید ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ سڑک کی طرف جا رہے ہیں احمد حسین خان ہیں اور یہ جو چھڑی کاڈ کر کے کرسی پر بیٹھے ہیں ڈاکٹر یٰسین زبیری ہیں اور اس طرف جو وہ ہیں وہ پولیس والے فاروقی ہیں اور یہ صاحب جو کلّے میں پان دبائے شبر وانی پہنے بید لیے سیر کو جارہے ہیں حیدر آباد دکن کے آئی جی قید خانہ جات ہیں اور یہ جو ایک صاحب پولے پولے قدموں سے، اونچی ترکی ٹوپی پہنے، اِدھر آ رہے ہیں ریاضی کے استاد اللہ بخش کمالی ہیں۔ یہ کالا کوٹ پہنے جو صاحب جا رہے ہیں عبدالرؤف ایڈووکیٹ ہیں اور عبدالرشید ان کے بھائی ساتھ ہیں۔ یہ جو دائیں طرف کی پہلی گلی میں رہتے ہیں یحییٰ صدیقی ہیں اور یہ جوان کے پاس کھڑے ہیں مہدی علی صدیقی ہیں۔ اور یہ۔ یہ کون ہیں؟ شکل تو جانی پہچانی ہے۔ کسی نے بتایا کہ جناب یامین زبیری ہیں اور یہ جو سہارے سے چل کر گھر کی طرف لوٹ رہے ہیں ع چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چوندیس۔ برصغیر کے نامور شاعر حضرت اختر حیدر آبادی ہیں۔ کچے پکے مکانات، ٹین کی چادروں سے ڈھکے ہوئے مگر چہل پہل دلربا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ یہ بستی یہاں برسوں سے موجود تھی۔ نئے نئے کھانے کراچی شہر کی زندگی میں داخل ہو کر مقبول ہو رہے ہیں۔ ناشتے میں لقمی کھائی جا رہی ہے۔ بھگارے بیگن کی خوشبو سے گلی مہک رہی ہے۔ دعوتوں میں ڈبل کا میٹھا اور خوبانی کا میٹھا بھی ہے اور کچی بریانی بھی۔ طرح طرح کے اچار اور چٹنیاں دستر خوان کی زینت ہیں۔ محلوں میں رہنے والے جب گلیوں میں آباد ہوتے ہیں تو ان کے وجود سے گلیاں بھی محل نظر آنے لگتی ہیں۔ مخصوص دکنی لہجے میں سب اُردو بول رہے ہیں۔ اُردو ان سب کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ان سب نے بھی اسلام، اُردو اور پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ گنوا کر بامقصد ہجرت کی ہے اور لطف یہ کہ اس زندگی سے بہت خوش ہیں۔ خوش اس لیے ہیں کہ اب وہ یہاں اپنے خوابوں کی تعبیر پائیں گے اور پاکستان کو جنت نظیر بنائیں گے۔ یہی ان کا مقصدِ حیات ہے۔

معاف کیجیے میں بہت دُور نکل آیا۔ آج تو ہم سب نظر حیدر آبادی کے مجموعۂ کلام "صفِ مژگاں" کی تقریب اجرا میں جمع ہوئے ہیں۔ لیکن آج یہ پھول بھی یادوں کی بگیا ہی میں تو کھلے ہیں اور نظر حیدر آبادی اسی بگیا کا ایک ایسا پھول ہے جس کے کلام کی خوشبو سے آج کی محفل مہک رہی ہے۔ نظر حیدر آبادی کا انتقال ۱۹۶۳ء میں ہوا۔ اس بات کو بھی اب ۲۴ سال ہو گئے ہیں۔ تقریباً ربع صدی۔ لیکن اب بھی ان کا کلام تازگی سے مہک رہا ہے۔ جذبات و احساسات کی سچائی اشعار میں اثر و تاثیر کا رنگ بھر رہی ہے۔

نظر حیدر آبادی کے کلام میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ قطعات بھی ہیں اور رباعیات بھی۔ وہ غزل بھی اچھی کہتے ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ نظم کے شاعر ہیں۔ ایسی نظم جس میں وہ انسان کے مسائل اور عوام کے دکھوں کو بیان کر کے انھیں بیدار کرتے ہیں۔ انھیں نیا شعور دیتے ہیں۔ وہ شعور جس سے سوتا ہوا معاشرہ جاگ اٹھتا ہے اور نئی دنیا آباد ہونے لگتی ہے۔ اسی لیے میں نظر حیدر آبادی کی شاعری کو مسائل و بیداریِ شعور کی شاعری کہتا ہوں۔ نظر حیدر آبادی کے کلام کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ نظر کو اپنے خیالات، جذبات و احساسات کو موزوں لفظوں میں بیان کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ ان کے کلام میں پختگی ہے، قدرتِ اظہار ہے، لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام آج بھی تازہ ہے۔ ان کی شاعری پر اقبال، جوش اور اختر حیدر آبادی کا اثر اس لیے واضح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس دور میں، جب نظر نے شاعری کا آغاز کیا تھا، برصغیر کی ساری ادبی فضا میں موجود تھا اور شاعری کو ذریعۂ پیغام بنانا اس زمانے کا مقبول ترین رجحان تھا۔ نظر کی شاعری بھی اسی رجحان کی حامل ہے۔ اپنی نظم "نئے شاعر سے" میں بھی وہ یہی پیغام دیتے ہیں:

ساز سکوں کو نغمۂ لطفِ خرام دے
خاموشیوں کو جرأتِ ذوقِ کلام دے

اندھوں کو مل ہی جائے گی چشم ہنر شناس
دُنیا کو ہر مقام سے اپنا پیام دے

ایک اور نظم "فن کار" میں بھی نظرؔ یہی کہتے ہیں:

یہاں کے دلوں میں شرارے نہیں ہیں
یہاں کی نگاہوں میں پارے نہیں ہیں
یہاں کی شبوں میں ستارے نہیں ہیں
چراغ امید سحر کو جلانا
یہی میرا نغمہ یہی میرا گانا

جناب مہدی علی صدیقی نے اپنے "پیش لفظ" کے ساتھ نظرؔ حیدرآبادی کے کلام کو "صفِ مژگاں" کے نام سے مرتب کیا ہے اور اسے آپ آسانی سے کلیاتِ نظرؔ حیدرآبادی بھی کہہ سکتے ہیں۔

(۴؍ مارچ ۱۹۸۷ء)

تذکرہ سخنورانِ کاکوری

جب کوئی نئی کتاب وجود میں آتی ہے تو اس سے نکلنے والی شعاعوں سے کائنات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ جس معاشرے میں جتنی زیادہ کتابیں وجود میں آتی ہیں اسی لحاظ سے وہ معاشرہ کائنات کے رنگ کو تبدیل کرتا جاتا ہے۔ صرف اسی پیمانے سے آپ مختلف معاشروں پر نظر ڈالیے تو یہ بات سامنے آئے گی کہ جن معاشروں میں کثرت سے کتابیں لکھی جارہی ہیں ان معاشروں کا رنگ ساری زمین پر غالب آرہا ہے۔ اس کے تہذیب و تمدن سے دنیا منور ہو رہی ہے اور ساری دریافتوں، انکشافات اور ایجادات کے مخارج بھی وہی معاشرے ہیں۔ مسلمانوں نے یادش بخیر جب تہذیب کے نقطۂ عروج کو چھوا تو کتاب ہی اس کے عروج کا سبب تھی۔ آج مغرب کمال پر ہے تو اس کی بنیاد بھی کتاب پر قائم ہے۔ کسی معاشرے میں کتاب کا نہ لکھا جانا اس بات کی علامت ہے کہ اس معاشرے کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں اور اب یہ درخت ہوا کے تیز جھونکے سے زمین پر آرہے گا۔ کتاب سے معاشرے کے ذہن و شعور کے دریچے کھلے رہتے ہیں اور فکر و خیال کی تازہ ہوا پہنچتی رہتی ہے۔ اندھے معاشرے کتاب کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اسی لیے ایسے معاشرے پہلے گونگے اور پھر بہرے ہو جاتے ہیں۔ جب معاشرہ اندھا، گونگا اور بہرا ہو جائے تو پھر اس کا مستقبل بھی باقی نہیں رہتا اسی لیے جب مجھے کسی کتاب کی اشاعت کی خبر ملتی ہے تو مجھ میں زندگی کا احساس گہرا ہو جاتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ لکھی جانے والی کتاب میری پسند کے مطابق ہو یا وہ ایسی کتاب ہو جس کے موضوع سے بھی مجھے کوئی دلچسپی ہو، مقصد تو یہ ہے کہ کتاب کی اشاعت خود اس بات کی علامت ہے کہ وہ معاشرہ جس میں کتاب لکھی جارہی ہے زندہ ہے۔

حکیم نثار احمد علوی نے جب ازراہِ کرم اپنی تصنیف مجھے دی تو اسے دیکھ کر مجھے دو چند مسرت ہوئی۔ ایک تو اس لیے کہ انھوں نے پچیس سال کی محنتِ شاقہ کے بعد ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں ماضی، حال اور مستقبل کے سخن وران کاکوری کے حالات و کلام کو جمع کیا تھا۔ دوسرے اس لیے کہ اس قسم کی کتابوں اور موضوعات سے مجھے بھی دل چسپی ہے۔ میں نے اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھا اور میں بلا تامل یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس کے مطالعے سے میرے علم اور میری معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ حکیم نثار احمد علوی نے مواد کے بکھرے ہوئے موتیوں کو ایسے سلیقے اور خوب صورتی سے پرو دیا ہے کہ ایک دیکھنے دکھانے کے قابل چمن بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا مربوط تذکرہ ہے جس میں تنوع بھی ہے اور علم و بیان کی دل کشی بھی۔ اس کتاب کو کہیں سے پڑھئے دلچسپی، ربط، علم اور حسنِ بیان ہر صفحے پر یکساں طور پر نظر آئے گا اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے جس کی داد دیئے بغیر ہم یونہی سرسری گذر جائیں۔ میں اس بھری محفل میں سخنورانِ کاکوری جیسی اچھی تصنیف لکھنے پر حکیم نثار علوی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس کتاب کا اثر ممکن ہے آپ اس وقت محسوس نہ کریں لیکن یہ وہ کتاب ہے جس سے اہلِ علم و ادب، مورخ، تہذیب و تمدن کے عالم بار بار استفادہ کریں گے۔

بات یہاں تک پہنچی تو ایک بات کا ذکر اور کرتا چلوں اکثر حضرات یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ صاحب کڑا مانک پور، سنبھل، اورنگ آباد، کاکوری، امروہہ، جالندھر، بہار، راجستھان بٹالہ، افغانستان وغیرہ تو سرحد کے اُس پار ہیں آخر اب ان کا تذکرہ لکھنے کی کیا ضرورت اور اُن کی تاریخ مرتب کرنے کا کیا محل ہے۔ یہ بات کہنے والے حضرات تاریخ کے دھارے اور اس کے شعور سے خاصی بے خبری کا ثبوت دیتے ہیں۔ ایک فرد یا پھر بہت سے افراد الگ الگ یا ایک ساتھ جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنی ذاتی داستانیں اور اپنی علاقائی تاریخ بھی ساتھ لے کر ہجرت کرتے ہیں۔ کوئی فرد ہجرت کرتے وقت اپنے ماضی کو اپنے وجودِ ذہنی سے کاٹ کر نہیں پھینک سکتا۔ یہ ماضی اس کی زندگی کے تسلسل کا نام ہے۔ اس کے ذہنی و مادی وجود کی بنیاد ہے یہ اس کے سفرِ حیات کے وہ انمٹ نقوش اور سنگ ہائے میل ہیں جس سے اس کے ذہن کی شکل بنی اور اس کا روپ نکھرا ہے۔ اسی لیے جب میں دیکھتا

ہوں کہ لوگ کرٹیا، مانک پور، سنبھل، کاکوری، بٹالہ وغیرہ کی تاریخ اور تذکرے مرتب کر رہے ہیں تو مجھے اس لیے اطمینان ہوتا ہے کہ میری نسل ابھی ذہنی طور پر زندہ ہے اور وہ اپنے ماضی کو سمجھنے، اس کا جائزہ لینے اور اپنے حال میں سمو کر آئندہ نسلوں تک اپنے ماضی و حال کے شعور کو پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے تاکہ آنے والی نسلیں ماضی کے بغیر ادھوری اکھڑی اور نیم جان نہ رہ جائیں۔ یہ ایک ایسا صحت مند رجحان ہے جس سے ہمارے معاشرے کی نئی اجتماعی نفسیات جنم لے گی۔

سارا برصغیر اجڑا تو پاکستان آباد ہوا۔ آج اس ملک میں سارے برصغیر کے مسلمان موجود ہیں جن کا اپنا ماضی، اپنی تاریخ، اپنے کارنامے، اپنی کمزوریاں اور اپنی توانائیاں ہیں۔ اس ملک کی نئی تہذیبی اکائی یا وحدتِ ملی کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ماضی کی تاریخ کے سارے اوراق مربوط و پیوستہ ہو کر پاکستان کی کتاب وحدت میں یکجا ہو جائیں جس میں سب رنگ اس طور پر گھل مل کر ایک ہو جائیں کہ ان کے ملنے سے از خود ایک منفرد فطری چمک پیدا ہو جائے۔ یہ کام یقیناً ایک دن میں نہیں ہو سکتا لیکن یہ کام ماضی کو کھنگالنے سے جاری رہ سکتا ہے۔ میرے اور آپ سب کے لیے خوشی کی بات یہ ہے کہ یہ کام بہر حال ہو رہا ہے۔ لیکن اس بات کا ایک پہلو اور ہے اور وہ یہ کہ جب آنے والے آتے ہیں تو نئی سرزمین اور نئے وطن کو تجسس و حیرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کی تہذیب، تاریخ اور زبان و معاشرت کے بارے میں علم و آگاہی حاصل کرنا چاہتے ہیں، یہاں آنے والے یہ کام بھی کر رہے ہیں اور ایسی متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور مسلسل لکھی جا رہی ہیں جن کا تعلق پاکستان کے مختلف علاقوں کی تہذیب و تاریخ سے ہے، یہ کتابیں نئے وطن کے ماضی کو سمجھنے کی جستجو کا نتیجہ ہیں۔ قائم رہنے والی تہذیبوں اور زندہ قوموں نے یہ کام ہمیشہ نہایت شوق اور تندہی سے کیا ہے، سخنور ابن کاکوری بھی اسی تہذیبی عمل کی ایک کڑی ہے اور پاکستان میں اس کتاب کے لکھے جانے کی یہی مناسبت ہے۔

کاکوری کے نام سے ہم سب واقف ہیں لیکن ہماری یہ واقفیت اس لیے نہیں ہے

کہ اس میں باغات بہت ہیں یا گندم کی کاشت اچھی ہوتی ہے یا یہاں تربوز بہت بڑے اور بہت میٹھے ہوتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس سرزمین کے رہنے والوں نے اپنے قابلِ فخر کارناموں سے اس کے نام کو وہ شرف بخشا ہے کہ خود کاکوری، جو مضافات لکھنؤ کا صرف ایک قصبہ ہے، آج ان کے نام کی وجہ سے دُنیا زمانے میں پہچانا جاتا ہے۔ میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ شہر آدمیوں سے پہچانے جاتے ہیں اور آدمی شہر سے پہچانے جاتے ہیں۔ اصغر گونڈہ سے پہچانے جاتے ہیں اور گونڈہ اصغر سے پہچانا جاتا ہے۔ آدمی کا قد جتنا اونچا ہوتا ہے اس لحاظ سے بستی کا قد بھی اونچا ہو جاتا ہے۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی بھٹ کی پہچان ہیں اور بھٹ خود شاہ عبداللطیف بھٹائی کی پہچان ہے۔ جب شہر اور آدمی کی شخصیت ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہو جاتی ہے تو پھر آنے والے زمانوں میں انھیں الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب تو خیر سے بین الاقوامیت کا زمانہ ہے اس لیے شہر بھی کھو گئے ہیں اور انسان بھی گم ہو گیا ہے۔ دونوں کے قد گھٹ گئے ہیں اور معاشرہ ایک بڑا سا جنگل بن گیا ہے جس میں کوئی ایک دوسرے کو نہیں پہچانتا اور کوئی ایک دوسرے سے محبت و وفا کے رشتے میں پیوست نہیں ہوتا۔ اس لیے اب شہر لوگوں کے ناموں سے کٹ گئے ہیں۔ بستیاں کثرتِ آبادی کے باوجود اُجاڑ ہو گئی ہیں اور بڑے بڑے شہر آبادی کے گھنے جنگل بن کر ویران ہو گئے ہیں۔ ویران اس لیے کہ اب یہاں تہذیب و تمدن، شرافت و شائستگی، علم و ہنر، فنون و ادب پروان نہیں چڑھتے بلکہ خود غرضیاں، بے وفائیاں اور اجنبیتیں پھلتی پھولتی ہیں۔ اب جوشِ وحشت کے علاج کے لیے جنگل بازار سے لائے جاتے ہیں۔ مومن خاں مومن نے شاید اسی لیے کہا تھا:

کر علاجِ جوشِ وحشت چارہ گر
لا دے اک جنگل مجھے بازار سے

میں یہاں کاکوریوں کے کارناموں کی فہرست بنانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ میں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کاکوری کو شاہ تراب علی کاکوری کے تعلق سے پہچانتا ہوں۔ میں کاکوری کو ایڈیٹر اودھ پنچ منشی سجاد حسین کی وجہ سے جانتا ہوں۔ میں کاکوری کو نادر کاکوری

کے نام سے پہچانتا ہوں۔ میں کاکوری کو ایڈیٹر الناظر اور منشی امیر احمد علوی کی وجہ سے پہچانتا ہوں۔ یہ وہ نام ہیں جن سے اردو ادب کی تاریخ کبھی مُنھ نہیں موڑ سکتی۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان اور ہندوستان میں بھی یکساں طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ وہ نام ہیں جو پاکستان میں ہماری قومی تاریخ کا حصّہ ہیں۔ حکیم نثار احمد علوی نے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ لکھا ہے جنھوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے اپنے دائرے میں شعروادب کی خدمات انجام دی ہیں۔ اس لیے میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ اس کتاب کے مطالعہ سے میری آنکھیں روشن ہوگئی ہیں۔

ان سب باتوں کے علاوہ مجھے کاکوری اس لیے بھی پسند ہے کہ وہاں کے باشندوں کو جن سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی میں نے عام طور پر شریف النفس، خوش ذوق، علم پسند، مہذب، نرم خو، وضعدار اور مخلص پایا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کا ہر شخص ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔ یہی خوبیاں مجھے اپنے بزرگ دوست سراج احمد علوی اور انوار احمد علوی میں نظر آئیں۔ اور یہی خصوصیات پہلی ملاقات ہی میں میں نے حکیم نثار احمد علوی میں بھی محسوس کیں۔ دروغ برگردن راوی۔ عام طور پر یہ بات اورنگ زیب عالم گیر سے منسوب کی جاتی ہے کہ انھوں نے مضافاتِ لکھنؤ کے چند قصبوں کے خصائص کا گہرا مطالعہ کر کے انھیں عالم گیری خطابات سے نوازا تھا اور چونکہ نقل کفر کفر نہ باشد کی بات شرعی اعتبار سے سولہ آنے پاؤ رتی اپنی جگہ درست ہے اس لیے بھی خطابات کو دہرانے میں مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اورنگ زیب عالم گیر نے دیوا شریف کے باشندوں کو مفسدانِ دیوا کے خطاب سے نوازا تھا۔ سندیلہ شریف کے لوگوں کو حاسدانِ سندیلہ کا خطاب دیا تھا۔ کرسی شریف کے لوگوں کو احمقانِ کرسی اور کاکوری شریف کے لوگوں کو مُدمَغانِ کاکوری کے خطاباتِ عالیہ سے نواز کر کرم وعنایات کی بارش کی تھی۔

خواتین وحضرات! سب قصبوں کے لیے شریف کا لفظ میں نے اس لیے عمداً استعمال کیا ہے کہ میرے لیے تو سب ہی شریف ہیں۔ جی تو یہ بھی چاہتا تھا کہ میں خود کو بھی لگے ہاتھ شریف کہہ دوں، لیکن تامل اس لیے ہے کہ شرافت آڑے آتی ہے اور جیسا

کہ آپ جانتے ہیں، اپنے منھ میاں مٹھو بننا شرافت سے بعید ہے لیکن حسنِ اتفاق سے چونکہ میں کسی مفسد، حاسد، یا احمق کو ذاتی طور پر نہیں جانتا اور میرا واسطہ صرف ان لوگوں سے ہی پڑا ہے اور اس واسطے کو بھی برسوں ہو گئے، اس لیے مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اگر مُدمّغ ایسے ہوتے ہیں تو خدا سب کو مُدمّغ کر دے۔ پاکستان کا مستقبل ان شاء اللہ تعالیٰ محفوظ ہی محفوظ ہے۔ کاکوری کے لوگوں کی شرافت و بے نیازی، لیے دیئے رہنے کی صفت، ان کی درویشی اور قلندریت، ان کا خلوص وشریف النفسی وہ اعلیٰ وارفع صفات ہیں جو مجھے انھیں چاہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ میرؔ نے غالباً یہ شعر مُدمّغان کاکوری کے لیے ہی کہا تھا:

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے

آخر میں صرف ایک بات کی طرف حکیم نثار احمد علوی کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ انھوں نے اپنی کتاب سخنورانِ کاکوری کی جو فہرستِ مندرجات بنائی ہے اس میں والدِ محترم کے رکھے ہوئے ناموں سے ناموں کو باعتبار حروف تہجی مرتب کیا ہے۔ حالانکہ سخنور اپنے اصلی نام سے زیادہ اپنے تخلص سے پہچانا جاتا ہے اس میں قباحت یہ ہے کہ ضروری نہیں کہ تخلص کے ساتھ اس شاعر کا اصلی نام بھی آپ کو یاد ہو اگر ایسا نہیں ہے تو پھر پوری فہرست کے ایک ایک اندراج کو ٹٹولنا پڑے گا مثلاً اگر مجھے مصحفی کے شاگرد رشید مسرورؔ کے حالات دیکھنے ہیں تو میں اس نام کو اس وقت تک فہرست میں تلاش نہیں کر سکتا، جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو کہ مسرور تخلص شاعر کا نام پیر بخش تھا۔ شہرت کے ساتھ پیر بخش پیچھے چلے گئے اور مسرور نے ان کی جگہ لے لی۔ امید ہے آئندہ ایڈیشن میں موصوف اس ترتیب کو بدل دیں گے یا پھر آخر میں ایک اشاریہ شامل کر دیں گے جو ایسی کتابوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ دوسری گذارش یہ ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں کتابیات بھی شامل کر دیں گے جس کا ذکر خود انھوں نے آغاز میں کیا ہے۔

(۹۱۹۹ء)

معاصر شعراء کا تذکرہ : سخن ور

سلطانہ مہر ہمارے ملک کی نامور صحافی، معروف افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعرہ ہیں۔ ان کی ذات میں صحافت، افسانہ نگاری، ناول نویسی اور شاعری کے وہ اوصاف یکجا ہو گئے ہیں جو دوسروں میں الگ الگ پائے جاتے ہیں۔ وہ برسوں تک روزنامہ "جنگ" کا صفحۂ خواتین مرتب کرتی رہی ہیں۔ اب تک ان کے چار ناول — داغِ دل، تاجور، اک کرن اُجالے کی، جب بسنت رُت آئی، شائع ہو چکے ہیں۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "بند سیپیاں" کے نام سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ "آج کی شاعرات" اور "اقبال دورِ جدید کی آواز" ان کی دو مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں۔ ان کی تازہ ترین تالیف "سخن ور" ہے جس میں سلطانہ مہر نے عہدِ حاضر کے شاعروں کے انٹرویو اس طور پر مرتب کیے ہیں کہ یہ کتاب جدید شاعروں کا ایک تذکرہ بن گئی ہے جس میں ہر شاعر کے بارے میں مفید معلومات بھی درج ہیں اور اس کا نقطۂ نظر بھی۔ اس اعتبار سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ سلطانہ مہر ایک سلیقہ مند باہمت اور باعمل خاتون ہیں اور سلیقہ و عمل ان کی وہ خوبیاں ہیں جو ان کی ساری ذہنی و مادی سرگرمیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہی سلیقہ ان کی اس کتاب میں بھی موجود ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو ہمارے لیے نئی اور دلچسپ ہیں، مثلاً جب سے میں نے شعور کی آنکھ کھولی یہی دیکھا کہ سید ذوالفقار علی بخاری کے سر کے بال چاندی کی طرح سفید ہیں۔ ان کی عمر کو دیکھتے ہوئے ہم ہمیشہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ بال یا تو نزلے کی وجہ سے سفید ہو گئے ہیں یا کراچی کی آب و ہوا نے سفید کر دیے ہیں یا بخاری صاحب سفید خضاب

استعمال کرتے ہیں اور اگر یہ سب باتیں غلط ہیں تو پھر بخاری صاحب نے یہ بال یقیناً دھوپ میں سفید کیے ہیں لیکن سلطانہ مہر کی تالیف "سخنور" پڑھ کر معلوم ہوا کہ ہماری یہ قیاس آرائیاں غلط تھیں۔ اس کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ "۴۷ء میں ہجرت کے دوران ان کا سامان تلف ہو گیا اور ان کی کتابیں بھی۔ کتابوں کے تلف ہونے کا بخاری صاحب کو اتنا صدمہ ہوا کہ ان کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے (ص ۴۹) اسی طرح ہمارے مشہور شاعر جناب تابش دہلوی کی موجودہ بیوی کے بارے میں یہ دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں کہ وہ مرزا غالب کی بھانجی ہیں اور ان کے نانا کے مکان ہی میں مرزا غالب رہا کرتے تھے۔ اتفاق سے وہ بھی غالب کے ہم نام تھے اور مرزا نوشہ کہلاتے تھے (ص ۶۷) حضرت رئیس امروہوی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اب تک کئی لاکھ شعر کہہ چکے ہیں اور اپنے ہم عصروں میں لکھ پتی کہلاتے ہیں (ص ۶۰) اور یہ بھی بتایا ہے کہ رئیس صاحب کو مونگ کی دھلی دال جس میں پالک کا ساگ ڈالا گیا ہو اور قیمہ پسند ہیں۔ ویسے کوئی اصرار کرے تو کوفتے اور دہی کے رائتے کے ساتھ پلاؤ بھی کھا لیتے ہیں۔ (ص ۶۱)۔

ایک اور شاعر کے بارے میں بتایا ہے کہ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے ایک طالب علم نے اپنی فارسی نظم اس وقت کے وائس چانسلر سر شاہ سلیمان کو سنائی تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا۔ "کتنا شور ہے اس نظم میں"۔ اس کے بعد سے منظور حسین نے اپنا تخلص شور رکھ لیا۔ (ص ۲۱۰) اور آج یہی پروفیسر منظور حسین شور اردو کے نامور شاعر ہیں۔ عندلیب شادانی کے بارے میں سلطانہ مہر نے بتایا ہے کہ "لطف کی بات یہ ہے کہ خشک اور بے مزہ کتابیں بھی وہ بڑے انہماک سے پڑھ لیتے ہیں"۔ (ص ۲۸۹) محترم احمد ندیم قاسمی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ "بچپن سے ہی ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی تھی اور مطالعے کے انتخاب میں بڑوں کی پیروی کرتے تھے۔ یہ اسی سنجیدگی کا نتیجہ ہے کہ جب مولانا محمد علی کا انتقال ہوا تو انھوں نے اس موقع پر ایک نظم کہی" (ص ۳۹۵) قتیل شفائی صاحب کے بارے میں لکھا ہے کہ "انھیں مرغ کا قورمہ، کھڑے مسالے کا سالن، سرسوں کا ساگ، رنگونی بریانی، بالائی کے پراٹھے پسند ہیں" (ص ۳۲۲) ان کھانوں کے نام سن کر جہاں ہمارے منھ میں پانی بھر آیا

وہاں یہ عجیب و غریب بات بھی قتیل صاحب سے سننے میں آئی کہ "ہندی بحروں میں بہت تنوع ہے۔ ہندی شاعری میں اردو کے مقابلے میں کئی گنا ایسی بحریں موجود ہیں۔" (ص ۲۴۴)۔

سلطانہ مہر صاحبہ نے ایک اور ایسی بات ہمیں بتائی ہے جس پر سارے اہلِ علم اور مورخین کو فوراً توجہ دینی چاہیے اور اس عظیم ذخیرے کو محفوظ کر لینا چاہیے اور وہ بات یہ ہے کہ احسان دانش کے پاس خطوط کا ایک اچھا ذخیرہ ہے۔ اگر ان خطوط کو شائع کر دیا جائے تو برصغیر کی تاریخ از سرِ نو لکھنی پڑے گی۔" (ص ۲۰) حفیظ ہوشیارپوری کے بارے میں لکھا ہے کہ جب وہ انٹر کے طالب علم تھے تو ایک جلوس کی قیادت کی اور ایک جوشیلی نظم پڑھی جس پر ان کی گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو گیا لیکن بزرگوں کا اثر و رسوخ کام آ گیا اور معاملہ دب گیا۔ اس طرح برصغیر ایک بڑے انقلابی سے محروم ہو گیا ہے۔" (ص ۱۲۱) حفیظ ہوشیارپوری ہمارے اعلیٰ درجے کے غزل گو تھے لیکن ان کے انقلابی ہونے کے امکانات پر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

پھر اس کتاب کے مطالعے سے بعض اور بھی دل چسپ باتیں سامنے آتی ہیں مثلاً حسرت موہانی کے بارے میں سلطانہ مہر نے لکھا ہے کہ انھوں نے مشاعرے میں اپنی غزل کا مطلع پڑھا تو سامنے بیٹھے ہوئے کسی صاحب نے زور سے کہا "حضور پھر عنایت ہو۔" مولانا رک گئے۔ دونوں ہاتھوں سے اپنی عینک سرکائی اور عینک کے اوپر سے گھورتے ہوئے فرمایا ــــ "کوئی ضرورت نہیں۔"

جمیل الدین عالی کے بارے میں جہاں بہت سی معلومات فراہم کی ہیں وہاں یہ بھی لکھا ہے "کہ جمیل الدین عالی پہلے ایشیائی ادیب ہیں جنھیں نوبل فاؤنڈیشن نے انعام ملے بغیر تقسیم انعام میں مہمان کے طور پر شریک کیا۔ لوگ کہتے ہیں ادب پر پوری توجہ دیں تو کیا پتا ایک دن نوبل انعام بھی لے کر دکھا دیں لیکن یہ نہ ادھر پوری توجہ دے رہے ہیں نہ اب اس کا امکان باقی رہ گیا ہے۔ بہرحال ۱۹۶۰ء سے پیر میں ایک چکر ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتا (ص ۲۶۸، ۲۶۹)

اُستاد قمر جلالوی مرحوم کے بارے میں بتایا ہے کہ انھوں نے سلطانہ مہر کو سچ کہنا

سکھایا۔ جیساکہ آپ جانتے ہیں علم بدیع میں سجع اس عبارت کو کہتے ہیں جس کے فقروں کے آخری کلمات قافیہ رکھتے ہوں یا بصورت قافیہ واقع ہوں یا نظم یا نثر میں وہ فقرہ جس میں کسی انسان کا نام اس طرح استعمال کیا جائے کہ اس سے کچھ اور معانی بھی ظاہر ہوں مثلاً ہمارے مشہور شاعر جعفر زٹلی نے محمد اشرف نامی کسی شخص کا بڑا خوب صورت سجع لکھا۔ محمد اشرف پیغمبران است۔ ایسے خوب صورت سجع کے باوجود جب محمد اشرف نے التفات نہ کیا تو جعفر زٹلی نے دوسرا مصرعہ یہ لگایا ؎ نہ این اشرف کہ مردود زمان است۔ سجع کا رواج اب تو نہیں رہا لیکن یہ شاعری کا ایک دل چسپ استعمال تھا۔ اُستاد قمر جلالوی نے سلطانہ مہر کو سجع کا فن سکھاتے ہوئے ان کے لیے یہ سجع کہا ؎

ترے رُخ کے نہ مقابل ہوا سلطانہ مہر

میں نے اس کتاب کو دل چسپی سے پڑھا اور مجھے امید ہے کہ آپ بھی اسے دل چسپی سے پڑھیں گے لیکن ایک بات کی طرف میں سلطانہ مہر صاحبہ کی توجہ ضرور مبذول کرادوں جو کاتب کی ستم ظریفی کی وجہ سے کتاب کو متاثر کر رہی ہے۔ مثلاً جہاں کاتب نے عبدالباری آسی کو عاصی لکھ دیا ہے، افقر موہانی کو افخر لکھ دیا ہے (ص ۶۰) وہاں سنین کی کتابت میں بھی بعض فحش غلطیاں کر دی ہیں مثلاً ص ۹۷ پر جوش کا سال ولادت ۱۸۹۲ء درج ہے اور ص ۱۰۴ پر ۱۸۹۸ء درج ہے۔ ص ۱۱۴ پر لکھا ہے کہ حفیظ جالندھری ۱۸۹۹ء میں ہندوستان گئے۔ ص ۲۸۵ پر عندلیب شادانی کا سال ولادت ۱۹۱۴ء درج ہے اور ص ۲۸۷ پر ۱۹۰۴ء درج ہے۔ منظر صدیقی کے بارے میں ص ۳۸۵ پر کاتب نے یہ ستم ڈھایا کہ لکھ دیا کہ منظر صدیقی کا انتقال ۲ر اکتوبر ۱۹۷۶ء کو کراچی میں ہوا۔ اسی طرح ناصر کاظمی کا سال پیدائش ۱۹۲۵ء ہے۔ کاتب نے لکھ دیا ہے کہ یہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے لاہور کے اسلامیہ کالج میں مشاعرہ تھا (ص ۳۸۸) گویا ناصر کاظمی اپنی پیدائش سے ایک سال پہلے مشاعرہ میں شریک ہو گئے۔ یہ سنین اور املا سلطانہ مہر صاحبہ ضرور درست کرادیں۔

ایک بات میں اس سلسلے میں اور کہتا چلوں کہ استاد قمر جلالوی کی شاعری کے بارے میں سلطانہ مہر صاحبہ کی رائے نہ صرف مبالغہ آمیز ہے بلکہ اس لیے نادرست بھی ہے کہ میر تقی میرؔ اور قمر جلالوی کا رنگِ سخن مزاجاً مختلف ہے۔ سلطانہ مہر صاحبہ نے جو یہ لکھا ہے کہ "یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ استاد قمر جلالوی میر تقی میرؔ کے دبستان کے آخری شاعر تھے۔ انھیں اپنی زندگی ہی میں میرِ ثانی کا لقب مل گیا تھا" (ص ۳۴۲) اسی لیے درست نہیں ہے۔

(۱۲ر جولائی ۱۹۸۰ء)

تذکرہ ماثرالکرام

کتابوں کی تقریب رونمائی ایک عام سی بات ہوگئی ہے۔ لکھنے والے کتابیں لکھتے ہیں اور پڑھنے والے انھیں پڑھتے ہیں۔ یہ پہلے بھی ہوتا تھا اور اب بھی ہوتا ہے لیکن تیز رفتاری کے اس دور میں یہ بھی ضروری ہے کہ پڑھنے والوں تک اشاعتِ کتاب کی اطلاع جلد سے جلد پہنچ جائے۔ تقریب رونمائی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس عمل میں اس لیے بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ لکھنے والے کی اس موقع پر اتنی حوصلہ افزائی ضرور ہو جاتی ہے کہ اس میں مزید کام کرنے کا حوصلہ زندہ و باقی رہتا ہے۔ کتاب لکھنے کے لیے خصوصاً اور زندگی کے دوسرے اور کام کرنے کے لیے عموماً حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ اتنی حوصلہ افزائی کہ کام کی معنویت کا احساس لکھنے والے میں باقی رہے۔ ورنہ یہ بھی ہوا ہے کہ کسی نئے لکھنے والے کی اتنی زیادہ حوصلہ افزائی ہوگئی کہ اس کے ذہن کا ارتقائی تخلیقی عمل رک گیا اور وہ یہ سمجھنے لگا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے یا جو کچھ وہ لکھ چکا ہے وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ کسی نئے لکھنے والے کو اس کے ابتدائی زمانے ہی میں اتنی شہرت کا بندوبست کر دیجیے کہ وہ غلط فہمی کا شکار ہو جائے تو اس ادیب کو زندہ دفن کرنے کا یہ آسان نسخہ ہے۔ بہرحال میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تقریب رونمائی کوئی ایسی بری بات نہیں ہے کہ اس کی مخالفت کی جائے۔ مخالفت کی بات میں نے اس لیے کہی کہ اکثر اخباروں یا رسالوں میں بعض لکھنے والے اس عمل کو سرے سے برا سمجھتے ہیں۔

ماثرالکرام، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میر غلام علی آزاد بلگرامی کا وہ تذکرہ ہے

جو بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ آزاد بلگرامی، جن کی وفات ۱۵ ستمبر ۱۷۸۶ء کو ہوئی اور جسے اب دو سال کم دوسو سال ہو گئے ہیں، اپنے وقت کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے جن کا نام تاریخ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ انھوں نے کئی تذکرے لکھے جن میں روضتہ الاولیا خلد آباد کے بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے اور مستند ماخذ کا درجہ رکھتا ہے۔ ید بیضا فارسی گو شعراء کا تذکرہ ہے۔ سرو آزاد بھی شعرا کا تذکرہ ہے جس میں ۱۴۳ فارسی گو شعراء ہیں اور ۸ بھاکا کے شاعر ہیں۔ خزانۂ عامرہ ان شعراء کا تذکرہ ہے جو امراء، نوابین اور بادشاہوں کے درباروں سے وابستہ رہے۔ اس میں اُن ۱۳۵ شعراء کا تذکرہ ہے جو ایران اور برعظیم کے مختلف درباروں سے وابستہ رہے۔ مآثر الکرام میں علامہ آزاد بلگرامی نے علماء و فضلاء، صوفیا اور شاعروں کے حالات درج کیے ہیں۔ ان تذکروں کو مرتب کرنے کے سلسلے میں آزاد بلگرامی نے اس سارے مواد کو کھنگالا جو مستند حالات کے لیے ضروری تھا۔ مآثر الکرام دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں ۸۰ صوفیہ کا ذکر ہے۔ ان میں سے ۶۱ خطۂ بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک خاتون ہیں اور بقیہ ۱۹ دوسرے خطوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسری فصل میں ۳۰ علماء کا تذکرہ ہے۔ تیس بلگرام سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی دوسرے علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں لعل شہباز قلندرؒ کا تذکرہ بھی درج ہے۔ یہ سب تذکرے، جن میں مآثر الکرام بھی شامل ہے، فارسی زبان میں لکھے گئے ہیں۔

اس دور میں، جب فارسی کا رواج کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے فارسی کتابوں سے استفادہ بھی مشکل ہوتا جارہا ہے اور اس طرح بنیادی ماخذ کے دروازے ہم پر بند ہوتے جارہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے اور خصوصاً اہلِ تحقیق و صاحبانِ علم کے لیے کہ وہ فارسی زبان کو سیکھیں تاکہ ہمارا ماضی اور اس کے بنیادی ماخذ ہمارے لیے زندہ رہیں۔ وہ قومیں جو اپنے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتی ہیں بے اصل اور بے بنیاد بن کر رہ جاتی ہیں۔ فارسی کے سلسلے میں آج یہ سوال ہمارے مستقبل کے دروازے پر جلی حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں ایک حل تو یہ ہے کہ ہمارے لکھنے والے

فارسی زبان سیکھیں۔ دوسرا حل یہ ہے کہ اپنے بنیادی مآخذ کے مستند اردو تراجم کیے جائیں لیکن یہ بہت دشوار کام ہے اور اس دشواری کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے کسی دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمے کا کام کیا ہے۔ اسی لیے مستند علما اپنی کتابوں میں ترجموں سے حوالے یا اقتباسات نہیں دیتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ محقق نے اصل کتاب کو اسی زبان میں پڑھا ہو جس میں وہ لکھی گئی ہے تاکہ تحقیق کے سلسلے میں کوئی غلطی پیدا نہ ہو سکے۔ لیکن آج کے دور میں یہی غنیمت ہے کہ فارسی کتب کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کیے جائیں اور یقیناً یہ خوشی کی بات ہے کہ مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری صاحب نے ماثر الکرام کا نہ صرف ترجمہ کیا بلکہ ایسا اچھا ترجمہ کیا جو سلیس و رواں ہونے کے ساتھ ساتھ اصل فارسی متن سے نہایت قریب ہے۔ یہ بہت مشکل کام تھا جسے فاخری صاحب نے سلیقے کے ساتھ انجام دیا ہے۔ علامہ آزاد بلگرامی کے دوسرے تذکرے بھی ان کی توجہ کے محتاج ہیں۔ اسی طرح بہت سی تصوف کی کتابیں مخطوطات کی شکل میں کتب خانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ ان کے تراجم کی بھی ضرورت ہے۔ خواجہ میر درد کی عظیم "علم الکتاب" بھی مستند اردو ترجمے کی منتظر ہے۔ ہم خواجہ میر درد کو صرف ایک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن انھوں نے علم الکتاب میں فلسفۂ تصوف میں، جو وحدت الوجود اور وحدت الشہود کا امتزاج کیا ہے، اس سے ناواقف ہیں۔ علم الکتاب تصوف کی عظیم کتاب ہے اور مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری سے کہہ رہی ہے ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

۲۶ ستمبر ۱۹۸۴ء

دیوانِ غالب کا پنجابی ترجمہ

غالب اور دیوانِ غالب ہماری قومی میراث ہیں۔ ایسی گراں مایہ قومی میراث جس میں برصغیر کی مسلم تہذیب کی روح اپنے حسن و جمال کے ساتھ، تاج محل کی طرح، ہم سے کلام کرتی ہے اور روح کو تازہ دم کر دیتی ہے۔ اسیر عابد صاحب نے اسی روح کو منظوم ترجمہ کے ذریعے اس طور پر پنجابی کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ ہماری قومی میراث اپنے حسن و جمال، لطافتِ خیال اور وسعتِ بیان کے ساتھ آئینہ خانۂ اظہار میں منعکس ہوگئی ہے۔ یہاں میں ایک سوال اٹھانا چاہتا ہوں کہ آخر پنجابی زبان میں غالب جیسے مشکل گو عظیم شاعر کی روحِ شاعری کیوں اور کیسے حلول کرگئی۔ اس کا جواب چونکہ بہت آسان ہے اس لیے شاید ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ اُردو زبان اور پنجابی زبان برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی ایک دوسرے سے قریب تر رہی ہیں۔ قدیم اردو کے ادبیات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ اردو زبان کی تشکیل کے دور میں بھی پنجابی زبان اس کی تعمیر و تشکیل میں مسلسل شریک رہی ہے۔ دونوں زبانوں کے کنایات، اشارات، علامات، رمزیات، استعارات اور تلمیحات کم و بیش ایک رہے ہیں۔ دونوں زبانوں کا ذخیرۂ الفاظ بڑی حد تک مشترک رہا ہے۔ دونوں زبانوں میں بندش و تراکیب کا خزانہ بھی ایک اور یکساں رہا ہے۔ اردو زبان نے صدیوں کے سفر میں جس ترکیبِ نحوی کی پرورش کی ہے اس ترکیبِ نحوی کو پنجابی زبان نے ہمیشہ قبول کرکے اپنی ترکیبِ نحوی کو اسی سانچے میں ڈھالا ہے۔ تصوف کی روایت اور اس کے مابعد الطبعیاتی نکات دونوں میں یکساں ہیں اسی لیے شاہ حسین، سلطان باہو اور

بلھے شاہ اردو اور پنجابی ہی کے نہیں بلکہ سارے پاکستان کا مشترک سرمایہ ہیں اور بلھے شاہ ؒ میرا وہ محبوب شاعر ہے کہ میں اُن کے کلام کے مختلف نسخے اسی طرح جمع کرتا ہوں جس طرح دیوانِ غالبؔ کے مختلف مطبوعہ و قلمی نسخے جمع کرتا ہوں۔ پنجابی اور اردو دونوں کا رسم الخط بھی ایک ہے اور دونوں زبانوں پر فارسی و عربی الفاظ کے گہرے اثرات مُرتسم ہوئے ہیں۔ پنجابی ہمیشہ سے فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی رہی ہے۔ خوشونت سنگھ نے اپنی کتاب "دی سِکھس" اور جان کلارک آرچر نے اپنی کتاب "دی سِکھس" میں لکھا ہے سکھوں کے دوسرے گُرو انگد (۱۵۰۴ء-۱۵۵۲ء) نے جب سکھ مذہب کو اسلام سے دور ہٹانے کی کوششوں کا آغاز کیا تو گرو انگد نے فارسی عربی رسم الخط کو ترک کر دیا اور شمالی ہندوستان کے کئی رسم الخطوں کے عناصر کو ملا کر ایک نیا رسم الخط گورمکھی کے نام سے ایجاد کیا، لیکن پنجاب کے مسلمان ہمیشہ کی طرح فارسی عربی رسم الخط ہی میں پنجابی لکھتے رہے۔ اسی رسم الخط اور مشترک تہذیبی روایت کی وجہ سے اردو و پنجابی اپنی ترکیب نحوی اور جملوں کی نحوی ساخت کے اعتبار سے قریب تر رہیں اور دونوں ایک دوسرے کو متاثر کرتی رہیں۔ اہلِ پنجاب نے چونکہ اپنی تخلیقی قوتوں کا اظہار اردو زبان میں کیا بلکہ اگر دیکھا جائے کہ جیسے انیسویں صدی اردو کے تعلق سے دِلّی و لکھنؤ کی صدی ہے اسی طرح بیسویں صدی امتیاز کے ساتھ پنجاب کی صدی ہے اور پنجاب کے محاورے، کہاوتیں، روزمرہ الفاظ، لہجے اور تہذیبی صورتیں اُردو زبان کا حصہ بن کر قومی سطح پر عام و مروج ہو گئی ہیں اور یہی وہ تہذیبی پس منظر اور ترکیبِ نحوی کی یکسانیت ہے کہ جس کے باعث دیوانِ غالبؔ کو اسیر عابد صاحب کامیابی و فنی اثر کے ساتھ پنجابی کا جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ترکیبِ نحوی اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں میں بھی مماثل اور قریب ہے۔ اسی ترکیب نحوی، رسم الخط، روایتِ تصوف و اسلام اور یکساں تہذیبی ارتقا کی وجہ ہی سے اردو زبان جتنی بیان و اظہار کے سانچے وضع کر کے ترقی کرتی ہے اسی حساب سے پاکستان کی دوسری ساری زبانیں بھی ترقی کرتی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خواہ پنجابی، ہندکو، سرائیکی، پشتو ہوں یا سندھی، بلوچی، براہوی، کشمیری، شنا وغیرہ زبانیں ہوں ان سب نے آزادی کے بعد ۱۹۴۷ء سے جو ترقی کی ہے اس سے پہلے نہیں کی تھی۔

اردو کا پاکستان کی ساری زبانوں سے یہ اصل رشتہ ہے اور یہ رشتہ انگریزی زبان سے ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ زبان کے اس فطری امتزاج کے باوجود انگریزی نے جس طرح ہمارے معاشرے پر قبضہ کر رکھا ہے اس سے نتیجتاً خواص و عوام الگ الگ ہو کر ہر روز طلوعِ آفتاب کے ساتھ ایک دوسرے سے دُور سے دُور ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح انگریزی زبان کا بااختیار رواج، متجانس قوم بننے کے ہمارے فطری عمل کو روک کر انتشار و تعصب کے عمل کو تیز سے تیز تر کر رہا ہے۔ انگریزی زبان سیکھنا، اس پر قدرت حاصل کرنا ایک بات ہے اور اسے اوڑھنا بچھونا بنانا جیسا ہم نے بنا رکھا ہے ایک بالکل مختلف بات ہے۔ میں کہتا رہا ہوں کہ انگریزی سیکھیے اور خوب سیکھیے۔ اس پر پورا عبور حاصل کیجیے۔ اس کے ذریعے علوم حاصل کیجیے لیکن خدارا اسے اپنی تہذیب بنانے کی کوشش نہ کیجیے ورنہ ہم اسی طرح منتشر اور بکھرے بکھرے رہیں گے۔ انگریزی زبان اور تہذیب نے ہمیں اپنی تہذیبی روایت سے دور کر کے ہمیں ایک دوسرے کے لیے اجنبی بنایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ساری خداداد صلاحیتوں کے باوجود ہم اپنی فطری تخلیقی صلاحیتوں کو اب تک بروئے کار نہیں لا سکے ہیں اور اس صورت حال میں، جس سے ہم گذشتہ ۴۲ سال سے دوچار ہیں، ہم اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لا بھی نہیں سکتے۔ اسی لیے ہمارا معاشرہ اول درجے کے موجد، سائنس داں، محقق وغیرہ پیدا کرنے سے قاصر ہے۔ عوام کو جب تک ہم اپنے معاشرے کے بڑے دھارے میں شریک نہیں کریں گے اور خواص کا محدود طبقہ عوام کی غالب اکثریت کا تہذیبی و معاشی سطح پر استحصال کرتا رہے گا یہ صورت نہ صرف برقرار رہے گی بلکہ روز بروز پراگندہ تر ہوتی جائے گی۔

(۱۴ر جنوری ۱۹۸۹ء)

نظیر خوانی

آپ نے اب تک قرآن خوانی، روضہ خوانی اور قصیدہ خوانی وغیرہ کی تراکیب تو سنی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ان مجلسوں میں شرکت بھی کی ہے لیکن نظیر خوانی کی محفل پہلی بار سجائی گئی ہے اور اس کا سہرا "اہلِ سلسلہ" کے سر جاتا ہے۔ کئی سال پہلے کی بات ہے کہ مختار زمن صاحب، بھابی سلمیٰ اور بڑے بھائی ابوالفضل صدیقی صاحب اور میں اکثر رات کو مل بیٹھتے اور دُنیا زمانے کی باتیں کرتے۔ اچھی بھی بُری بھی۔ پاک بھی ناپاک بھی لیکن دل کی صفائی کا ہمیشہ خیال رکھتے، اور چنبیلی کی مہک سے لبریز، لب سوز چینی چائے پیتے جاتے۔ غالباً باتوں کا روحانی تعلق کسی نہ کسی قسم کے مشروب سے ہوتا ہے۔ یہ مشروب خواہ مشرق کا ہو یا مغرب کا۔ محفل جب ہی جمتی ہے جب مشروب سامنے ہو اور باتوں کی خوشبوؤں سے فضا مہک رہی ہو۔ ایک ایسی ہی رات تھی۔ کراچی کا موسم ضرورت سے زیادہ ٹھنڈا تھا اور مہاوٹوں نے سردی کو اچھی طرح جما دیا تھا کہ باتوں باتوں میں نظیر اکبرآبادی کا ذکر آگیا۔ میں نے زمن صاحب سے کہا کہ اگر کلیاتِ نظیر ہو تو نظیر اکبرآبادی کی نظم "جاڑے کی بہاریں" پڑھی جائے۔ زمن صاحب جھٹ پٹ اندر گئے اور پلک جھپکتے میں کلیات کے ساتھ واپس آگئے۔ زمن صاحب، خدا انھیں عمرِ نوح عطا فرمائے، بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ محفلوں کی رونق۔ زندہ دلی کی تجسیم، یاروں کے یار، صاحبِ قلم لیکن بے سیف، جہاں جائیں محفل کو زعفران زار بنا دیں۔ اس دورِ حشر زا میں کہ سارا معاشرہ نفسا نفسی کا شکار ہے، ایسا مقبول بندہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ سلسلے کی گرمی اور اہلِ سلسلہ کی جان۔ آتے ہی ورق گردانی شروع کر دی اور

نظیر کی نظم پڑھنے لگے۔

دل ٹھوکر مار پچھاڑا ہو اور دل سے ہوتی ہو کشتی سی
تھر تھر کا زور اکھاڑا ہو بجتی ہو سب کی بتیسی
ہو شور پھر ہو ہو ہو کا اور دھوم ہو سی سی سی سی کی
کلے پہ کلّہ لگ لگ کر چلتی ہو منھ میں چکی سی
ہر دانت چنے سے دکتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جب ایسی سردی ہوا ے دل تب زور مزے کی گھاتیں ہوں
کچھ نرم بچھونے مخمل کے کچھ عیش کی لمبی راتیں ہوں
محبوب گلے سے لپٹا ہو اور کہنی چنکی لاتیں ہوں
کچھ بوسے ملتے جاتے ہوں کچھ میٹھی میٹھی باتیں ہوں
دل عیش وطرب میں ہلتا ہو تب دیکھ بہاریں جاڑے کی

جب نظم ختم ہوئی تو سب نے زوردار قہقہہ لگایا اور مسرتوں کی نسیم سحر سے دل کی بند کلی کھل اٹھی اور ساری فضا میں شمامۃ العنبر کی گہری خوشبو پھیل گئی۔ بہت دیر نظیر اکبرآبادی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی اور باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ ایک ایسی محفل آراستہ کی جائے جس میں صرف کلام نظیر پڑھا جائے اور اسے نظیر خوانی کا نام دیا جائے۔ کڑے بچھنے کی باتیں درمیان میں آئیں۔ نغموں اور گانوں کی باتیں ہوئیں۔ اُن فقیروں کی دُھنیں زیر بحث آئیں جو نور ظہور کے تڑکے مخصوص دُھنوں میں کلام نظیر گاتے ہوئے گذرتے تھے اور جن کی لے دلوں کے نہاں خانوں میں اتر کر روح میں پیوست ہو جاتی تھیں۔ پھر ان دُھنوں کے گانے والے تلاش کیے گئے مگر اسی تلاشِ بے معاش میں زمن صاحب اسلام آباد چلے گئے اور ان کے بغیر میں، بھابی سلمیٰ اور ابوالفضل صدیقی بے ہوا کا غبارہ بن کر رہ گئے۔ برسوں بعد جب زمن صاحب کراچی آئے تو نظیر خوانی کی ہوک ایک بار پھر اٹھی اور دلجمعی کے ساتھ اس کا انتظام کیا گیا۔

خواتین وحضرات! آج کی رات محفل نظیر خوانی کی رات ہے اور آج برسوں

کا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو رہا ہے جس کی آرزو ہم سب کی حسرت تھی۔ اے اہل سلسلہ!
یہ محفلیں، جو گذشتہ ۴ سال سے کراچی میں جم رہی ہیں، ہم سب کی زندگی کا قیمتی سرمایہ ہیں۔
آنے والے زمانوں میں ان محفلوں کی یادیں گرمی احساس بن کر ہمارے دلوں کو روشنی
و نور سے بھر دیں گی اور ان یادوں کی برات کے درمیان تضاد کو توازن و اعتدال بخشنے
والا ایک صبح منور چہرہ اس ہستی کا ابھرے گا جس نے ایک تاروں بھری رات میں اس
انجمن کی بنیادیں استوار کی تھیں اور جو آج بھی ہمیشہ کی طرح اس محفل کی روح رواں ہے۔
اچھی شاعرہ، بڑے دل والی، اچھی انسان، محبتوں کا پیکر اور عفو و درگذر کی مثال اور
اے اہلِ سلسلہ آپ ہی سے اس محفل کی رونق ہے۔ آپ ہی سے گرمی گفتار بھی ہے
اور گرمی بازار بھی۔ آپ ہی کی محبتوں اور فراخ دلی نے سلسلے کو ایک ایسے خاندان
ایک ایسے کنبے کی صورت عطا کی ہے کہ اب ایک دوسرے کے بغیر روح میں موج
اضطراب سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی محبتیں اور آپ کا اخلاص اہلِ سلسلہ کی حیات تازہ ہے۔

نظیر اکبر آبادی، جو اردو شاعری کی عظیم روایت کے ایک منفرد اور بے مثال
شاعر تھے، ۱۷۴۸ء میں پیدا ہوئے اور یکم اگست ۱۸۳۰ء کو آگرہ میں آسودۂ خاک ہوگئے۔
فقیر منش، آزاد طبع اور قناعت پسند، ساری عمر مُدرسی اور شاعری میں گذار دی۔ مُدرسی
سے پیٹ پالا اور شاعری سے اس تہذیب کی روح کو پالا پوسا، جو اپنی صورت گری کے لیے
صدیوں سے بے قرار تھی۔ اسی لیے نظیر کی آواز اُردو شاعری کی سب آوازوں سے مختلف
ہے۔ ان کی آواز میں ہند مُسلم تہذیب کی روح، صوت و آہنگ کا جادو جگا رہی ہے۔ اسی
لیے نظیر کا ذخیرۂ الفاظ بے حد و بے حساب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری سے آج بھی
عوام و خواص سب کی روح تازہ ہو جاتی ہے اور مسرتوں کی پھوار سے زندگی کی تپتی ہوئی
دھوپ میں جان سی پڑ جاتی ہے۔

نظیر عوام میں اتنے مقبول تھے کہ جدھر سے گذرتے شعر و شاعری کی فرمائشیں ہونے
لگتیں۔ ایک دن شاہ گنج سے آتے ہوئے چند بھٹیارنیوں نے روک لیا اور کہا کہ میاں! کچھ کہہ دو۔
میاں نے بہت ٹالا مگر وہ کہاں ٹلنے والی تھیں۔ نظیر نے کہا اچھا اپنا اپنا نام بتاؤ۔ ایک نے

کہا جمنا۔ دوسری نے کہا گنگا۔ نظیر نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا اور برجستہ کہا:

یارب میری دعا کو جلدی قبول کیجیے
جمنا میں لگا بلی گنگا کے پار کر دے

جنھوں نے آگرہ دیکھا ہے جانتے ہیں کہ مائی تھان جاتے ہوئے کناری بازار پڑتا ہے۔ کوٹھے پر سے کسی نے مسکرا کر کہا "میاں! ہمیں بھی اپنا کلام سنا دیجیے۔ یاد کرلیں گے، گائیں گے، کمائیں گے۔ نظیر خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اصرار کیا اور فقرہ بھی چست کیا۔ نظیر نے برجستہ یہ شعر پڑھا:

لکھیں ہم عیش کی تختی پہ کس طرح اے جان
قلم زمین کے اوپر، دوات کوٹھے پر

نظیر بڑے شاعر اور زندہ دل انسان تھے۔ عوام کی جان تھے۔ اسی لیے اپنے دور میں بے حد مشہور اور بے حد ہر دلعزیز تھے۔ ان کی یہی شہرت اور یہی ہر دلعزیزی آج تک باقی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔

آج کی محفل میں نظیر اکبر آبادی کو یاد کرنے اور ان کے کلام سے اپنی روح کو تازہ کرنے کا یہ وہ سلسلہ ہے جسے اہلِ سلسلہ نے تلاش کیا ہے۔

غیر منقوطہ شاعری: مصدرِ الہام

جناب صبا متھرادی مجھے اس لیے بھی عزیز ہیں کہ وہ میرے تین چھوٹے بھائیوں اور ایک بیٹے کے اُستاد ہیں۔ میں اُنھیں گذشتہ بیس بائیس سال سے جانتا ہوں۔ اور ان کا نام میرے گھر میں ہمیشہ عزت واحترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک شریف النفس، کم گو اور کم آمیز انسان ہیں، اسلام کے نور سے ان کے دل و دماغ روشن ہیں اور عشقِ رسولؐ سے ان کا وجود سرشار ہے۔ اسلام اور عشقِ رسولؐ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات ہیں وہ ایک سچے فرض شناس اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرنے والے آدمی ہیں ــــ ایک اچھے انسان ــــ ایک اچھے استاد ایک اچھے شاعر۔

اب تک ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر اہلِ نظر سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ محاذِ قلم۔ آئینے، خطباتِ غوث اعظمؒ، دربارِ رسالت میں، اور ترویج فنِ تاریخ میری نظر سے گذری ہیں۔ وہ گذشتہ پچاس سال سے شاعری کر رہے ہیں اور اس فنِ لطیف پر انھیں پوری قدرت حاصل ہے۔ زیرِ نظر مجموعۂ کلام جس کا نام صبا صاحب نے مصدرِ الہام رکھا ہے اُن کی شاعری کا حاصل ہے۔ اس مجموعے میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ کسی شعر میں کوئی لفظ ایسا استعمال نہ ہو جس میں نقطہ آتا ہو۔ اب سے پہلے جب ہماری تہذیب زندہ تھی صنعت غیر منقوطہ میں شاعری کرنا کمالات کا کمال سمجھا جاتا تھا۔ اس کمال کا اندازہ اُس وقت کیا جا سکتا ہے جب آپ شاعری کی بات تو چھوڑ دیجیے ایک سطر نثر میں ایسے الفاظ کی مدد سے لکھنا چاہیں جن میں نقطہ نہ آتا ہو اور کوشش کریں کہ بات بھی ڈھنگ سے ادا ہو جائے اُس وقت صحیح معنی میں آپ جناب صبا متھراوی کے فنِ بلیغ کی داد دے سکتے ہیں۔ اس مجموعۂ کلام میں جتنی غزلیں، نظمیں، قطعات، رباعیات اور نعتیں ہیں، ان میں کہیں

بھی ایک لفظ ایسا استعمال میں نہیں آیا جس میں نقطہ آیا ہو۔ پھر قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ صبا صاحب نے غیر منقوطہ الفاظ کو بحر اور وزن کی زنجیروں میں قید نہیں کیا۔ اگر وہ صرف یہی کرتے تو ان کی محنت کی داد تو دی جاسکتی، لیکن شعر کا مزا نہ آتا۔ صبا صاحب نے بیک وقت دونوں کام کئے ہیں۔ ایک طرف غیر منقوطہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور دوسری طرف شاعری کا جادو بھی جگایا ہے۔ یہ ایسا کام ہے جس کی داد نہ دینا سفاکی ہے۔

اُردو نظم و نثر کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو اس فن میں بہت کم لوگوں نے اظہارِ کمال کیا ہے۔ یہ تو ایسے جان جوکھوں کا کام ہے کہ لکھنے والا خون تھوکنے لگے۔ فیضی نے نثر فارسی میں قرآنِ پاک کی غیر منقوطہ تفسیر لکھی تھی اور اس کا نام "سواطع الالہام" رکھا تھا۔ جناب صبا نے اپنے غیر منقوطہ مجموعۂ کلام کا نام "مصدر الہام" رکھا ہے۔ انشا اللہ خان انشا نے ایک مختصر دیوان اور ایک کہانی "سلک گہر" اسی صنعتِ غیر منقوطہ میں تصنیف کیے تھے اور ایک مثنوی اور ایک قصیدۂ منقبت بھی اسی صنعت میں لکھے تھے۔ شاگرد دبیر مرزا محمد تقی اختر کا ایک مرثیہ بھی اسی صنعت میں ملتا ہے۔ یہ وہی مرثیہ ہے جو "وائقہ قائم" نامی مجموعۂ مراثی میں مرزا سلامت علی دبیر کے نام سے درج کیا گیا ہے۔ صدر عالم صدر نے ایک قصہ "سرور صدر" کے نام سے اسی صنعت میں تحریر کیا تھا جس کا مخطوطہ انجمن ترقی اُردو پاکستان میں میری نظر سے گذرا ہے۔ لچھمن پرشاد صدر لکھنوی نے "سداما" کے قصے کو صنعت غیر منقوطہ میں منظوم لکھا تھا، جس کا ذکر خم خانۂ جاوید کی جلد پنجم (۲۷۹) میں ملتا ہے، بحر الفصاحت (ص ۹۷۷) میں دبیر کے تین بے نقطہ مرثیوں کا ذکر ملتا ہے اور ایک بند میر انیس کا بھی اس صنعت کی مثال میں دیا گیا ہے۔ مرزا دبیر کے چہیتے شاگرد شیخ فقیر حسین عظیم نے صنعت غیر منقوطہ میں مرزا دبیر کے انتقال کی تاریخ لکھی تھی۔ (دبستانِ دبیر ص ۲۳۶) ایسی ہی چند مثالیں تلاش سے اور پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس مشکل صنعت میں بہت کم اہل کمال نے اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ مصدر الہام اس فہرست میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

صبا صاحب نے اپنے مجموعۂ کلام میں صنعت غیر منقوطہ کو استعمال کرنے کا سبب یہ بتایا ہے کہ غیر منقوطہ کلام کی اشاعت کا مقصد اُردو کی قوتِ ابلاغ کا مظاہرہ ہے۔ دکھانا یہ ہے کہ اُردو میں الفاظ کا کس قدر بے پناہ ذخیرہ ہے کہ بعض دانستہ پابندیوں کے باوجود اس میں ہر قسم کے خیالات

کا اظہار بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ اس مجموعۂ کلام سے نہ صرف اردو کی بلکہ خود صبا صاحب کی قوتِ ابلاغ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔

مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ آخر کلمہ طیبہ کے سارے الفاظ کیوں غیر منقوطہ ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول محمدؐ کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا۔ لفظ تو سب ہی پاک ہیں، لیکن کیا اس طرح غیر منقوط الفاظ زیادہ اہم نہیں ہو جاتے؟ پھر یہ خیال بھی آتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ منقوطہ الفاظ کے مقابلے میں صوتی اعتبار سے زیادہ سُبک ہوتے ہیں یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں زبان کو جنبش دیئے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جاسکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آواز بن سکتے ہیں اور جنھیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے اپنی روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق ہماری روحانی زندگی سے زیادہ ہے۔ باطن کی آواز، ظاہر کی آواز سے زیادہ سچی اور زیادہ با معنی ہوتی ہے، لکھتے لکھتے یہاں تک پہنچا تو خیال آیا کہ آپ کو سوچتا ہوا چھوڑ کر میں اب رخصت ہو جاؤں اور پھر آپ جانیں اور صبا صاحب جانیں۔ میں آپ کے اور ان کے درمیان کیوں دیوار بنوں۔

(۲۲ مارچ ۱۹۷۶ء)

پیش لفظ "مصدر الہام"

غیر منقوطہ نثر: ہادیِ عالمؐ

آج مجھے آپ سے ایک ایسی کتاب کا تعارف کرانا ہے جو ایک طرف اس انسانِ کامل کی مقدس سیرت کو پیش کرتی ہے جس نے انسان کو فرش سے اٹھا کر عرش تک پہنچایا اور دوسری طرف جس میں اس عظیم انسان کی سیرتِ کاملہ کو صرف ایسے الفاظ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے جن پر نقطہ نہیں لگایا جاتا۔ غیر منقوطہ الفاظ کے ذریعے اپنی بات کو سلیقے سے کہنا ایک نہایت مشکل کام ہے اور اس کام کی داد وہی دے سکتے ہیں جنھوں نے تیشے سے جوئے شیر لانے کا کام کیا ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں ہمارے رسم الخط میں نُقطہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے اور عربی، فارسی و اردو کے بیشتر الفاظ منقوطہ ہوتے ہیں۔ غور فرمائیے کہ لغت کے بڑے حصے کو نظر انداز کر کے صرف ان الفاظ کے سہارے اپنی بات کہنا اور اس طور پر کہنا جس طور پر مولانا محمد ولی رازی صاحب نے کہی ہے ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے تصور ہی سے صاحبانِ ادب کے قلم جنبش سے محروم ہو جاتے ہیں۔ غیر منقوطہ الفاظ سے کوئی ادب پارہ تخلیق کرنا صرف ان زبانوں میں ممکن ہے جنھوں نے اردو فارسی کی طرح عربی رسم الخط اختیار کیا ہے اور جہاں منقوطہ و غیر منقوطہ الفاظ خود زبان اور اس کے رسم الخط کو مابعد الطبیعیاتی اساس اور روحانی بنیاد فراہم کر کے کائنات کے وجود میں جگمگاتے ستاروں اور محوِ خرام سیاروں کا سماں پیدا کرتے ہیں۔ اسی مابعد الطبیعیات سے ہمارا تصورِ جمال پیدا ہوا ہے اور الفاظ اسی رسم الخط کی مدد سے ہمارے ظاہر کی آرائش اور ہماری روح کی بالیدگی کرتے ہیں۔ یہ وہ نکتہ ہے جس سے اسلامی تہذیب کی روح نے جنم لیا ہے لیکن آج تہذیب مغرب کے سیلاب میں بہہ کر ہم ایک ایسے گہرے احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ اب ہمیں اپنی روایت، اپنی فکر، اپنی زبان، اپنا رسم الخط غرض کہ اپنی ہر چیز بے مایہ نظر آنے

گی ہے۔ حالانکہ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام نے انسانی زندگی کو ہر طرح پر اپنے سانچے
میں ڈھالا ہے مثلاً اپنے رسم الخط ہی کو لیجیے۔ اس کا رُخ سیدھے ہاتھ کی طرف سے اُلٹے
ہاتھ کی طرف ہوتا ہے۔ یہ رُخ بھی بے سبب نہیں ہے۔ یہ بھی دینی بنیاد پر قائم ہے۔
اسلام نے اپنے نظام کائنات میں سیدھے ہاتھ کو اہمیت و فوقیت دی ہے اور اسی لیے
اسلامی تہذیب اور مسلمان معاشروں میں ہر کام سیدھے ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ہم کھانا
کھاتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے پانی پیتے ہیں تو سیدھے ہاتھ سے۔ نماز پڑھ کر سلام پھیرتے
ہیں تو پہلے سیدھے ہاتھ کی طرف پھیرتے ہیں۔ طوافِ کعبہ کرتے ہیں تو اُس کا رُخ بھی وہی
ہے جو ہمارے رسم الخط کا رُخ ہے۔ طواف کرتے ہیں تو دایاں پیر پہلے اُٹھاتے ہیں گویا
جب ہم اپنے رسم الخط میں کچھ لکھتے ہیں تو ہم ہر بار طواف کعبہ کے عمل کو دہراتے اور اپنی
دینی روایت کو زندہ کرتے ہیں۔ لیکن آج جب ہم اپنے فکر و عمل سے، اپنی دینی اساس کو
فراموش کر کے، مغرب کے ہاتھوں مغلوب ہو رہے ہیں مولانا محمد ولی رازی نے اپنی
زیر نظر تصنیف "ہادی عالم" میں غیر منقوطہ الفاظ کی مدد سے اردو نثر کا ایک اسلوب
تخلیق کر کے ہمیں پھر سے اپنی دینی روایت کی معنویت اور اس کی دریافتِ نو کی طرف
متوجہ کیا ہے۔

غیر منقوطہ تحریروں کی روایت عربی، فارسی اور اردو ادبیات میں پہلے سے
موجود ہے۔ عربی میں مقاماتِ حریری، فارسی زبان میں امیر خسرو کا کچھ کلام اور فیضی کی
سواطع الالہام اردو میں انشاء اللہ خان انشا کا غیر منقوطہ دیوان اور کئی دوسری
تخلیقات موجود ہیں لیکن اب تک ایک موضوع پر اردو نثر میں پوری کتاب کسی نے تصنیف
نہیں کی تھی۔ اسی لیے مولانا محمد ولی رازی کی تصنیف ہادی عالم تاریخی اہمیت کی حامل
ہے جس میں سیرتِ رسولؐ بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف نے ایک لفظ بھی ایسا استعمال
نہیں کیا جس میں نقطہ استعمال ہوتا ہو اور پھر خوبی یہ رکھی کہ نہ اظہار میں تشنج پیدا ہوا،
نہ بیان میں کمزوری آئی اور نہ اسلوب میں جھول پیدا ہوا اور نفس مضمون بھی پڑھنے
والے تک پوری طرح پہنچ گیا۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے بار بار یہ خیال آیا کہ آخر کلمہ طیبہ

کے سارے الفاظ بے نقطہ یا غیر منقوط کیوں ہیں؟ آخر اللہ اور اس کے رسول پاک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نام میں نقطہ کیوں نہیں آتا؟ لفظ تو سب ہی پاک ہوتے ہیں لیکن اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے الفاظ بے نقطہ ہونے کی وجہ سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ غیر منقوط الفاظ منقوط الفاظ کے مقابلے میں، صوتی اعتبار سے زیادہ سبک ہوتے ہیں۔ یہ وہ الفاظ ہیں جنھیں زبان کو جنبش دیے بغیر دل کی زبان سے ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے دل کی آواز بن سکتے ہیں اور جنھیں ہم اپنے دل کی گہرائیوں سے روح کی آواز میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ غیر منقوط الفاظ کا تعلق زندگی کے روحانی پہلو سے ہے۔ جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک عربی رسم الخط غیر منقوط تھا۔ حروف پر نقطہ لگانے کا طریقہ خود ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا۔ روایت ہے کہ ایک دن حضرت معاویہؓ نے ایک کاتب کو بلایا اور فرمایا کہ میں تمھیں لکھواتا ہوں۔ لکھو اور "رقش" کرو۔ کاتب نے پوچھا کہ حضور "رقش" کیا چیز ہے؟ حضرت معاویہؓ مسکرائے اور کہا کہ ایک دن جب میں مدینہ منورہ میں تھا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کاتب کی حیثیت سے مجھے بلایا اور فرمایا لکھو اور رقش کرو۔ اس وقت میں نے بھی یہی پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! رقش کیا چیز ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حروف پر جہاں ضرورت ہو نقطے لگاؤ۔ اب آپ دیکھیے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بے نقطہ الفاظ کی روحانیت میں نقطے کا اضافہ کر کے اسے زندگی کے عمل سے ملا دیا اور اس طرح اسلام کی دینی روایت کو مکمل کر دیا۔ میں نے جب مولانا محمد ولی رازی صاحب کی تصنیف ہادی عالمؐ کا مطالعہ کیا تو میں نے دراصل دینی روایت کے دائرے میں روحانی سفر کیا اور یہی وہ روحانی سفر ہے جس کی ہمیں اپنے معاشرے میں اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ وہ روحانی سفر جس سے بے لوثی اور ایثار

کی قدریں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے زندگی آگے بڑھتی ہے، وہ روحانی سفر جس سے معاشرے ترقی کرتے ہیں۔ وہ روحانی سفر جس سے دلوں میں محبت اور اخوت کی دنیا آباد ہوتی ہے اور امن وسکون اور اعتماد و اعتبار کی فضا پیدا ہوتی ہے۔ مولانا محمد ولی رازی صاحب کی کتاب نے مجھ پر یہ سفر آسان کر دیا اور یہی وہ سفر ہے جس سے زندگی میں نئی معنویت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۹۸۵ء)

رحمٰن بابا کا پیغام

پشتو ادب سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ نے جب مجھ سے رحمان بابا کے جلسۂ یاد میں تقریر کرنے کی فرمائش کی تو میں نے ڈائری دیکھ کر فوراً ہامی بھرلی۔ یہ میری عادت ہے جو کام میں کرسکتا ہوں فوراً کردیتا ہوں۔ اگر نہیں کرسکتا تو پھر نہیں کرسکتا۔ مجھے طلبہ سے محبت ہے۔ وہ محبت اور شفقت جو باپ کو اپنے بیٹوں سے ہوتی ہے۔ جب طلبہ چلے گئے تو میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا کہ رحمٰن بابا کی وفات کو اب تقریباً تین سو سال ہو گئے ہیں آخر ہم انھیں آج بھی کیوں یاد کرتے ہیں۔ لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں۔ شادی بیاہ کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں۔ لوگ انھیں بھول جاتے ہیں۔ یہی کام ایک حیوان بھی کرتا ہے۔ پیدا ہوتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ اپنے مرنے کے ساتھ ہی زندگی سے اس کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتا ہے۔ رحمٰن بابا بھی ایک انسان تھے۔ لیکن وہ مرنے کے ساتھ مر نہیں گئے۔ وہ آج بھی زندہ ہیں اور آج بھی ہمارے دل کے نہاں خانے میں زندہ ہیں اور ہماری رگوں میں خون بن کر دوڑ رہے ہیں۔ غور کیجیے تو آپ بھی میری طرح اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ مرنا برحق ہے۔ سب کو مرنا ہے لیکن وہ لوگ جو زندگی میں اچھے اچھے کام کرتے ہیں۔ زندگی میں جن کا کوئی مقصد ہوتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے دن رات محنت کرتے ہیں۔ کوشش کرتے ہیں تو وہ لوگ رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ اسی لیے آج یوم رحمان بابا مناتے ہوئے آپ کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ آپ بھی زندگی میں ایسے کام کریں جن سے آپ کا نام روشن ہو اور مرنے کے بعد بھی لوگ آپ کو یاد رکھیں۔ اسی وقت انسان حیوان کی سطح سے بلند ہو سکتا ہے۔ اسی وقت انسان انسان بن سکتا

ہے۔ اُردو کے لافانی شاعر میر تقی میر نے کہا تھا:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

سب سے پہلا سبق اس شعر سے یہ ملتا ہے کہ ہمیں زندگی میں ایسے کام کرنے چاہئیں جس سے آپ سب کو یاد رہیں اور یہ کام، جیساکہ رحمٰن بابا نے کہا ہے، اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب انسان دنیا میں سب اچھے کام کرے۔

رحمٰن بابا نے کہا تھا:

غفلت کی نیند سے جاگ اٹھو
کب تک اونگھتے رہو گے

ہر وقت دعا اور درود میں مشغول رہو

آدمی کے ظاہر لباس سے دھوکا نہ کھانا
اس کے باطن کو دیکھو کہ پُرمغز ہے یا بے مغز ہے۔

رحمان بابا نے ان شعروں میں جن کا ترجمہ میں نے آپ کو سنایا ہے آپ کو غفلت کی نیند سے جاگنے کی تلقین کی ہے۔ غفلت انسان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ غفلت کی وجہ سے انسان اپنی عمر کو ضائع کر دیتا ہے اور جب وہ ضائع ہو جاتی ہے اور پھر واپس نہیں آتی تو وہ پچھتاتا ہے۔ دوسری بات رحمٰن بابا نے یہ بتائی ہے کہ انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ اس کے باطن کو دیکھنا چاہیے۔ باطن ہی اصل حقیقت ہے۔ ظاہر صرف دھوکا ہے۔ اچھا انسان وہ ہے جس کا ظاہر نہیں بلکہ اس کا باطن اچھا ہو۔ وہ پُرمغز ہو بے مغز نہ ہو۔ مجھے یاد آیا کہ پشتو کے ایسے بہت سے ٹپّے ہیں جن میں بہت خوب صورت الفاظ میں عمر کو ضائع نہ کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک ٹپے میں کہا گیا ہے کہ:

(۱) "عمر کی مثال پانی کی لہر کی سی ہے۔ آج کا دن جو گذر گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا۔"

(۲) "میری عمر یوں ضائع ہو رہی ہے جس طرح بنجر زمینوں پر

بارش :

ایک اور ٹپے میں کہا گیا ہے :

" گذرا ہوا وقت واپس نہیں آئے گا۔ چاہے میں کانٹوں کو اپنے
آنسوؤں سے ہرا کیوں نہ کر دوں "

اسی لیے رحمان بابا کی یاد مناتے ہوئے آپ کو چاہیے کہ آپ ان کے کلام سے وہ سبق حاصل کریں جس سے آپ کی زندگی سنورے، آپ زندگی میں وہ کام کریں جن سے آپ رحمان بابا کی طرح ہمیشہ زندہ رہیں۔ وہ لوگ جو اس بات کو سمجھتے ہیں زندگی میں ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ رحمان بابا نے کہا تھا:

" وہ لوگ جو صبح و شام میں، مٹی اور سونے میں اور خیر و شر میں
کوئی فرق نہیں کرتے وہ اندھے ہیں "

ایک اندھا وہ ہوتا ہے جس کی آنکھیں کی روشنی ضائع ہو جاتی ہے لیکن ایک اندھا وہ ہوتا ہے جو مٹی اور سونے میں فرق نہیں کرتا۔ جو خیر و شر میں فرق نہیں کرتا۔ جو تنگ دل ہوتا ہے۔ جو تنگ نظر ہوتا ہے۔ جو لالچ میں مبتلا ہوتا ہے۔ جو ذرا سے وقتی فائدے کے لیے وہ کرتا ہے جو شر ہے، فساد ہے اور خیر کو بھول جاتا ہے۔ عزیزو! خیر ہی وہ چیز ہے جس سے آدمی مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے اور جس سے اس کا نام روشن ہوتا ہے۔ زندگی میں عزت و احترام کا مالک ہوتا ہے اور رحمان بابا کی طرح مرنے کے بعد بھی وہ ہمارے دلوں کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ رحمان بابا، جو پشاور کے قریب مہمند قبیلے کے ایک گاؤں بہادر کلا میں پیدا ہوئے، ایک ایسے انسان تھے جن کی زندگی خیر کی تلاش میں گذری۔ وہ مہمند ہوتے ہوئے بھی انسان تھے۔ عشق ان کا مشرب تھا۔ عشق سب انسانوں سے، ساری خلقت سے، ساری انسانیت سے ان کا مقصد حیات تھا۔ ایک شعر میں کہتے ہیں :

" میں عاشق ہوں اور میرا کام صرف عشق ہے۔ میں نہ خلیل
ہوں، نہ داؤد زئی اور نہ مہمند "

ایک اور شعر میں کہتے ہیں :

"اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز کھول دوں تو فرشتے افسوس

کرنے لگیں کہ اے کاش ہم انسان ہوتے"۔

یہی انسانیت ہمارا مقصدِ حیات ہونا چاہیئے۔ یہی وہ سبق ہے جو رحمان بابا نے ہمیں دیا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو ہمیں دکھایا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں آپ سے یہ کہوں کہ رحمان بابا کی یاد منانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کے خیالات کو ان کی باتوں کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں۔ اپنی زندگی کو سنواریں۔ انسان وہی بنتا ہے جو وہ خود کو بناتا ہے۔ وہ انسان جو خود کو انسان نہیں بناتا دو پیروں پر چلنے کے باوجود حیوان رہتا ہے۔ آج رحمان بابا کی روح کو خوش کرنے کا مجھے یہی صحیح طریقہ نظر آتا ہے کہ آپ سب ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں اور خود کو انسان بنائیں۔ ایسا انسان جو محبت کو پھیلاتا ہے۔ جو خیر کا راستہ اختیار کرتا ہے اور جو اپنے ملک، اپنے وطن سے محبّت کرتا ہے اور دشمن سے بھی خیر کا سلوک کرتا ہے۔

عزیزو! اس سے قبل کہ میں آپ سے رخصت ہوں پشتو کے دو ٹپوں کا ترجمہ آپ کو اور سُنادوں تاکہ رحمان بابا کی نیک روح خوش ہوجائے۔ وہ ٹپے یہ ہیں:

(۱) "اے اللہ مجھے سو بار زندگی دے تاکہ میں سو بار وطن کی محبّت پر اس کو نثار کردوں"۔

(۲) "میرے محبوب نے وطن کی راہ میں سر دے دیا۔ میں اپنی زلفوں سے اس کا کفن سیوں گی"۔

خدا کرے ہمارے درمیان بہت سے رحمٰن بابا پیدا ہوں تاکہ ہمارا ملک اور اس کے رہنے والے حقیقی معنی میں انسان بن جائیں۔ وہ انسان جو سب سے محبّت کرتا ہے۔ اپنے عزیزوں دوستوں سے بھی اور وطن سے بھی۔

(۲۸ اپریل ۱۹۸۴ء)

۲

بابا رحمٰن اسی لیے میرے پسندیدہ اور محبوب شاعر ہیں کہ ان کی شاعری میں مجھے انسان دوستی کی وہ خصوصیت ملتی ہے جو وسیع القلب اور وسیع النظر انسانوں کا شیوہ رہی ہے۔ رحمٰن بابا کی شاعری کو پسند کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں ایک ایسی سادگی، ایک ایسی روانی اور ایسی گہری معنویت ملتی ہے کہ ان کے اشعار آج بھی سننے اور پڑھنے والوں کے دل پر گہرا اثر کرتے ہیں۔ آپ یہاں یہ سوال پوچھ سکتے ہیں کہ آخر اس اثر کی اصل وجہ کیا ہے۔ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ وہ لوگ جو زر پرست نہیں ہوتے، بے نیاز ہوتے ہیں ــــ یہی درویش کی صفت ہے ــــ اُن میں نہ مال کی طمع ہوتی ہے اور نہ زر و دولت کی ہوس ہوتی ہے۔ دراصل زر پرستی معاشرے کو خراب کرتی ہے۔ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ اور جبر و استحصال کی طرف لے جاتی ہے اور اسی لیے انسان سخت دل، خود غرض اور ریاکار ہو جاتا ہے۔ سلام ہے ان لوگوں کو جو بابا رحمٰن کی طرح ہوس و طمع کی لعنت سے پاک ہوتے ہیں۔ ان کے دل صاف ہو کر انسانیت کا آئینہ بن جاتے ہیں اور ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ میں جادو کا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ رحمٰن بابا کی شاعری اسی لیے ہمیں آج بھی متاثر کرتی ہے۔ رحمٰن بابا کا مشرب صلح کل تھا۔ وہ قبائلی بنیادوں پر تنازعات کو بُرا سمجھتے تھے اور انسانیت کی بنیاد پر انسانوں کے رشتوں کو دیکھتے تھے۔ اسی لیے ان کا اخلاق اعلیٰ، ان کی فکر وسیع اور ان کا اندازِ نظر صلح کل کی طرف مائل تھا۔۔ اورنگ زیب عالم گیر کا جب انتقال ہوا تو اس وقت رحمٰن بابا زندہ تھے۔ ایک قصیدے میں رحمٰن بابا نے اورنگ زیب کے بیٹوں کی آپس میں لڑائی پر نہایت دکھ کے ساتھ اظہارِ افسوس کیا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ جنگ ان کے مسلک کے خلاف اور ہوس پرستی کی جنگ تھی۔ اسی قصیدے میں بابا رحمٰن نے اورنگ زیب عالم گیر کو "ظلمت کدہ

ہند کا آفتاب قرار دے کر اس کی مدح بھی کی ہے"۔ وہ اورنگ زیب کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ وہ نہ صرف متقی اور پرہیزگار تھا بلکہ اس نے سارے برعظیم کو اپنی دانش و حکمت سے متحد کر رکھا تھا۔

رحمٰن بابا ایک نیک باطن بزرگ وصوفی انسان تھے۔ اسی لیے لفظ بابا ان کے نام کا حصہ بن گیا ہے۔ پشتو زبان میں بابا خدا رسیدہ بزرگ کو کہتے ہیں۔ ایک مصنف نے کسی جگہ لکھا ہے کہ پشتو ادب میں رحمٰن بابا کو وہی مقام حاصل ہے جو فارسی ادب میں حافظ شیرازی کو حاصل ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ برسوں حافظ شیرازی کے کلام سے فال نکالی جاتی رہی ہے۔ یہی صورت رحمٰن بابا کے کلام کے ساتھ ہے۔ زمانۂ قدیم سے لوگ ان کے کلام سے فال نکالتے ہیں اور اس سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ "پٹہ خزانہ" کے حوالے سے کتابوں میں آیا ہے کہ" افغان سلطنت کے بانی حاجی میر اویس خان ہوتک نے جب ایران کے صفوی بادشاہوں کے خلاف آزادی کا علم بلند کیا تو رحمٰن بابا ہی کے دیوان سے فال نکالی تھی اور کامیابی حاصل کی تھی۔

اٹھارویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں بابا رحمٰن نے وفات پائی اور " ان کا مزار پشاور کے جنوب میں ہزار خانہ کے مقام پر اخوند درویزہ کے مزار کے نزدیک "آج بھی مرجع خلائق ہے۔ رحمٰن بابا ایک بڑے انسان، ایک بڑے شاعر اور اعلیٰ اخلاقی فکر رکھنے والے نیک باطن اور درویش صفت انسان تھے۔ ایسے انسان کبھی کبھار پیدا ہوتے ہیں لیکن ان کی روشنی سے آنے والی نسلیں ہمیشہ نور اور حرارت حاصل کرتی رہتی ہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ ہمارے نوجوان بھی بابا رحمٰن کے بتلائے ہوئے راستے پر چلیں تاکہ اپنی صلاحیتوں سے وہ بھی انسانیت کی عظیم خدمات انجام دے سکیں۔ بابا رحمٰن نے اپنے ایک شعر میں لکھا ہے کہ "اگر میں تمہارے عشق کے مرتبے کا راز کھول دوں تو فرشتے افسوس کرنے لگیں کہ اے کاش ہم بھی انسان ہوتے۔ پاکستان کے نوجوانوں کو بابا رحمٰن کا یہی پیغام ہے کہ وہ قبائلی و علاقائی تعصبات سے بلند ہو کر زندگی کا مطالعہ کریں اور انسانیت کی خدمت کو اپنی منزل بنائیں۔ اسی وقت ہماری نئی نسلیں معاشرے کو جبر و استحصال سے پاک کر سکتی ہیں اور زر پرستی کو ختم کر سکتی ہیں۔

(یکم اپریل ۱۹۸۵ء)

شاہ عبداللطیف کی شاعری کے نئے گوشے

"بین الاقوامی سندھی ادبی کانفرنس" کے موقع پر میں نے جو موضوع اپنے لیے منتخب کیا ہے وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی شاعری ہے۔ یہ موضوع میں نے اس لیے منتخب کیا ہے کہ شاہ کی شاعری کا بنیادی فلسفہ عشق ہے جس سے محبت، انسانیت، ملاپ اور یک جہتی کی وہ خوشبو نکلتی اور پھیلتی ہے کہ مشام جان معطر ہو جاتے ہیں۔ یہی وقت کا تقاضا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاہ کی شاعری آج نہ صرف سارے پاکستان میں بلکہ ساری دُنیا میں نُور اور روشنی پھیلا رہی ہے اور روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔

شاہ عبداللطیف بھٹائی (متوفی ۱۷۵۲ء) سندھی زبان کے وہ شاعر ہیں جن کی شاعرانہ عظمتوں سے سندھ کے عوام و خواص یکساں طور پر مستفیض ہوئے اور ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری دل کی آواز ہے اور اسی لیے دل میں اُتر جاتی ہے۔ وہ ایک ایسے صوفی شاعر ہیں جن کی شاعرانہ لَے نے قرآن و حدیث کی روح کو معاشرے کی روح میں جذب کر دیا ہے۔ توحید ان کی شاعری کا مرکزی نکتہ ہے جس سے فلسفہ و فکر کی وہ کرنیں پھوٹتی ہیں جو ساری زندگی کو منوّر کر دیتی ہیں۔ شاہ نے ایسی شاعری کی ہے جو بیک وقت مقامی بھی ہے اور ماوراے مقام بھی اور اسی لیے آج تقریباً ڈھائی سو سال بعد بھی وہ اسی طرح تر و تازہ اور پُر اثر ہے۔

شاہ نے اپنی شاعری سے خود سندھی زبان کو زندہ کیا اور اس میں وہ دل آویزی، جاذبیت اور اعلیٰ انسانی قدریں پیدا کیں کہ آج سندھی زبان ایک بلند مقام پر فائز ہے۔ شاہ نے اپنی شاعری سے دُنیا کو انسانیت کا درس دیا اور انسانوں کو بحیثیت انسان بہتر

انسان بننے کی تلقین کی۔ غریب عوام جو ظلم و استبداد کا شکار تھے شاہ نے ان کی حمایت میں آواز بلند کی۔ انھوں نے اپنے نغمات سے عوام کی ترجمانی بھی کی اور راہنمائی بھی۔ وہ وحدانیت کے متلاشی تھے۔ جستجوئے حق اور قربِ الٰہی ان کا مسلک تھا۔ شاہ نے اپنی داستانوں میں جو خیال آرائی کی ہے اس میں سچائی اور حق کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لیے آج شاہ کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ شاہ کا کلام زبانِ زدِ خاص و عام ہے۔ وہ محبت کے شاعر ہیں وہ محبت جو انسان کو انسان سے قریب کرتی ہے۔ ان میں اتحاد اور پیار کا رشتہ پیدا کرتی ہے اور اخوت کے رشتے میں پرو کر معاشروں کو پُرامن بنا دیتی ہے۔ شاہ نے ان ہی خیالات کو تصوّف کے حوالے سے اپنی شاعری کے ذریعے سارے معاشرے تک پہنچایا ہے۔ ان کے کردار دراصل استعارے ہیں جن سے ان کے فلسفۂ تصوّف کی ترجمانی ہوتی ہے۔ شاہ کا رسالہ ایک ایسا باغ ہے جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول اور کلیاں کھلے ہوئے ہیں۔ ان کی شاعری میں حافظ و سعدی کی لے بھی شامل ہے اور رومی و عطار کا فلسفہ بھی۔ انسانی اقدار کی سربلندی اور پُرامن اور صالح معاشرے کا قیام ان کی شاعری کا مقصد ہے۔ انھوں نے زمانے کے سرد و گرم کو خود دیکھا۔ انسانیت کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانی۔ لق و دق صحراؤں کو عبور کیا۔ پہاڑوں کے دامن میں ڈیرہ جمایا۔ ریگستان کی تپتی ہوئی ریت پر بسیرا کیا۔ غربت کی تکالیف اٹھائیں۔ برفانی ہواؤں کا مقابلہ کیا اور بادِ سموم کے تھپیڑوں سے زندگی کے رازِ سربستہ کو تلاش کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری عوام کی روح سے قریب ہے اور اسی لیے ان کی شاعری میں بلا کا سوز اور بلا کی تاثیر ہے۔ وہ بلکتی ہوئی انسانیت کو حوصلہ دیتے ہیں۔ وہ زندگی بسر کرنے کا شعور پیدا کرتے ہیں اور زندگی میں عمل کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ وہی پیغام ہے جو قرآنِ پاک اور رسول اکرمؐ نے ہمیں دیا ہے۔ مولانا روم کی آواز ان کی شاعری کی آواز میں شامل ہے اور اویس قرنی، سلمان فارسی اور ابوذر غفاری کا فلسفۂ حیات ان کے فلسفۂ حیات میں رنگ بھرتا ہے۔ شاہ سے پہلے یا شاہ کے بعد کسی شاعر نے اس والہانہ ذوق و شوق کے ساتھ عوام کی روح کی طور پر ترجمانی تو نہیں کی۔ اسی لیے شاہ نے اپنے کلام میں اہلِ وطن

کو اتحاد، اخوت، محبّت اور بھائی چارگی کی تعلیم دی ہے۔ ان کے نزدیک شاعری خود منزل مقصود نہیں ہے بلکہ منزل پر پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ شاہ کے کلام اور ان کے فلسفہ و فکر سے متاثر ہو کر میں نے طے کیا ہے کہ ان کے پیغام کو ہر طبقے اور ہر زبان کے بولنے والوں تک پہنچایا جائے اور اسی لیے جب ۱۹۸۳ء میں میں نے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا منصب سنبھالا تو میں نے ارادہ کیا کہ کراچی یونی ورسٹی میں ایک ایسا مرکز قائم کیا جائے جہاں سے شاہ کے پیغامِ محبّت کو معاشرے کی روح میں شامل کرنے کی کوشش کی جائے۔ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے "شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر" قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا اور خدا کا شکر ہے کہ تین سال کی کوششوں کے بعد مجھے اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔ پچھلے سال کراچی یونیورسٹی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی چیئر قائم ہو چکی ہے اور اب وہاں شاہ پر جو کام ہو رہا ہے اس سے شاہ کا پیغامِ محبّت اور درسِ اخوت و انسانیت ان شاء اللہ تعالیٰ سارے پاکستان میں پھیلے گا اور شاہ کی فکر و شاعرانہ زندگی کے ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔ بڑے شاعروں نے ہمیشہ پیغامِ محبّت ہی سے دُنیا کو بدلا ہے اور ہمارے شاہ لطیف بھٹائی نے بھی یہی کام اپنی شاعری سے انجام دیا ہے۔ شاہ لطیف کہتے ہیں :

> "بُلا کے پھیر دینا محبوب کی عادت ہے۔ یہ ایک الٹی بات ہے
> مگر عشق کی رِیت یہی ہے۔ اگر محبوب محبّت کا رشتہ توڑتا ہے تو وہی
> اسے جوڑتا بھی ہے"۔

اور پھر کہتے ہیں :

> "اے طبیب! اٹھو، جاؤ اپنی دوائیں ساتھ لے جاؤ
> وہی اپنے لطف سے میری چارہ سازی کریں گے
> جنھوں نے مجھے درد بخشا ہے"۔

شاہ لطیف چارہ سازی کے لیے محبوب ہی کے پاس جاتے ہیں طبیب کے پاس نہیں۔ یہی محبّت کا مُثبت رویہ ہے اور اسی رویّے کو ہمیں بھی آج کے دور میں اپنانا چاہیئے کہ یہی تعلیم

شاہ صاحب نے دی ہے۔

اب آخر میں شاہ لطیف بھٹائی کے چند ابیات[1] پیش کرتا ہوں۔ دیکھیے وہ ہم سے کیا کہہ رہے ہیں :

"اے کشتی! تو بھی ان سفینوں کے ساتھ چلتی چل۔ اس پار جاتے ہوئے بہتر سامان لے کے چلنا۔ خطرناک سمندر کا شور سنائی دے رہا ہے۔"

"کشتی سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ بڑھئی نے جو میخیں لگائی تھیں وہ کمزور ہوگئیں۔ معلم اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ اس وجہ سے فرنگی چلے آئے۔ اے ملاح! تیری کشتی میں چور داخل ہو گئے ہیں۔"

"سوداگر نے دوسروں کا سامان کشتی میں خود لادا۔ کشتی کو دونوں طرف سے موجوں نے آ کر گھیرا۔ دوستو اگر ہشیار ہو گے تو یہ کشتی بھٹک نہیں جائے گی۔"

(سر سری راگ، تیسری داستان)

"کانچ کی قدر ہے۔ موتی کی ناقدری۔ میں سچ کو جھولی میں اٹھائے پھرتا ہوں۔ پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

(سر سری راگ، چوتھی داستان)

"وہ جوہر شناس چلے گئے جو لعل و جواہر کو پرکھتے تھے۔ ان کے جانشینوں کو لوہے کی بھی پہچان نہیں۔ اب ان کی جگہوں پر لوہار لوہا کوٹتا ہے۔"

(سر سری راگ، چوتھی داستان)

"ستارے حرکت میں ہیں اور ندی نالے بھی حرکت میں ہیں —

---

[1] "شاہ جو رسالو" کا اردو ترجمہ از ڈاکٹر ایاز قادری اور ڈاکٹر وقار احمد رضوی، مطبوعہ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

کیونکہ جو کچھ تجھے ملتا ہے تو اسی پر قانع ہے۔ تُو ساری رات سوتا رہتا ہے، تو دولت کس طرح جمع کرے گا۔"

(سُر سری راگ، چھٹی داستان)

"بیٹھے رہنے سے خاوند نہیں ملتا۔ سوتے رہنے سے محبوب ہاتھ نہیں آتا۔ ساجن اس کو ملتا ہے جو راہوں سے اشکبار گذرتے ہیں۔"

(سُر سئی آبری، ساتویں داستان)

وائی:۔

"راہ میں تھک کر مت بیٹھو! ہو! اللہ!
جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے۔
کوئی آکے کچھ کہتا ہے کوئی آکے کچھ کہتا ہے
جتنا چلو گے اتنا پاؤ گے۔"

(سُر معذوری، پانچویں داستان)

"شہنشاہیت بھی سوئی کے آگے ہیچ اور کم تر ہے کیونکہ خود ننگی رہ کر دوسروں کی عریانی چھپاتی ہے۔ سوئی کی اس عظمت کو سمجھنے کے لیے کئی جنموں کی ضرورت ہے۔"

(سُر عمر ماروی، داستان ہفتم)

"گھٹا گھنگھور چھائی پھر بادل برسے۔ بجلیاں چاروں اور کوند رہی ہیں۔ کچھ بادل استنبول کی طرف، کسی کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔ کچھ چین پر لہرا رہے ہیں۔ کوئی سمرقند کی طرف رواں دواں ہے۔ کچھ روم پر رقصاں ہیں۔ کوئی کابل و قندھار کی طرف، کچھ دلّی و دکن کی جانب، اور کچھ گرنار کی طرف چھا رہے ہیں۔ کچھ جیسلمیر پر برس کر، بیکانیر پر یلغار کر رہے ہیں۔ کچھ بھج پر برسے، کوئی ڈھٹ پر پھیل گیا۔ کچھ نے عمر کوٹ سے ہوتے ہوئے ولھار پر موسلا دھار بارش

کی ـ" (سُر سارنگ، داستان چہارم)

"بجلیاں کڑندتی آئیں۔ برکھا کی رم جھم ہونے لگی۔ جنھوں نے گراں فروشی کے لیے ذخیرہ اندوزی کی تھی وہ اب کفِ افسوس ملتے ہیں۔ سوچ رہے تھے پانچ سے پندرہ ہو جائیں گے۔ اے خدا! ان موذی گراں فروشوں کو موت دے دے۔ پھر چرواہے آپس میں بیٹھ کر، کثرتِ باراں کی باتیں کر رہے ہیں۔ سیّد کہے سب کو تیرا سہارا ہے"۔

(سُر سارنگ، داستان چہارم)

"سوچتی ہوں کہ یہ کہوں گی، جدائی کے دُکھ ان سے بیان کروں گی۔ لیکن جب وہ سامنے آتے ہیں تو سب باتیں دل ہی دل میں رہ جاتی ہیں"۔ (سُر ڈہپ، داستان اول)

"لوگوں میں خلوص نہ رہا۔ ہر ایک دوسرے کا گوشت نوچ رہا ہے۔ دنیا میں صرف خوشبوئے اخلاق باقی رہ جائے گی۔ سب آدمی ریاکار ہیں۔ مخلص تو کوئی ایک ہی ہوگا"۔

(سُر برو و سندھی، داستان سوم)

"اللہ نے دوست سے ملایا۔ تجدید رسم و راہ کی بات چھڑی۔ آئینِ مہر و وفا یہ ہے کہ ترکِ محبّت نہیں کیا کرتے"۔

(سُر برو و سندھی، داستان سوم)

"دل سے فتنہ و فساد کو نکالو۔ سلطان سے امن و صلح رکھو، تو داتا کے دربار سے ہر روز انعام و اکرام پاؤ گے"۔

(سُر بلاول، داستان اول)

"وگنہ کنجر آیا۔ اس سے کچھ کام کاج نہ ہوا۔ روٹی، کپڑا اور مکان اس کو پیر و مرشد سے ملا"۔ (سُر بلاول، داستان چہارم)

یہ وہ پیغام ہے جو شاہ سائیں نے سندھی زبان میں سارے عالم انسانیت کو دیا

ہے اور یہی وہ پیغام ہے جس پر عمل کر کے سندھ کو امن کا گہوارہ، عدل و انصاف کی سرزمین، بھائی چارہ کا مرکز اور ترقی کی قابلِ تقلید مثال بنایا جا سکتا ہے۔ یہی روحِ اسلام ہے۔ یہی روحِ پاکستان ہے۔ شاہ نے کہا تھا کہ "بھنبھور میں جہنم کی آگ ہے۔ بھنبھور پر اندھیرا چھایا ہوا ہے"۔ جہنم کی آگ سے اہلِ سندھ شاہ سائیں کے بتائے ہوئے راستے ہی سے نکل سکتے ہیں۔ دیکھیے شاہ سائیں آپ سے کیا کہہ رہے ہیں:

آئینِ مہر و وفا یہ ہے کہ ترکِ محبت نہیں کیا کرتے

(۱۹۸۷ء)

نظام الملک میر عثمان علی خان کی خدمات

والیٔ دکن سلطان العلوم نظام الملک نواب میر عثمان علی خان مرحوم کی سترھویں برسی کے موقع پر اہلِ دکن کا یہ جلسہ منعقد کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ نواب مرحوم نے دکن اور دکنیوں کی اتنی عظیم خدمات انجام دی ہیں کہ ان کی یاد ہمیشہ کی طرح آج بھی ان کے سینۂ اخلاص میں فروزاں ہے۔ برصغیر کے طول و عرض میں ریاستیں اور بھی تھیں لیکن حیدر آباد دکن کی ریاست کا طرۂ امتیاز یہ تھا کہ اس نے علم و ادب کا چراغ روشن کیا اور اس کے والی نے علوم و فنون کی ہمہ جہتی ترقی میں گہری دلچسپی لے کر وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے کہ ان کا نام نامی بھی سورج کی طرح ہمیشہ نور و روشنی پھیلاتا رہے گا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ انھیں آج بھی یاد کرتے ہیں اور اسی وجہ سے آنے والی نسلیں بھی انھیں یاد کرتی رہیں گی۔

خواتین و حضرات! میں دکنی نہیں ہوں لیکن دکن سے میری گہری دلچسپی کے دو اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ دکن نے مجھے قدیم ادب کا شعور دیا ہے۔ میں نے دکنی ادب پر کسی دکنی سے اگر زیادہ نہیں تو کم کام نہیں کیا ہے۔ اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں مارچ/اپریل ۱۹۸۲ء میں جناب میر عابد علی خان ایڈیٹر "سیاست" کی دعوت پر پہلا "سیاست توسیعی لکچر" دینے کے لیے دہلی سے حیدر آباد گیا۔ سرزمین حیدر آباد پر قدم رکھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ میں ایک ایسے مقام پر آ گیا ہوں جہاں محبت ہی محبت ہے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ حیدر آباد کا شہر چنبیلی، موتیا اور موگرا کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور اظہارِ محبت کے لیے اہالیانِ حیدر آباد خوشبوؤں کی مہک اور اخلاص کے پھولوں سے قدم قدم پر میری گل پوشی کر رہے تھے اور مجھ سے کہہ رہے تھے کہ آپ ہمیں اس لیے زیادہ عزیز ہیں کہ آپ نے

دکنیات پر وہ کام کیا ہے جو خود دکنی بھی نہیں کر سکے ہیں۔ مجھے پہلی بار اپنے دکنی زبان و ادب پر کام کی صحیح حقیقی داد حیدر آباد دکن میں ملی اور جب اور جہاں بھی میں گیا میں نے دیکھا، بوڑھے اور جوان، معمر اور نوجوان، مرد اور عورت کثیر تعداد میں شریک ہو رہے ہیں اور قدیم دکنی زبان و ادب کے بارے میں مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اہلِ دکن کو آج بھی اردو زبان و ادب سے اسی طرح گہری دلچسپی ہے جس طرح اُس وقت تھی جب سلطان العلوم میر عثمان علی خان والئی حیدر آباد تھے اور دکن کی ریاست علوم و فنون کے فروغ میں پیش پیش تھی۔ دکن سے گہری دلچسپی کا دوسرا سبب بالکل ذاتی نوعیت کا ہے جس کا اظہار بھرے جلسے میں اس لیے مناسب نہیں ہے کہ ذاتی باتیں عام طور پر جلسوں میں نہیں کی جاتیں لیکن یہ ذاتی بات اتنی اہم ضرور ہے کہ اس نے میری زندگی کو متاثر و متشکل کر کے میرے لیے وہ ماحول پیدا کیا کہ میں اپنے علمی و ادبی شوق کو، زندگی کی ساری مصروفیات کے باوجود، پوری توجہ سے جاری رکھ سکا۔ میں نے علم و ادب کا جو کام کیا اس میں اس دکنی خاتون کا ہاتھ اور اس کا اخلاص و ایثار شامل ہے جسے عرف عام میں بیگم جالبی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب جناب وحید الدین خان بوزئی صاحب نے جناب [illegible] قادری صاحب صدف کے توسط سے مجھ سے آج کے جلسے میں شرکت کے لیے فرمایا تو میں نے اپنی ساری مصروفیات کے باوجود فوراً ہامی بھر لی اور آج میں بھی آپ کی طرح آپ کے ساتھ اس عظیم انسان کو یاد کرنے میں شریک ہوں جنھیں اب سب صرف سلطان العلوم کے خطاب سے موسوم کرتے ہیں اور یہی خطاب دراصل ان کی شخصیت و خدمات کا جامع اظہار بن گیا ہے اور آج پاکستان میں جب اردو کو سرکاری و دفتری زبان بنانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، سلطان العلوم کی ریاست حیدر آباد کی اُردو خدمات ایک مثالی نمونے کا کام کر رہی ہیں۔

مجھے یاد آتا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر محی الدین قادری زور مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں "عہد عثمان میں اُردو کی ترقی" کے نام سے ایک کتاب شائع کی تھی اور اس میں تحریر کیا تھا کہ "سرزمینِ دکن نے اردو ادب کا آغاز نہ معلوم کون سی مبارک گھڑی میں کیا تھا کہ اس کے

سپوت آج تک اس کی خدمت میں سرگرم کار ہیں اور گذشتہ تین چار صدیوں کے طویل عرصے میں کبھی کسی وجہ سے بھی اپنے کام کو ملتوی نہیں کیا۔" یہ کام آج بھی ساری مخالفتوں اور منافقتوں کے باوجود حیدرآباد دکن میں ہو رہا ہے اور اردو خدمت کا یہی کام آج بھی اہلِ دکن کی قدیم و جدید پاکستانی نسلیں پاکستان میں انجام دے رہی ہیں۔ نہ صرف اُردو خدمت بلکہ ہر شعبۂ حیات میں پاکستان کی خدمت اخلاص و دردمندی کے ساتھ انجام دے رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان قابلِ ذکر خدمات کا سہرا سلطان العلوم کے سر اس لیے باندھنا چاہیئے کہ اگر وہ فروغِ علم و فن کا چراغ اپنے دورِ حکومت میں سرزمینِ دکن پر روشن نہ کرتے اور وہاں کے لوگوں کو جدید تعلیم سے بہرہ مند نہ کرتے تو اہلِ دکن وہ خدمات ہرگز ہرگز انجام نہیں دے سکتے تھے جو وہ آج دے رہے ہیں۔ فروغ علم کی یہ جدید روایت سلطان العلوم میر عثمان علی خان مرحوم نے قائم کی تھی اور اس روایت کا فیض آج بھی اسی طرح جاری و ساری ہے۔ میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ سلطان العلوم کی خدمات کا اعترافِ کرنے کے لیے آپ ہر سال یہ جلسہ کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ غالبؔ نے یہ مصرع ع۔ "وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے" شاید اہلِ دکن کی اسی وفاداری کو محسوس کر کے کہا تھا۔

سلطان العلوم دُنیا کے ایک امیر ترین انسان تھے۔ اتنے دولت مند کہ ان جیسے دو چار ہی انسان ہوں گے۔ لیکن انھوں نے اس دولت کے ایک حصّہ کو کارہائے خیر اور تعلیم و علم کے فروغ پر صرف کیا۔ برصغیر کے متعدد تعلیمی و مذہبی ادارے سلطان العلوم کی مالی اعانت کے رہینِ منت رہے۔ اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سلطان العلوم نے برصغیر پاک و ہند میں اسلام اور مسلم تہذیب کی بقا و ترقی کے لیے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ سلطان العلوم میر عثمان علی خان کے بارے میں اور بہت سی باتیں ہیں جو کہی جا سکتی ہیں لیکن آخر میں ایک بات آپ سب سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سلطان العلوم نے علم و تعلیم، ادب و فن کے فروغ کے لیے جو روایت قایم کی تھی وہ روایت اب آپ کا تہذیبی ورثہ ہے۔ کیا آپ نے اس روایت کو زندہ و باقی

رکھنے اور آگے بڑھانے کے لیے سرزمینِ پاکستان پر اجتماعی طور پر کچھ کیا ہے؟ اگر کیا ہے تو اور کیجیے اور اگر نہیں کیا تو کرنا چاہیے آپ کے اسی عمل سے سلطان العلوم کی روح کو سکون پہنچے گا۔

(۲۴ر فروری ۱۹۸۴ء)

قاضی عبدالخالق مورائیؒ کی خدمات

قاضی خلیق مورائیؒ مرحوم سے میں قاضی محمد اکبر صاحب کے ذریعے متعارف ہوا اور اتنا متاثر ہوا کہ ۱۹۷۶ء میں، میں نے ایک مضمون بھی قاضی خلیق مورائیؒ کے بارے میں لکھا جو ۶ مئی ۱۹۷۶ء کے جنگ اخبار کے ص ۳ پر شائع ہوا۔ قاضی خلیق مورائیؒ کی جس بات نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا ان کا وہ مخصوص زاویۂ نظر تھا جو ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ خود کو ملتِ اسلامیہ کا فرد سمجھیں اور نیشنلزم کے پُر فریب تخیل سے دھوکا نہ کھائیں۔ ملتِ اسلامیہ کا سوادِ اعظم اور ہے۔ سب مسلمانوں کو ایک بھائی کی حیثیت سے ایک دوسرے سے مل کر محبت و اخوت کی فضا میں اس مقصدِ عظیم کے لیے آگے بڑھنا چاہیے۔ قاضی مورائیؒ مرحوم تعصب و تنگ نظری کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے۔ یہی وہ نقطۂ نظر تھا جس نے برصغیر کے مسلمانوں کو ایک الگ آزاد مملکت کے لیے جدوجہد پر اکسایا اور نتیجے کے طور پر مسلمانوں کا وہ ملک وجود میں آیا جسے آج ساری دُنیا پاکستان کے نام سے جانتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کو قاضی خلیق مورائیؒ مرحوم نے سندھ و اہلِ سندھ میں مقبول بنایا اور یہی وہ نقطۂ نظر تھا جسے برصغیر کے ان صوبوں کے مسلمانوں نے بھی اپنایا جہاں وہ صرف بارہ پندرہ فی صد تھے اور جانتے تھے کہ الگ مملکت بنانے کے معنی یہ ہیں کہ وہ خود ہمیشہ کے لیے، ہندو کے غلام بن کر رہ جائیں گے اور ان کی تہذیب، ان کا تمدن ان کے اپنے علاقوں میں محفوظ نہ رہ سکے گا۔ لیکن اسلام کو زندہ و تابندہ دیکھنے کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی، ہر قسم کے ایثار کے لیے آمادہ اور ہر خطرے سے بے نیاز تھے۔ اسی بے لوث جذبۂ ایثار نے اس ملکِ عزیز کو وجود بخشا اور اسی جذبہ نے پاکستان کے دروازے برصغیر کے سب مسلمانوں پر کھول دیے۔ سب سے زیادہ کشادہ دلی کا ثبوت جس صوبے نے دیا وہ بلاشبہ سندھ کا صوبہ تھا۔ اس صوبے میں جس طرح ہجرت کرنے والے

مسلمان آباد ہوئے اور جس طرح اس صوبے نے ترقی کی وہ ہماری تاریخ کا حصہ ہے۔ ہجرت کرنے والے جب ہجرت کرتے ہیں تو وہ سخت محنت کرتے ہیں اور اپنی زندگی کو نئے سرے سے قائم و دائم کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل و ذرائع کو استعمال کرتے ہیں جن سے ایک طرف خود ان کی زندگی کو فروغ حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سرزمین کو ترقی حاصل ہوتی ہے جس پر وہ محنت کر رہے ہیں۔ آنے والوں کے لیے یہ ان کا نیا وطن تھا۔ انھوں نے یہاں رہ کر جو محنت کی اور اس محنت سے جو کچھ حاصل کیا وہ یہیں رکھا اور یہیں لگایا۔ اسی لیے صوبہ سندھ معاشرتی، معاشی و تہذیبی سطح پر بے شمار سرگرمیوں کا مرکز بن گیا اور اس کے ثقافتی وجود میں ایسی بنیادی تبدیلیاں آئیں کہ ایک نئے اور آگے بڑھنے والے تہذیب و تمدن کی گہری بنیاد پڑ گئی۔ اس ثقافت کی روح میں اسلام کی روح پوری طرح سرائیت کیے ہوئے ہے اور یہ وہ صورت حال ہے جس سے نہ صرف ہم بلکہ ساری دنیائے اسلام فیض اٹھا سکتی ہے۔ اس وقت وہ قوتیں پوری طرح سرگرم عمل ہیں جو نہیں چاہتیں کہ اسلام ہماری نئی تہذیب کی بنیاد بنے اور اسی لیے آج ان تمام عناصر کو توڑنے اور الگ کرنے میں مصروف ہیں جن سے "وصل" کے بجائے "فصل" کا عمل شروع ہو سکے۔

تاریخ شاہد ہے کہ سندھ نے ہمیشہ نئی تہذیب کے ہراول دستوں کو خوش آمدید کہا ہے اور ان کو اپنے اندر جذب کر کے ایک تنومند اور جاندار تہذیب کو جنم دے کر نئی دنیاؤں کا سفر کیا ہے۔ تہذیبی، معاشرتی و معاشی سطح پر اس وقت یہی صورت حال ہے اور اگر اس صورت حال کو ہم نے خراب ہونے دیا یا مفاد پرستوں کے ایک مختصر ٹولے کو اسلامی فکر اور نقطۂ نظر پر غالب آجانے کے مواقع فراہم کر دیے تو یقین جانیے کہ وہ عمارت دھڑام سے آگرے گی اور محرومیوں، نامرادیوں اور تہذیبی و معاشی جبر و استحصال کا ایک ایسا دور شروع ہوگا جس کے چنگل سے نکلنا ایک طویل عرصے کے لیے ممکن نہ ہو سکے گا۔ مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور یہی وہ سطح ہے جس پر مسلم معاشروں کی بنیاد قائم ہوتی ہے اور اسلامی تہذیب و معیشت فروغ پاتی ہے۔ میرے خاندان کی کئی لڑکیاں سندھیوں میں بیاہی ہوئی ہیں اور سندھ کی کئی بیٹیاں میرے خاندان کے افراد سے

بیاہی گئی ہیں۔ اس وصل و زوج کی بنیادی قدر ان دونوں کا مسلمان ہونا ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ تہذیبی سطح پر ایسے اچھے خاندان وجود میں آئے ہیں جن میں وہ سب کچھ ہے جو الگ الگ نہ انصار خاندانوں میں نظر آتا ہے اور نہ مہاجر خاندانوں میں۔ ان خاندانوں میں اسلام کی روح اور زیادہ وسیع اور گہری ہو گئی ہے۔ ایک ایسی بے تعصبی، فراخ دلی اور اسلامی روشن خیالی ان خاندانوں میں نظر آتی ہے جو مثالی حیثیت رکھتی ہے۔

قاضی خلیق مورائی کا یوم مناتے ہوئے مجھے آج یہی کہنا ہے کہ مہاجر و انصار دونوں اب اسی صوبے کے باشندے ہیں۔ ہمیں ان دونوں کو الگ الگ کرنے والی قوتوں سے ہوشیار رہنا چاہیے اور وہ کام نہ عمل کرنے چاہئیں جن سے یہ دونوں مل کر ایک ہو جائیں۔ ہمیں ایسے اقدام کرنے چاہئیں جن سے اسلامی عدل و انصاف کو اسلامی مساوات کو فروغ حاصل ہو سکے اور جبر و استحصال کا موجود غیر اسلامی نظام کا خاتمہ ہو سکے۔ انصاف زندگی کو آگے بڑھاتا ہے۔ اُسے خوش حال بناتا ہے۔ انصاف مثبت قدر ہے۔ ناانصافی منفی قدر ہے اور معاشرے کو ہر سطح پر، خواہ وہ معاشی ہو یا معاشرتی، برباد کرتا ہے۔

آج کے دن اس موقع پر ہمیں اپنا راستہ مقرر کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ کیا ناانصافیوں کی ترویج سے ہم کوئی زندہ آگے بڑھنے والا معاشرہ پیدا کر سکتے ہیں اور آپ یقیناً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف، مساوات ہی وہ قدریں ہیں جن پر چل کر ہم اسلام در روحِ اسلام کو زندگی میں نافذ کر سکتے ہیں۔ ناانصافی اس گیند کی طرح ہے جسے آپ جس قوت سے دیوارِ معاشرہ پر مارتے ہیں وہ اسی قوت سے آپ تک واپس آجاتی ہے۔ اس کے واپس آنے میں وقفہ تو یقیناً ہوتا ہے لیکن یہ وقفہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اللہ نے پاکستان ہمیں تقدیر کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہمیں اس کا ذمہ دار بھی بنایا ہے ہم جو کچھ کریں گے اس کے ہم خود ذمہ دار ہیں اور رہوں گے۔ پاکستان اللہ کی امانت ہے۔ اس کی حفاظت، اس کی ترقی، اس میں عدل و انصاف

کی روح پھونکنا، اسے اسلام کا قلعہ بنانا، اس میں محبت و اخوت پیدا کرنا، مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، کے قرآنی احکام کو زندگی میں عملی طور سے برتنا اور برت کر دکھانا، یہ ہماری ذمہ داری ہے اور جو اس عمل سے روگردانی کرے گا وہ اسلام کا دشمن ہوگا۔ آج ہمیں اس پر پھر سے غور کرنا چاہیئے اس لیے کہ اس میں ہمارے محفوظ اور شاندار مستقبل کا راز پنہاں ہے۔

(یکم مئی ۱۹۸۴ء)

حافظ شیرازی

حافظ شیرازی دُنیا کے ادب کے چند عظیم شاعروں میں سے ایک ہیں۔ وہ ایک ایسے شاعرِ بے بدل ہیں کہ صدیوں سے خود ملک ایران کی واضح شناخت ہیں۔ اُن کا اثر دُنیا کی بیشتر زبانوں کے ادبیات نے قبول کیا ہے اور برصغیر کے ادبیات اور بالخصوص اُردو شاعری پر تو اُن کا اثر بہت واضح اور گہرا ہے۔ حافظ کی زندگی ہی میں ان کی شہرت برصغیر تک پہنچ چکی تھی اور تاریخ شاہد ہے کہ سلطان شاہ محمود بہمنی کے دورِ حکومت میں میر فضل اللہ نے زادِ راہ بھیج کر انھیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ حافظ شیرازی روانہ ہوئے مگر طوفان نے جہاز کو گھیر لیا۔ خواجہ حافظ جہاز سے اُتر گئے اور وہ مشہور غزل لکھ کر میر فضل اللہ کو بھیج دی جس کے یہ دو شعر مجھے بھی یاد ہیں:

شکوہِ تاجِ سلطانی کہ بیمِ جاں در و درج است

کلاہِ دل کش است امّا بہ دردِ سر نمی ارزد

بہ کوئے میفروشانش بہ جامے در نمی گیرند

زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

حافظ شیرازی برصغیر کی مُسلم تہذیب کا ایک اہم حصہ ہیں۔ جیسے امیر خسرو عوام و خواص کی تہذیب میں خون کی طرح گردش کر رہے ہیں اسی طرح حافظ شیرازی خواص کی تہذیب کا سرمۂ چشم بن کر نور کو دو بالا کر رہے ہیں۔ شاید ہی پرانی نسل کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا ہو جسے حافظ شیرازی کے دو چار شعر یاد نہ ہوں۔ قوّال حافظ کے شعر سُنا کر آج بھی اہلِ محفل کو عالمِ وجد میں لے آتے ہیں۔ حافظ حال کے بھی شاعر ہیں اور قال کے بھی۔ اردو کی کوئی علمی یا ادبی کتاب

جو آج سے پچاس سال پہلے لکھی گئی ہو آپ کھول کر دیکھ لیجیے حافظ کے شعر دلوں کی ترجمانی کرتے ہوئے آپ کو نظر آئیں گے۔ حافظ ہماری تہذیب کی زبان کا ایک حصہ بھی ہیں اور ہمارے جذبات و احساسات کے ترجمان بھی۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایرانی تہذیب کو برصغیر کی مُسلم تہذیب سے قریب اور ہمارے دلوں کو ایک دوسرے سے قریب تر کیا ہے۔ انھیں شعرا نے ہماری فکر کو، ہمارے جذبہ و احساس کو ہمارے خیالات و افکار کو متاثر کر کے ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

یہی وہ تہذیبی مشابہت اور یہی وہ ثقافتی مماثلت ہے جس کی وجہ سے ایران و پاکستان ایک دوسرے کے برادر ملک اور برادر قوم ہیں اور یہی وہ راستہ ہے کہ ایران و پاکستان کو مزید قریب کر سکتا ہے۔ علم و ادب کے حوالے سے جو قومیں ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں وہ پہچان، وہ شناخت دائمی و ابدی ہوتی ہے۔ آئیے ہم اسی سطح پر اور اسی حوالے سے عہدِ حاضر میں ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور زر پرستی سے ہٹ کر علم پرستی اور ادب پرستی کے راستے کو اختیار کریں تاکہ قربتیں بڑھ جائیں اور فاصلے کم سے کم تر ہو جائیں۔ اُردو زبان و ادب نے فارسی زبان و ادب کی چھاتی سے دودھ پیا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ فارسی زبان و ادب کے اثرات نے اردو زبان کو نہ صرف علم و ادب کے سانچے دیے بلکہ اسے تیزی سے پروان چڑھانے میں بھی مدد دی ہے۔ آج اردو زبان، جو پاکستان کی قومی زبان ہے، خود ایک ترقی یافتہ زبان بن گئی ہے جس کا ادب ثروت مند اور جس کا دائرہ وسیع ہے اور جس نے میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ جیسے شاعر پیدا کیے۔ لیکن ان سب پر اور خود اردو ادب پر فارسی ادب و زبان کے اثرات واضح اور گہرے ہیں۔ میں جو زبان لکھتا ہوں اس میں فارسی زبان شامل ہے۔ ہمارا سارا ثقافتی ورثہ فارسی زبان میں محفوظ ہے۔ اسی لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ فارسی پڑھنے اور سیکھنے کی ہم پھر سے طرح ڈالیں تاکہ ہمارے ثقافتی و تاریخی ورثہ کے بند دروازے کھل جائیں اور ہم مغربی مستشرقین کی آنکھوں سے اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنے ورثے کو دیکھنے کا عمل بند کر دیں۔ یہی وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ ہم خود کو پہچانیں، اپنے ورثے کو براہِ راست دیکھیں اور اس ورثے سے اپنے حال کو سنوار کر اپنے مستقبل کو، اپنی مرضی کے مطابق

خود پیدا کریں۔ اپنے عظیم ورثے کو بھلا کر ہم نے بہت کچھ کھویا اور گنوایا ہے۔ حافظ شیرازی کی یاد کو تازہ کرتے ہوئے آیئے اس بات پر بھی غور کریں کہ ہم بھٹک کر کہاں نکل آئے ہیں۔ یہ وہ راستہ تو نہیں ہے جس پر چل کر ہم اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں گے۔ اب دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کا وقت گذر چکا ہے۔ اب ہمیں اپنے ورثہ اور اپنی تاریخ کے حوالے سے خود کو پہچاننے کا وقت آگیا ہے۔ پیروی مغربی سے ہم نقل اور ترجمہ کی تہذیب تو پیدا کر سکتے ہیں لیکن وہ توانا و اصل تہذیب پیدا نہیں کر سکتے جو فلک افلاک کو چھولیتی ہے۔ حافظ شیرازی نے اسی لیے "طرح نو در اندازیم" کا درس دیا تھا اور یقیناً یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔ حافظ نے کہا تھا:

شاہد آں نیست کہ دارد خطِ سبز و لبِ لعل

شاہد آں ست کہ زیں دارد و آنے دارد

"طرح نو" اور "آنے دارد" یہی وہ عوامل ہیں جن سے مجھے پاکستان و ایران دونوں میں روشنی کی کرنیں پھوٹتی نظر آرہی ہے۔

۱۳؍ دسمبر ۱۹۸۸ء

نصرتی کی فارسی غزل

پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کا ایک مضمون سب رس کراچی دسمبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں نظر سے گذرا جس میں محترمی اکبر الدین صدیقی صاحب نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب نے اس (نصرتی) کا دیوان اور تاریخ اسکندری شائع کی۔" اور اس کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ "اس میں نصرتی کے فارسی کلام کا کوئی تذکرہ نہیں۔"

یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ ۱۹۷۲ء میں جب میں نے قدیم بیاضوں سے ریزہ ریزہ اکھٹا کر کے دیوان نصرتی مرتب کیا تو اس میں ایک فارسی غزل بھی شامل کی تھی جو دیوانِ نصرتی مطبوعہ قوسین لاہور ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۷۹ اور ۸۰ پر درج ہے۔ اس فارسی غزل میں سات شعر ہیں۔ محترم اکبر الدین صدیقی صاحب نے اپنے مضامین کے مجموعے "بجھتے چراغ" میں اس غزل کے صرف پانچ شعر دیے ہیں۔ نصرتی کی فارسی غزل کے تعلق سے میں نے ایک فٹ نوٹ بھی دیا تھا جس میں چند امور کی صراحت کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

"مظفر حسین صبا مولف "روزِ روشن" نے یہ غزل عشرتی اصفہانی کے نام سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ "بعضے ایں غزل را بنام نصرتی گیلانی نوشتہ و بہ تحقیقِ اختر (قاضی محمد صادق خان اختر مولف تذکرہ آفتاب عالمتاب) و صاحب نگارستان سخن (نواب نورالحسن خان) عشرتی اصفہانی است۔"

(روز روشن، ص ۴۵۵)

"فرہنگ سخنوران" میں نصرتی گیلانی کا نام نہیں لکھا۔ صرف "روزِ روشن" کے

حوالے سے اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن "فرہنگِ سخنوران" میں ایک نصرتی ہندوستانی کا نام بھی آیا ہے جس کو مثنوی "مہر و ماہ" کا مصنف بتایا گیا ہے جو ۱۰۶۸ھ تک حیات تھا۔ (فرہنگ سخنوران" ص ۶۰۴) نصرتی گیلانی کے مطبوعہ دیوان میں یہ فارسی غزل نہیں ہے۔ امکان ہے کہ یہ غزل اسی نصرتی دکنی کی ہو کیوں کہ نصرتی دکنی کا سال وفات ۱۰۸۵ء ہے۔ دوسرے یہ کہ جس مثنوی کو "مہر و ماہ" کہا گیا ہے وہ عاقل خان رازی عالم گیری کی مثنوی ہے جس میں اسی قصۂ منوہر و مدمالتی کو نظم کیا گیا ہے جسے نصرتی نے "گلشنِ عشق" میں موضوع سخن بنایا ہے۔ مہر و ماہ فارسی زبان میں ہے اور "گلشنِ عشق" اردو میں۔

اس غزل کا تیسرا اور پانچواں شعر غالب نے قدسی (مشہدی) سے منسوب کیا ہے۔ موجودہ تحقیق کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے۔

نصرتی کی یہ واحد فارسی غزل بے جواب تک دستیاب ہوئی ہے اور یہ غزل جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں، میرے مرتبہ "دیوانِ نصرتی" میں شامل ہے جسے قارئین کی دلچسپی کے لیے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

از پنجۂ من، چاکِ گریباں گلہ دارد — وز گریۂ من، گوشۂ داماں گلہ دارد

از بس کہ بہ زندانِ غمت در بمانم — زنجیر بہ تنگ آمدہ، زنداں گلہ دارد

دامانِ نگہ تنگ، گلِ حسنِ تو بسیار — گل چین بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

گہ بُت شکنم، گاہ بہ مسجد زنم آتش — کز مذہبِ من گبر و مسلماں گلہ دارد

در بزمِ وصالِ تو بہنگامِ تماشا — نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

سنبل بہ چمن مشک فشاں نافۂ تاتار — از غربتِ من زلفِ پریشاں گلہ دارد

گہ گریم و گہ خندم و گہ آہِ جگر سوز
اے نصرتی از وضعِ تو جاناں گلہ دارد

اس غزل اور پروفیسر اکبر الدین صدیقی صاحب کی مندرجہ غزل میں چند الفاظ کا فرق ہے۔ اہل علم کے لیے یہ بات بھی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ یہ بات میں نے صرف اس لیے واضح

کردی ہے کہ سب رس کے قارئین کے سامنے یہ بات آجائے کہ میرے مرتبہ "دیوانِ نصرتی" میں نہ صرف فارسی غزل شامل ہے بلکہ اس غزل میں دو شعر بھی اکبر الدین صدیقی صاحب کی مندرجہ غزل کے مقابلے میں زیادہ ہیں۔

(۳۱ر جنوری ۱۹۸۴ء)